انتساب

اپنے علم دوست، سخن فہم، فنا فی الکتب، عظیم دانشور، مصور و مؤرخ تاریخ پشاور ، ہم ذوق و ہم مزاج ، ہمدم دیرینہ ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئ

امام حدیث اور افکار شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی تعلیمات کے نقیب و علمبردار حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئ کے نام

كَتَبَ رَبُكُم عَلٰى نَفسِہ الرَّحمَۃ

<u>سانحہ ارتحال</u>

اس کتاب کی کتابت کے دوران 17 جون 2021 ء کو بروز جمعرات برادر عزیز ڈاکٹر جہان حسین شاہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بے پناہ فضل و کرم کے طفیل انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کے تین بچوں ڈاکٹر سید یاسر جہان، ڈاکٹر صدف عنبرین اور سید کاشف جہان کو دنیا و آخرت کے انعامات سے نوازے ۔ ان کی رفیق حیات اور ہماری خواہرِعزیز کو صبر و استقامت اور ایمان کامل کے نور۔ توانائی اور طاقت سے اطمینان و سکونِ قلب و ذہن کی دولت عطا فرمائے۔ آمین

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو تیرا

نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا

آسمان تیرے لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

تعارفِ کتاب

ڈاکٹرسید چراغ حسین شاہ گذشتہ پانچ دہائیوں سے ادب ۔ تواریخ ۔ تحقیق ۔ تنقید ۔ فلسفہ اور تصوف پر لکھتے رہے ہیں ۔ اُنکی ایک درجن سے زائید کُتب شائع ہوچکی ہیں جبکہ مختلف رسائل اور اِخبارات مختلف النوع موضوعات پر گاہے بگاہے ڈاکٹرصاحب کے مضامین بھی چھاپتے رہے ہیں۔ تمام شعبہ ہائے علم کو پرکھنے کا اُنکا اپنا ایک

انداز ہے ۔ آپ چاہے اُ نکے برآمد کردہ نتائج سے متفق نہ ہوں تب بھی اُن کی اِس سلسلے میں محنت اور مخلصانہ اور غیر جانبدرانہ رویے کی داد دیئے بغیرنہیں رہ سکتے ۔ بغیر کوئ لگی لپٹی رکھے موصوف اپنی بات اپنی اِستعداد اور وسائل کے مطابق ہر پہلو سے چانچنے پرکھنے کے بعد اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں ۔ اِس معاملے میں وہ آپ کو ناراض تو کرسکتے ہیں لیکن اپنا یہ دعوی' کسی صورت میں چھوڑنے پرتیارنہیں ہونگے کہ

ﮯ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے ۔

آپ البتہ اُنکے دلائل کا توڑ نئے مواد یا نئی تحقیق کی روشنی میں پیش کرکے اُنہیں مطمئن کر سکتے ہیں تو وہ آپ کی بات کوتسلیم کرنے میں ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے لیے باعث عار نہیں سمجھیں گے۔

براین بِنا نئےلکھنے والے اور خود اُ ن کے ہم سفر اہلِ علم اپنی تحریر اور تحقیق کو اُن کی رائے معلوم کرنے کے واسطے پیش کرنے سے نہیں ہچکچاتے ۔ اِس سلسلے میں نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ چونکہ مصنف کی زیادہ تر تحریریں پشتومیں ہیں۔ لہذا کتابِ ھذا میں ایسی کئ تحریروں کو اُردو کے قالب میں ڈالا گیا ھے۔

"تاثراتِ چراغ" میں ڈاکٹر صاحب نہ صرف دستیاب کتابوں کی تعریف ۔ توصیف اور اُن پر تنقید کرتے ہیں ۔ بلکہ ساتھ ہی فاصل مصنیفین کی حوصلہ افزائ کرتے بھی نظر آتے ہیں اور بھر پور انداز میں نئے پُرانے لکھنے والے

دوستوں کی مد د اور قارئین کے اِستفادہ کیلئے اپنی ذاتی تحقیق و جستجو کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات اُنہیں فراہم کرکے نہ صرف شکوک کا ازالہ کرتے ہیں بلکہ بہترین اندازمیں اُن کی راہنمائ بھی فرماتے ہیں ۔ وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ علم و دانش پر کسی کی اِجارہ داری نہیں ہے ۔ بلکہ یہ دولت اِنسانیت کی مشترکہ میراث ہے اور حقیقت تک رسائ کے لیے جِدوجُہد سب اہلِ دانش کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

"تاثراتِ چراغ" کی ورق گردانی کرتے ہوئے آپکی آہم موضوعات کے متعلق کئی نئے زاویہ ہائے خیال سے آشنائ ہوگی اور ڈاکٹر صاحب کی مُدلِل گفتگوآپ کو مسئلہ زیرِ بحث کو ایک نئے انداز سے دیکھنے پر آمدہ کردیگی ۔

اب اگر بالفرض آپ اُن سے پہلی دفعہ متعارف ہورہے ہیں تو ڈ اکٹر صاحب کی ذات اورادبی خدمات کے متعلق کتاب ھذا کے آخر میں ریڈیوپاکستان کو دیا ہوا اِنٹرویو پڑھ لیجئے ۔ جو کافی حد تک آپ کی جانکاری میں مُمد و معاون ثابت ہوسکتا ہے ۔

فہرست

الف ۔ شخصیات

١۔ حاجی بہادرصاحبؒ کوہاٹی

۲۔ بابا جی سید محمد علی شاہؒ

۳۔ امام سجاد علیؓ بن حسین زین العابدین

۴۔ انصاف پسند ادیب ۔ ایوب صابر

۵۔ ڈاکٹر فصیح الدین اشرف سلیمانی

٦۔ غلام محمد نذر صابری

ب ۔ کتابیات (تبصرے اور مقدمے)

1۔ ایک علمی کتاب (جواہرِاِقبال)

۲ ۔ ریاضِ حکیم خانی

۳۔ رہبرِدینِ متین پیرزین الدینؒ

۴۔ وقت کب شروع کہاں ختم (مصنف سید احمد عالم)

۵۔ بگڑے چہرے ۔ عبد الکافی ادیب

۶ ۔ تیرا انتظار ہے اب بھی

۷۔ دشتِ لوط کا مسافر

۸۔ چراغ تلے اندھیرا

۹۔ میرے سپنے (سحر بلوچ کی شاعری)

۱۰ ۔ ان دیکھی بلا ۔ ۔ تبصرہ ۔ ۔ عبدالکافی ادیب

ج ۔ مُطلق سچائی کی تلاش

د . موضوعات و مقالات

۱ ۔ افغان جنگ ایک فیصلہ کن لمحہ

۲ ۔ بے دہان خندیدن

۳ ۔ روشنائ تصوف ۔ ۔ نقد و نظر

۴ ۔ تصوف اور جِنس

۵ ۔ قانون کی حکمرانی

۶ ۔ عزت

۷ ۔ پشاور یونیورسٹی میں رشدوہدایت کے تین مراکز

ز ۔ انشائیۂ (نوائے سروش)

و ۔ انٹرویو

پروگرام اہلِ دانش ۔ ریڈیو پاکستان ڈی آئ خان

ھ ۔ منظوم گلہائے عقیدت

....

....

حاجی بہادر صاحب کوہاٹی (رحمہ اللہ علیہ)

صوبہ پختونخواہ (پاکستان) کی روحانی سلطنت کے آسمان پر تین حکمران جلوہ فرما ہیں۔ بُنیر (سوات) میں پیر بابا (رحمت اللہ علیہ) وادی پشاور میں کاکا صاحب

(رحمت اللہ علیہ) اور کوہاٹ میں حضرت حاجی بہادر کوہاٹی (رحمت اللہ علیہ) ۔ یہ فیوض و کرامات اور عنایات کے سرچشمے ہیں ۔ اب یہ ایک سالک طریقت کی فطری استعداد اور ریاضت پر منحصر ہے کہ وہ جود و سخاوت کے ان سرچشموں سے کس قدر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں ۔

بہادراُمت ۔ محی الدین و سنت دافع شرک و بدعت اور اپنے وقت کے مجتہد حضرت عبداللہ بہادر قدس سرہ العزیز کی زیارت پر چلہ کشی کرنے میں آج بھی یہ کمال و برکت ہے کہ سالک سلوک و معارفت چالیس دنوں میں اپنی مراد پا لیتا ہے اور خُدائے عظیم و برتر اسے اپنے مرشد و مقتداء کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہ فنا فی الشیخ کا اعلی مقام ہے ۔ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ پیر محمد علی شاہ (متوفی ۱۹۸۵ء) خواجہ عبدالرحیم باغدرہ شریف سے سلسلہ ہائے نقشبندیہ اور چشتیہ میں خلیفہ مجاز اور ماذون تھے۔ سلوک کے ابتدائی مرحلوں میں حکیم باغدروی (رحمت اللہ علیہ) کے حکم پر انہوں نے خواجہ عبداللہ بہادر کوہاٹیؒ کے روضۂ مبارک پر چالیس دنوں تک مراقبہ اور چلہ کشی فرمائ ۔ سالک راہ طریقت کا کہنا تھا کہ چالیس دنوں کے بعد ایک وقت جب میں ایک سبز چادر میں لپٹا قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھا تو ناگہاں بھاری قدموں کی چاپ سُنائی دی ۔ دوسرے مراقبہ کاروں کی صف میں سے ہوتا ہوا ایک مرد

جب میرے پاس کھڑا ہوگیا ۔ مصافحہ کرنے کو کہا ۔ میں نے پسینے سے تر کپکپاتے ہاتھ کو چادر سے باھر نکالا اس بزرگ نے میرے ہاتھ کو زور سے دبا کر فرمایا "حاجی بھادر کے مزار پر بیٹھے سالک حاجی بھادر تم خود ہو مبارک ہو اب تم جا سکتے ہو" اور واپس چل پڑا۔ میں نے چادر کو اپنے چہرے سے ہٹایا لیکن وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا ۔ ساتھ فروکش افراد نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جب مرشد عالی مقام کے ہاں حاضر ہوا تو انہوں نے بھی روحانی امراض سے شفایابی اور فنا فی الشیخ کے اعلی مقام کے حصول پر مبارک باد دی۔ لنگر قائم کرنے اور مخلوق خدا کی صحیح راہنمائی کرنے کی تاکید فرمائی ۔

قیوم مروت کافی دنوں سے تقاضا کررہے تھے کہ میں شوکت محمود صاحب کی اُس تصنیف پر ایک تبصرہ ایک مقالے کی صورت میں لکھوں جو انہوں نے اپنے عظیم المرتبت اور رفیع الدرجات جد امجد کے بارے میں تحریر فرمائی ہے اور میرے زیر مطالعہ رہی ہے ۔ انہوں نے یقینا ایک باسعادت اور نیک کارنامہ سرانجام دیاہے۔ خداوند تعالی ان کو دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے نوازے اور صاحب کتاب کی اولاد،اخفاد اور معتقدین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ شوکت صاحب نے اپنی استعدادکے مطابق قابل حصول دستیاب مواد کو یکجا کرکے ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے ۔

پیربابا ؒ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں اخوند درویزہؒ میسر ہوے۔ جنہوں نے اس مبارک ہستی کے حالات اور جیسے صاحب قلم، زاہد اور مورخ بطور خلیفہ اور مرید مراتب کو سپردقلم فرمایا۔ کاکا صاحب ؒ ان سے بھی زیادہ شہرت کے مالک بنے کہ انہیں اخوند اسماعیل جیسا فارسی کا بہترین نثر نگار معتقد، عبدالحلیم جیسا شیخ دانشمند علم بیٹا اور خوشحال خان خٹک جیسا نابغۂ روزگار صاحب سیف و قلم مرید باصفا دستیاب ہوے۔ جنہوں نے اس ہستی کے حالات زندگی، مدارج و مقامات اور کرامات کو تفصیلا قرطاس ابیض پر ثبت کردیا۔ اقلیم عرفان و ہدایت کے تاجدار اور میدان معرفت کے شہسوار حضرت عبداللہ کوہاٹیؒ کو بھی یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کے ایک مرید محمد درویش ترین ساکن لاہور نے حاجی بھادر صاحبؒ کی زندگی ہی میں ان کے مناقب تحریر کیے
۔

فاضل مصنف کی اس کتاب کا اب تک میں نے صرف ایک سرسری مطالعہ کیا تھا کہ ایک ادیب دوست اسے اُٹھا کر لے گیا۔ جس سے اب اس کی واپسی کی توقع صرف ایک خوش فہم اُمید ہی ہوسکتی ہے۔ بہرحال اپنے قیافے کے بل پر جس پر ماضی میں مجھے بڑا ناز تھا اس کتاب پر تبصرے کی ہمت کر رہا ہوں۔ لیکن اول بڑی معذرت کے ساتھ بس چند فروگذاشتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ مصنف نے درج زیل ذکر شدہ کتابوں خصوصا" دو بنیادی مآخذ اور اسناد تُحفہ السالکین اور نساج الحرمین (ڈاکٹر حنیف نے اپنے ایک مقالے میں اس کتاب کا نام "نتائج الحرمین" لکھا ہے) سے کما حقہ استفادہ نہیں اٹھایا۔

ا۔ تحفتہ السالکین؛ ۱۰۴۷ھ ۔ مصنف محمد درویش ترین لاہوری، مرید حاجی بہادر صاحب کوہاٹی۔

ب۔ نساج الحرمین / نتائج الحرمین ؛ سن تالیف ۱۱۳۱ ھ مصنف مولانا محمد امین مکی بدخشی۔ مرید سید آدم بنوری (رح) ۔

ج۔ قصتہ المشائخ ؛ مصنفه خواجه محمد زاهد اٹکی (رح) ۱۱۳۶ھ

د۔ تذکرة الابرار و الاشرار ۔ مصنف اخوند درویزه (رح) ۱۰۲۱ھ

ر۔ تاریخ مرصع ؛ افضل خان خٹک ۱۱۳۶ھ

ز۔ مجمع الانساب ؛ محمد نور (اولاد)

س۔ تاریخ سادات گدون (فاتح الانساب) مصنف محمد شاہ گندفی ۔

ش۔ کوہاٹ گزیٹیر ۔

ص ۔ پیر سباک ؒ ۔مصنف عقاب خٹک ۔

ض۔ کاکا صاحب ؒ ۔ مصنف عقاب خٹک ۔

ط ۔ شیخ رحمکارؒ ۔ مصنف سیاح الدین کاکاخیل ۔

ظ ۔ کاکا صاحبؒ ۔ مصنف بہادر شاہ ظفر کاکاخیل۔ [1]

اسی وجہ سے چند اہم نکات تشنہ لب رہ گیے ہیں۔ متضاد آراء کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔جس بنا پر یہ کتاب کافی حد تک سیرت و مناقب کا مجموعہ تو ہوسکتا ہے لیکن تاریخی تجزئے ، تنقید اور استنباط سے کم کام لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب ہذا کی علمی حیثیت اور تاریخی سند ضعیف پڑجاتی ہے: مثلا " ۔

۱۔ حاجی صاحب (رح) آگرہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے یا کہ علاقہ بنگش میں؟ جو ان کے باپ دادا کا وطن تھا۔

ب ۔ شیخ آدم بنوری سے پہلے انہوں نے شیخ فرید پشاوری سے طریقہ سلوک سیکھا؟ شیخ فرید کون تھے؟ شیخ آدم بنوری کے ایک خلیفہ کا نام شیخ فرید تھا۔ اخوند پنچو کے ایک بیٹے کا نام بھی شیخ فرید تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بنور جانے سے پہلے وہ کافی عرصہ پشاور میں سکونت پذیر تھے۔

ج۔ حاجی بہادر صاحب نے علم لُدنی اور عرفانی کی طلب میں کافی جدوجہد کی۔ آیا علم ظاہری بھی انھوں نے حاصل کی یا نہیں؟ کیونکہ نساج الحرمین/نتائج

الحرمین کی ایک عبارت ہے "افسوس کہ وہ علم ظاہری سے بے بہرہ ہیں " ۔

د۔ آیا مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اور مکہ معظمہ میں مجاوری کے اوقات میں انھوں نے صرف باطنی علوم حاصل کیے یا ساتھ ہی ظاہری علوم میں بھی حد کمال کو چھو لیا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ وضاحت، استنباط ، مناظرے اور مجادلے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

ر۔ مشہور ہے کہ حاجی صاحب پیشے (کسب) کے لحاظ سے نساج (جولاہا) تھے۔ عربی لغت میں نساج کثیر المعنی لفظ ہے۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ زرہ بنانے والا، جھوٹا، باتیں بنانے والا۔

شیخ فریدالدین عطارؒ کی تصنیف " تذکرہ الاولیاء" میں شیخ نساج (رح) کے نام سے ایک بزرگ کا ذکر آیا ہے جو شبلیؒ، جنید بغدادیؒ اور سری سقطیؒ کے ہم عصر اور مرید تھے ۔ اور جولاہے کا کسب کرتے تھے۔

س۔ کاکا صاحبؒ ان کے ماذون تھے۔ یہ درویش کا دعویٰ ہے جب کہ بہادر شاہ ظفر کاکاخیل تاریخی واقعات اور زمانے کی بنیاد پر اس خبر کی تردید کرتے ہیں۔

ش۔ حاجی صاحبؒ مشائخ اور مولوی (مولانا روم) کی کتابوں کا مذاق اڑاتے؟

ص۔ وہ ملامتیوں کے ہم مشرب بھی تھے۔

ض۔ حاجی صاحب ہنگو کے نزدیک مٹخوزہ نامی گاؤں میں فوت ہوے یا نہیں۔ یا پھر پشاور کے قریب بڈھ بیر نام کے علاقے میں بحالت سفر رحلت فرمائی؟

ط ۔ حاجی صاحب (رح) کوہاٹ میں مدفون ہیں یا پھر دکن میں جیسے کہ کتاب قصتہ المشائخ کا انکشاف ھے ؟۔

ظ ۔ محترم مصنف حضرت عبداللہ خویشکی ۔ مولانا عبداللہ قصوری اور خواجہ عبداللہ کوہاٹی کو ایک ہی شخصیت گردانتے ہیں۔ جبکہ راقم الحروف کے خیال میں یہ تینوں مختلف بزرگ ہیں ۔ اور ان کا زمانہ بھی ایک نہیں ہے۔

دراصل عبداللہ خویشکی قصوریؒ جنھوں نے کتاب "احوال و آثار" لکھی ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہم عصر تھے۔ جبکہ خواجہ عبداللہ کوہاٹی حضرت مجدد الف ثانی کے ایک نامی گرامی خلیفہ آدم بنوری صاحب کے خلیفۂ مجاز ہیں ۔ یہ ایسی ہی ایک تاریخی غلط فہمی ہے جیسے بعض مورخین اور مناقب نگار مجدد الف ثانیؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ۔ شیخ احمد چشتی قادری سونی پتیؒ اور شیخ احمد سونی لوہانیؒ کے اقوال، کرامات او مقامات کو ایک دوسرے سے غلط ملط کر بیٹھتے ہیں ۔

ع ۔ حاجی بهادر صاحب قومیت کے لحاظ سے سیّد ہیں یا پشتون ؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہاں بھی فاضل مصنف نے قوم اور نسل میں فرق نہیں کیا۔ حاجی صاحبؒ قومیت کے لحاظ سے یقینا افغان مشائخ میں سے ہیں۔ البتہ وہ نسلاً سیّد ہیں؟ اس سلسلے میں بھی شوکت محمود صاحب نے اثر افغانی مرحوم کی کتاب "روحانی رابطے" کے لکھے پر بھی کافی بحث مباحثہ کیا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے محقق اور مورخ کی حیثیت سے اثر صاحب نے اس موضوع پر تنقید اور تردید میں دونوں اطراف میں دلائل پیش کیے ہیں۔ اور کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے اور آخر تک متذبذب ہیں۔ البتہ میرے نام ایک خط محررہ ۲۶۔۸۔۱۹۷۳ میں انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس سے پتہ چلتا ہےکہ وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ حاجی صاحبؒ نسلاً" حسینی سیّد تھے۔ رقم طراز ہیں " یہ سینی اور صابری نسل کے افراد دراصل حسینی سادات ہیں۔ یہ بخاری کے نام سے موسوم سادات کی ایسی شاخ ہے جس کی اصلیت پر ابھی تک مکمل بحث نہیں ہوئی ۔ حضرت عبداللہ کوہاٹیؒ ، حضرت شیخ عبدالرحیم المعروف رحیم گل الملقب بہ شیخ رحمکارؒ ، عبدالرحیم شویکیؒ، مولانا عبدالوہاب پنجو باباؒ اور کوہاٹ کے سادات منصور خیل کے ایک شجرے میں مذکور پیر منگی(حضرت سیّد شیخ ابوالخیر مہنگی) اور پیر جنگیؒ ' پیر ضیاءالدین ابن پیر منکی (پیر مہنکہ)

کے ناموں سے یاد کیے گیے ہیں۔ میری تالیف حسینی صابری سادات (جلد دوم) میں اس سارے منظر اور پس منظر پر بحث کی گئی ہے"۔

جہاں تک اس بارے میں میرے نظرئے کا تعلق ہے تو میں اس حدیث قدسی پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ کُلُ تقی و نقی من اہلی (سب نیک اور پرہیزگار لوگ میری نسل سے ہیں) البتہ شوکت صاحب کی اس کتاب کا منظر عام پر آنا میں قاضی عبدالحلیم اثر مرحوم کے خوابوں کی تعبیر سمجھتا ہوں۔

غ ۔ اس کتاب میں اس وقت کے مذہبی اور سیاسی حالات کا تفصیلی جاءیزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ایسی شخصیت کا ظہور اس زمانے کو درپیش سیاسی حالات اور معاشی و معاشرتی افراتفری کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روشنائی تحریک تقریبا دم توڑ چکی تھی۔ لیکن اس کے اثرات بنگش، توری، افریدی اور دیگر قبائل کے درمیان ہنگاموں اور فساد کا سبب تھا اور مذہبی محاذ پر ایک صوفیانہ بدعت کا باعث تھی۔ حاجی بہادر صاحبؒ نے شرک و فساد و نفاق اور کفر و الحاد کے ان اندھیروں میں رشد و ہدایت، عرفان و معرفت اور اتفاق کی شمع روشن کی۔

ف ۔ اُدھر ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کی ایجاد کردہ تحریک جو مختلف مذاہب کا ملغوبہ تھا، کا سیاسی مطلب یہ تھا کہ ان مذاہب کو ایک لڑی میں پرودیا

جائے۔ لیکن مذہبی لحاظ سے دین اسلام کے خالص توحیدی چشمے کو گندہ کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے اس سازشی پالیسی کے خلاف اس انداز میں جہاد کیا کہ مسلمانوں کی مرکزیت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ صرف بادشاہ اور امراء کو راہ راست پر لانا ان کا مقصد تھا۔

مغلوں سے پہلے پشتون حکمرانوں کی بادشاہت گذر چکی تھی۔ اس لیے مغل پشتونوں سے خوفزدہ تھے۔ شاہجہان نے حضرت آدم بنوریؒ کو ملک چھوڑنے کا حکم اسی ڈر سے دیا تھا۔ کیونکہ اسے یہ ڈر لاحق تھا کہ کہیں ان کی سرکردگی میں پشتون یکجا اور متحد ہوکر ایک مضبوط قوت نہ بن جائیں اور مرکزی حکومت کے لیے ایک خطرہ نہ بن جائیں۔ بعد میں انہی شیخ آدم بنوریؒ کے دو مریدوں اخوند الیاسؒ اور خواجہ حاجی بہادر کوہاٹیؒ نے مرکزی حکومت اور پشتونوں کے درمیان تعلقات کو بہتر اور مضبوط بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کا مقصد عقیدہ اسلام اور مسلمانوں کی شان و شوکت قائم کرنا، آپس میں فساد اور خانہ جنگی کا تدارک اور فاسق و فاجر حکمرانوں اور امراء کو تبلیغ و ہدایت کے ذریعے راہِ حق پر لانا تھا۔ بھرحال مصنف نے اپنے محدود وسائل میں مختلف توجیہات اور تاویلات کو پیش کرنے کے بعد ذاتی ہمت و عرق ریزی سے کام لیکر یہ کتاب تحریر کی ہے۔ چونکہ وہ خود اس خاندان جلیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنے خاندانی

حالات سے کما حقہ واقف اور باخبر ہیں۔ اس بنا پر کتاب کی سند اور سچائی کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس کی اہمیت اور افادیت مسلمہ ہے۔ یقینا تاریخ، ادب، مناقب اور تصوف کے علماء اور طلباء کے ذوق مطالعہ کے لیے ایک پیاری، مفید اور قابل قدر دستاویز ہے۔

بابا جی سیّد محمد علی شاہ (چند یادیں)

(ڈاکٹر سیّد چراغ حسین شاہ' خاندان پیرسباک کے اسم با مسمیٰ چشم و چراغ ہیں۔ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مختلف سرکاری ہسپتالوں میں معالج رہے۔ صوبے کے بڑے ہسپتالوں میں ایم۔ ایس اور رجسٹرار رہے اور ڈی۔ ایچ۔ او کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوے۔ تاہم ان کی وجہ شہرت ادب اور ادبی خدمات ہیں۔ قریباً چھ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جو زیادہ تر تحقیق پر مبنی ہیں۔ پشتو تاریخ، ادب و ثقافت کے مدبر مانے جاتے ہیں۔ تاہم اردو میں بھی درجنوں مقالے اور کتب تصنیف کرچکے ہیں۔ پیر صاحب سے ان کا خاندانی رشتہ تو ہے ہی مگر حیران کُن طور پر انھوں نے اپنے بچپن کی یاداشتیں جس طرح مجتمع کرکے پیش کیں وہ لائق تحسین ہیں۔ (مشتاق حسین)

سالہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود

وہ عالم با عمل تھے۔ زاہد شب زندہ دار تھے۔ مرشد کامل تھے۔ محرم اسرار و رموز ربانی تھے۔ عارف بے بدل تھے۔ چرخ لامکانی اور طائرِ فضائے لاہوتی تھے۔ لیکن خاکسار کے لیے ان سے نسبتِ ہم نسبی اور قربتِ خاص کا رشتہ ہی باعثِ فخر و افتخار تھا۔ وہ میرے ایک انتہائی قریبی خاندانی بزرگ اور گل سرسبد خاندان شیخ المشائخ حضرت سیّدنا پیر سباکؒ تھے۔ مادر و پدر ہر دو سمت سے یکساں نزدیکی قرابت داری تھی۔ والد محترم اور والدہ ماجدہ ان کو " لالاجی" کہہ کر مخاطب کرتے۔ مریدین اور معتقدین میں وہ پیر صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ بعض خاندانی بزرگ انھیں فقیر صاحب بھی کہتے تھے۔ اور وہ خود بھی اپنے خطوط میں خود کو فقیر حقیر محمد علی شاہ لکھتے تھے۔ ان کی اپنی اولاد ان کو "جی صاحب" اور عزیزان نامهربان و بدگمان مثلِ برادرانِ یوسف انھیں فقط "حاجی" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن ہم خورد سال نسل عزیزوں کیلیے وہ صرف گگھڑ والے باباجی تھے۔ نادانی لاپرواہی، ناقص علمی اور جذباتی نوخیز عمر کے ماہ و سال کے واقعات کا ایک دھندلا سا خاکہ ذہن میں ہونے کے باعث یہ گنہگار ہیچ مدان لکھاری اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے کہ اقلیمِ سلوک و معرفت کے تاجدار کے روحانی مقام کا صحیح ادراک اس ناکارہ کے بس کی بات نہیں۔ صرف اپنی عابدہ و زاہدہ رابعہ ثانی ۔ مریم زمانی والدہ مرحومہ سے سُنی ہوئی ایک روایت، روبرو ملاقاتوں، چشم دید واقعات اور ذاتی مشاہدات کو سپرد قلم کرنے پر اکتفا کرونگا۔ اُمید ہے کہ باباجی کی

روح پُر فتوح ۔ قارئین کرام اور مرحوم کی لائق و فائق اولاد میری غلطیوں اور فروگذاشتوں کو معاف فرمائیں گے۔ میری والدہ نے مجھے بتایا۔ ’’لالاجی کے دو تین خوردسال بچے یکے بعد دیگرے ان کو داغِ مفارقت دے گئے ۔ اس غم و پریشانیوں میں ان کو اپنے خاندانی مرشد قطب عالم سیدنا خواجہ عبدالرحیم باغدرہ شریف نے سنبھالا دیا۔ انھوں نے علومِ ظاہری کے درس اور دیگر امورِ دنیاوی امور کوتیاگ کرکے فقر و تصوف کا جدی پدری راستہ اختیار کیا۔ اور یہی طریق ان کے واسطے مانند صبر ایوب کمال و جہہ وصف امتیاز بنا۔ جیسے کہ حبیبِ خداے پاک کا ارشاد ہےکہ ’’الفقرٰ فخری‘‘ ۔ مرشد کامل نے اُنہیں حاجی بہادر کوھاٹی کے مزارِ اقدس پر چلہ کاٹنے کا کہا۔ چالیس دن تک ایک چادر اوڑھے قرآن پاک کی تلاوت میں منہمک رہے۔ چالیسویں دن ان کو کسی فرد کے بھاری قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ مراقبے میں مصروف دیگر سالکین کی قطار میں سے گذر کر وہ رجلا لغیب ان کے پاس رک گیا۔ اور مصافحے کے لیے ہاتھ اگے بڑھایا۔ بلند اواز میں فرمایا ’’حاجی بہادر کے مزار پر بیٹھے حق کے متلاشی تم خود ہی حاجی بہادر ہو۔ تمھیں مبارک ہو۔‘‘ لالاجی صاحب نے اپنا ہاتھ اگے بڑھایا ۔ حال یہ تھا کہ سارا جسم خوف اور اشتیاق سے پسینہ پسینہ تھا۔ کسی نے ان کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور چل پڑا۔ چند ساعتوں کے بعد لالاجی نے جب آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو کوئی نظر نہیں ایا۔ آپ نے اپنے ارد گرد کے چلہ کشوں سے جب استفار کیا تو انھوں نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ مرید باصفا چلہ کاٹنے کے بعد جب اپنے پیر

مغاں کے دربار میں حاضر ہوے۔ سارا واقعہ اور اپنا حال بیان کیا۔ انھوں نے بھی آپ کو سلوک و معرفت کا یہ کٹھن مرحلہ بخیر و خوبی طے کرنے پر مبارک باد دی اور ساتھ ہی تاکید کی اب جاوء اپنے ہاں ایک لنگر قائم کرو اور مخلوق خدا کی بے لوث خدمت اور رب ذوالجلال کی طرف صحیح راہنمائی کرو۔

بہ مے سجدہ را رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

کہ سالکِ بے خیر نبود زِ راہِ رسم منزلہا

سالہا بعد جب ایک دن میں نے ان سے اس روحانی اور باطنی واقعہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی جراءت کی تو انکی آنکھوں میں آنسو اگئے۔ روہانسی آواز میں فرمایا ’’ گُلہ! (عزیزمن) اس وقت حال ہی کچھ اور تھا۔‘‘ بعد میں بسط قبض کے احوال بیان کرنے لگے اور اخفائے راز سے کام لیا۔ لیکن عاقل کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا تھا۔ مرشد عالی مقام نے اس کے بعد دو سلاسل عالیہ طریقت میں خلافت عطا کی۔ 1) نقشبندیہ 2) چشتیہ ۔

(اردو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ایک مضمون کے مطابق باباجی صاحب باغ درہ سالک اباد شریف کے خلیفہ مجاز ہیں۔ جبکہ چشتیہ میں میرہ شریف کے احمد صاحب سے فیض یاب ہیں۔ چراغ) اس طرح ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا ’’باباجی! اج کل ویسے تو ہمارے خاندان میں کافی افراد کسی نہ کسی سلسلہ طریقت میں بیعت ہیں۔ لیکن ان کا تعلق پیر کے ساتھ صرف مرید و معتقد کا ہے۔ ان میں سے خلافت کے منصب پر کوئی خال خال ہی فائز

ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ‘‘ مسکرا کر فرمایا۔ خلافت حاصل کرنے کیلیے کسی مرد کامل باصفا اور صاحب حق کے جوتے سیدھے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اج کل کی نسل کی تن آسان اور بر خود غلط انا پرست ہوگئی ہے۔ ورنہ فیض و عطا کے چشمے اب بھی جاری ساری ہیں۔

اگر کوئی شعیب آےء مُیَّسر

شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

برسوں سے خاندانی بزرگوں کا شیوہ تھا۔ کہ صبح و شام باہر مہمان خانے میں قال اللہ اور قال الرسول کی بابرکت محفلیں جمتی تھیں۔ یادگار سلف پیر طریقت و شریعت سجادہ و عمامہ سیّد مقبول شاہ مرحوم۔ شیخ الاساتذہ سیّد الاصفیا و الاتقیا منبع زہد جامعۃ الفضائل و الکمالات صدر مدرس مولانا جمعہ خان، سرپرست اعلیٰ مدرسہ ظفر ممہ خیل، منبع زہد و تقویٰ مولانا محبوب شاہ مرحوم ۔ پیکرِ صدق و وفا نانا جان الحاج سیّد زمان شاہ، جامع صفات خان فقیر حاجی مہابت خان صاحب، زینت العلماء حق، فاضل مدرسہ امینیہ دہلی، شاگرد شیخ الاسلام مولانا کفایت اللہ اور فیض یافتہ بدست حق پرست غوث زماں نصیرالدین غورغشتی، مولانا سید اکبر شاہ پیر سباکی، نازش علمائے لکی مروت فاضل دیوبند بخمل جان صاحب، چشمہ جود و سخا و عطا والدم صاحب حاجی الحرمین شریف سیابت پناہ سیّد حلیم شاہ علیہ الرحمہ۔ قاطع شرک و بدعت، معلم و مبلغ مولانا ولی خان صاحب، عالم حق گو اور مقرر بے باک خان الفقراء مولانا رحمت اللہ خان صاحب میناخیل لکی

مروت، خان الفقراء ملک حاجی ملوک خان، محبان اہلِ بیت رسول حاجی ممہ خیل صاحب اور انور خان صاحب جانی خیل، خطیب محراب و منبر طوطی خوش الاحان سیّدنا مولانا سید یعقوب شاہ صاحب، ٹھیکیدار سرکار، منبع کارہائے فلاح حاتم طائی زماں الحاج نوروز خان صاحب، اخونزادہ فقیرشیرزہ خان صاحب اور کئی دیگر متنوع الصفات ہستیاں شریک زینت محفل ہوتی تھیں۔

خداوند تعالیٰ معاف فرمائے راقم الحروف بچپن ہی سے مُنہ پھٹ اپنی عمر کی نسبت اور علمی اوقات سے بڑھ چڑھ کر بولنے والا اور بزرگوں کی عالیٰ ظرفی کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ان کی پُرنور او باوقار محفلوں میں بیٹھنے کا شوقین واقع ہوا ہے۔ ایک دن ایک صاحب جو حال میں حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل کرنے کے بعد واپس لوٹے تھے۔ کہنے لگے کہ مکہ معظمہ میں جہاں ابو جھل کا گھر تھا۔ آج کل وہاں بیت الخلا ہے اور اس جگہ کو ابوجھل کی ٹٹیاں کہا جاتا ہے۔ باعث صغیر سنی عقل کی نارسائی میں یہ جسارت کر بیٹھا اور بولا۔ حاجیوں کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ ابوجھل کافر تھا۔ مشرک تھا ۔ لیکن تھا تو حبیب خدا اور سرکار دو عالم کا ہم قوم۔ سردار اور رشتہ دار اور ــــــ ’’اپنے دشمن کی اہانت ہے کمینوں کا شعار‘‘

حاضرینِ محفل پر سناٹا چھا گیا اور بعض کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ لیکن باباجی مسکرائے اور پیر پٹھان حضرت سلیمان تونسوی کا ایک واقعہ بیان فرمایا۔ دربارِ تونسوی کی مسجد کے ایک امام صاحب ہر شام کی نماز میں سورۃ لھب کی تلاوت ضرور کرتے۔ ایک شام حسبِ معمول

مولانا صاحب نے " تبت یدا ابی لھب وتب" پڑھی۔ تو یکا یک پیر تونسوی (رح) جلال میں آئے ۔ پیچھے سے امام صاحب کی گردن پر ہاتھ ڈالا ۔ اور فرمایا " اللہ جانے اور اسکا محبوب" تم کون ہوتے ہو کہ حبیب خدا کے چچا کے بارے میں روز کہتے ہوکہ ابو لھب تمھارے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ اس طرح بابا جی نے بالواسطہ میری تائید فرمائی۔ عرصہ بعد ایک حدیث پاک میری نظر سے گذری کہ جنگ بدر کے موقع پر ابولھب کی ایک بیٹی گرفتار ہوئی اور وہ مسلمان ہوگئی۔ لیکن اسلام لانے کے بعد بھی عورتیں اُس کو اِس آیت کریمہ کے حوالے سے طعنہ دیتی تھیں۔ رشتہ داروں کے حق میں صلہ رحمی کا درس دینے والے نبی برحق کو پتہ چلا تو مزاجِ اقدس پر گراں گذرا۔ مسجد نبوی تشریف لائے، منبرِ رسول پر جلوہ افروز ہوکر فرمایا۔ "مسلمانو! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ میرے رشتہ داروں کے حوالے سے مجھے دُکھ دیتے ہو۔ "

مشاہیرِ اُمت کے بارے میں رائے؛

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ :

اقبال کے بارے میں آپ کے ارشادات میرے بہت کام آئے۔ ایک واقعہ یوں ہوا کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام اباد میں ہمارے دوست حیران خٹک نے اپنی تصنیف"اقبال اور دعوتِ دین" مجھے عنایت کی اور اس کتاب کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ میں نے انھیں صاف بتایا کہ کتاب اچھی ہے لیکن اس میں مہرعلی شاہؒ اور میاں شیر محمد شرقپوریؒ سے اقبالؒ کے تعلقات کا ذکر

نہیں۔ اور پھر انھیں باباجی سے سُنا ہوا ایک قصّہ بیان کیا۔ کہ کس طرح سخت پابند شریعت بزرگ جناب شیر محمد شرقپوریؒ اس شخص کو ملتے ہی نہیں تھے جس کے چہرے پر داڑھی نہ ہوتی۔ لیکن اقبال کا نام سُنتے ہی وہ ان کے پاس برہنہ پا دوڑ کر آے اور فرمایا کہ اس شخص کا باطن ایک خوبصورت داڑھی سے مزّین ہے۔ حیران خٹک نے تحریری سند مانگی۔ میں کچھ حواس باختہ ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ باباجیؒ کا روشن چہرہ میرے سامنے آیا۔ اور بائیں طرف اشارہ فرمایا۔ میرے ساتھ ایک اجنبی شخص بیٹھا تھا۔ اس نے گواہی دی کہ وہ شرقپور کا رہنے والا ہے اور اسکے والد صاحب اس واقعے کے عینی گواہ ہیں۔ حیران خٹک اور میں دونوں حیران کہ یا اللہ! یہ شخص کہاں سے آگیا۔ نہ ہی پہلے اس شخص کا اس اکیڈیمی میں آنا جانا تھا۔ اب آپ اس کو اقبال کا اعجاز سمجھیں۔ حضرت خواجہ شرقپوری کا تصرف و فیض کہیں یا باباجی کی کشف و کرامت۔ بعد میں مشہور اقبال شناس شاکراحمد اعوان صاحب نے بھی اس واقعہ پر مہر تصدیق ثبت کی۔

جناح صاحبؒ:

ایک دن فرمانے لگے کہ محمد علی جناح کے بارے میں اس زمانے کے کئی علمائے دین اور صوفیائے کرام کی طرح میرے دل میں بھی کچھ تحفظات تھے۔اسلامیہ کالج پشاور میں جلسہ تھا۔ اپنے مرشد عالی مقام حضور باغدری صاحب مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ بادلِ ناخواستہ ان کی تقریر سُنی۔ لیکن متأثر نہ ہوا۔ اس موقع پر مشہور پشتو

نعت خوان شاعر عاشقِ رسول مولانا محمد امین صاحب بھی حاضرین محفل کے دل گرماتے اور ایمان تازہ فرماتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد میں اپنے پہلے حج کے لیے ارض مقدس جا رہا تھا۔ حاجی کیمپ مزارِ قائداعظم کے پاس ہی تھا۔ ایک دن میرے قدم ایک غیبی اشارے پر مزارِ قائد کی طرف اُٹھ گئے۔ اور وہاں دل کی گہرائیوں سے اس محسن اسلام اور مسلمانانِ ہند کے لیے ڈھیر ساری دُعائیں مانگیں۔

باباجی پر اگرچہ بظاہر سلسلہ عالیہ نقشبندی مجددیہ کے احوال غالب تھے۔ لیکن سہروردیہ اور قادریہ ان کے جدی سلسلے تھے۔ اس طرح وہ سلاسل عالیہ نقشبندیہ مجددیہ، چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے مجمع البحرین تھے۔ میں اُن دنوں حضرت امیر حمزہ شنواری چشتی علیہ الرحمہ کے خیالات سے خاصہ متأثر تھا۔ اور ان کی کتاب ''وجود و شہود'' میری نظر میں تھی۔ حمزہ صاحب کے ایک خط کے حوالے سے باباجی سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی (رح) نے بڑے طریقے اور ہُنر سے کام لیکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہلِ بیت کرام کی توہین کی ہے اور ان کا مرتبہ شیخان عظام رضوان اللہ علیہم اور اصحابہ کرام سے کافی نیچے کرکے بیان فرمایا ہے؟۔ باباجی کچھ دیر خاموش رہے۔ چند ساعت بعد فرمایا۔ ''عزیزم! مجدد الف ثانیؒ نے تین درجات بیان فرمائے ہیں۔ 1 نبوت، 2۔ امامت/ خلافت 3 ۔ ولایت۔ اعلےٰ ترین مقام نبوت پر انبیاء کرام فائز ہیں۔ امامت شیخان عظام رضوان اللہ علیہم کے حصّے میں ائی اور امام الاولیاء شیر خدا کرم اللہ

وجہہ ہیں۔ اور یہ جان لو کہ تینوں امام خلفاء بھی اولیائے کرام کے صف اول میں شامل ہیں اور پھر یہ شعر پڑھا۔

چراغ مسجد محراب و منبر

ابوبکر و عُمر، عثمان و حیدر

اس طرح ایک دفعہ میں یہ پوچھنے کی گستاخی کر بیٹھا۔ ’’ باباجی! خاکم بدہن یہ شعر امام ربانی علیہ الرحمہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟۔

پنجہ خود در پنجہ خدا دارم

من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

باباجی کے چہرہ انور پر چند لمحوں کے لیے سُرخی چھا گئی۔ فرمایا یہ سچ ہے کہ صوفیاے عظام کے منہ سے عالم جذب و سکر میں ایسے کلمات نکلتے ہیں۔ جنھیں ہم آج سطیحات کے درجے میں رکھتے ہیں۔ لیکن میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے بارے میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ شعر ان کے انتہائی حساس شرعی مزاج سے بالکل ہی مطابقت نہیں رکھتا۔ بعد میں جب میں نے مکتوبات شریف پڑھے تو مجدد صاحب کے شرعی اخلاص۔ نیک نیتی اور روحانی دنیا میں ان کے انتہائی بلند مقام کا دل سے معتقد ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مذکورہ شعر ایک مجذوب الحال قادری بزرگ کا ہے۔

لا لا عبدالرحیم نیازی کے ساتھ ایک ملاقات؛

لالا عبدالرحیم نیازی اسلامیہ کالج پشاور کے قیام (1913) سے فلسفہ اور منطق کے استاد تھے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج بنوں کے پرنسپل بن گئے۔ عقل سے حقیقتِ کُل تک رسائی ناممکن تھی۔ اس لیے وجدان کو عقل پر ترجیح دی۔ فلسفے کو چھوڑ کر فارسی کی صوفیانہ شاعری پڑھانی شروع کردی۔ لکچر کے دوران مالک حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے۔ آخرکار فضل خداوندی سے شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) سے اویسی طریقے سے فیض پایا۔ وائس چانسلر چوھدری محمد علی صاحب ان کے اولین شاگردوں میں سے تھے۔ قابل فخر شاگرد نے نسل نو کی روحانی اور اخلاقی تربیت کی خاطر انھیں یونیورسٹی کیمپس پر اعزازی پروفیسر کا درجہ دے کر رہائش فراہم کردی۔ حق کے متلاشی اُستاد، شاگرد عالم و فاضل، فقراء و صلحاء آتے اور بقدر ظرف و استعداد اپنا حصّہ پاتے۔ ایک دن ممریز خان ٹھیکیدار باباجی کو بھی ساتھ لے گئے۔ کہتے ہیں کہ ''ولی را ولی می شناسد'' دونوں بزرگوں نے تعظیماََ ذرا جُھک کر مصافحہ کیا۔ لالا صاحب نے مولانا روم (رح) کا ایک شعر پڑھا۔ باباجی نے شیخ سعدی کے ایک شعر میں اس کا جواب دیا۔ (افسوس یہ نالائق وہ اشعار نوٹ نہ کرسکا۔) دونوں اطراف سے اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہا گیا۔ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ حاجی ممریز خان اور یہ گنہگار ہونقوں کی طرح صرف چہروں کو دیکھتے رہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ فقط ایک تعارفی تقریب تھی۔ ایک نے پوچھا۔ ''تُو منّور از جمال کیستی؟ '' تو دوسرے کا سوال تھا کہ۔ '' تُو مکمل از کمال کیستی ؟ '' لالا صاحب شک و شبہات کے اندھیروں میں ٹوکریں

کھاتے، گمان و قیاس کے پردے چاک کرتے اور فلسفے منطق کی گھتیاں سلجھا کر جس مقام کمال تک پہنچے تھے۔ باباجی شریعت و طریقت اور معرفت کے محفوظ راستے سے گزر کر اس منزل جمال کو پا چکے تھے۔ یوں یہ ملاقات گویا بمثل ابن رُشد اور ابنِ عربی کا آمنا سامنا تھا۔ جس پر مجدد الف ثانی کی تجلیات کی پرچھائیاں برس رہی تھیں۔ سال دو بعد جب لالا صاحب واصل بحق ہوئے اور یہ خبر میں نے باباجی کو بتائی تو دونوں ہاتھ اُٹھا کر لالا صاحب کی مغفرت اور درگاہِ خداوندی میں ان کے درجات کی بلندی کے لیے بصد عجز و نیاز دُعا مانگی۔

دُنیاوی فہم و فراست؛ ایک بار باباجی (رح) فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِ حکومت میں عوام ا ور معتقدین کے بے حد اسرار پر بی۔ ڈی ممبر منتخب ہو گئے۔ صدر ایوب خان کسانوں کے ایک کنوینشن میں شرکت کے سلسلے میں اٹک آئے۔ باباجی نے کسانوں اور کاشتکاروں کی بہبود و بھلائی کے سلسلے میں ان کے سامنے ایسے اہم نکات پیش کیےکہ صدر مملکت ان کے فہم و فراست اور کسانوں اور مالکانِ اراضی کے درمیان اچھے اور بہتر تعلقات قائم کرنے اور دونوں کے حقوق اور فرائض وضع کرنے کے فارمولے سے متأاثر ہوے بغیر نہ رہ سکے۔ اسکے بعد ایک بھرے جلسے میں صدر ایوب خان نے علاقہ نالہ نندنا کے اس فقیر کی دانش کی برملا تعریف کی۔ ان کے ایسے ہی مثبت کردار کی وجہ سے علاقے کے عوام و خوانین دونوں ان کے فیصلوں کو عزت و

تکریم کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان پر عمل پیرا ہوتے۔

اندرونِ حرم پاک کی سعادت؛ اللہ تعالیٰ نے باباجی کو ایک نورانی چہرے کے ساتھ ایک دلنواز شخصیت سے بھی نوازا تھا۔ اہلِ عرب بھی ان کی جمالی شخصیت سے متّاثر ہوے بغیر نہ رہ سکے۔ پہلی بار جب حرمِ پاک میں حاضری دی۔ تو اس وقت حرم شریف کو عطرِ گلاب کا غُسل دے کر غلافِ کعبہ تبدیل کیا جا رہا تھا۔ آپ کے دل میں بھی بیت اللہ شریف کو اندر سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مسبب الاسباب نے اسی وقت یہ موقع فراہم کر دیا۔ خادمانَ کعبہ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے پاس بُلایا۔ سہارا دے کر اوپر اُٹھا لیا۔ اس طرح آپ کو خانہ کعبہ کے چاروں گوشوں میں نوافل پڑھنے اور رحمت، بخشش و معرفت کی دُعائیں مانگنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

باباجی کا وعدہ : بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تھی۔ اُن دنوں میں اپنے جد امجد قطب الاقطاب۔ غوث زمان حضرت پیر سباک (رح) کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب لکھنے کا سوچ رہا تھا۔ باباجی سے مشورہ مانگا۔ بے حد خوش ہوے، کامیابی کی دُعا فرمائی اور ہر قسم کی علمی اور مالی معاونت کا وعدہ فرمایا۔ اپنے والد مرحوم میاں گل شاہ ابن سید امیر شاہ کا صدی پہلے دستی تحریر کردہ ایک شجرہ جو میرے پاس پہلے سے موجود دیگر خاندانی شجروں سے زیادہ معلوماتی اور تفصیلی تھا مجھے عنایت فرمایا۔ ایسے ہی ایک خط میں میرے چند تحفظات و اعتراضات کو دور فرمایا۔ افسوس وہ جلد ہی عالمِ بقا کی

طرف رخصت ہوگئے۔ البتہ اُن کے ایک سخن فہم مصنف و موءلف بیٹے سید مشتاق حسین شاہ نے اس کتاب کی چھپائی کے ہر مرحلے میں میری مدد کی۔ (جزاک اللہ فی دارین خیرا)۔

علومِ ظاہری کے حصول کے بعد ابتدائی سالوں میں آپ کی طبیعت میں جلالی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اور شرعی حدود سے ذرا سی تجاوز کسی میں دیکھتے تو اس پر برہم ہوجاتے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک جوان مارا گیا۔ جوان کلین شیو اور سر کے بال فوجی کٹ تھے۔ آپ نے اس کا جنازہ پڑھانے سے انکار کردیا۔ گاوں اور علاقے کے نوجواں ان کے آگے سے برہنہ سر گزرنے سے گریز کرتے۔ بعد میں طریقت و معرفت میں مزید عروج روحانی کے ساتھ ساتھ طبیعت پر اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مشفقانہ رنگ چڑھتا گیا۔ کردار، اخلاق اور حلیمانہ گفتگو سے مخلوقِ خدا کی اصلاح اور راہنمائی کرتے۔ خود تو ذاتی زندگی میں انتہائی پاکباز اور پابندِ شریعت بزرگ تھے۔ لیکن دوسروں کی زندگی سنوارنے کے لیے نرمی، حلم اور خوش گفتاری سے کام لیتے۔ علمائے صالحین اور اولیائے عظام کی روزمرہ مخزن اخلاق زندگی سے مثالیں دیتے۔ گناہ سے نفرت اور گنہگار کو سینے سے لگانے کا درس دیتے۔ طالب و جویا قول ا حسن کی بدولت راہِ راست کی طرف گامزن ہوجاتا۔

شکرانہء نعمت : ایک رات سرورجان خان مرحوم چیف انجنئیر اور سیکریٹری پی۔ ڈبلیو۔ ڈی (سابق صدر غلام اسحاق خان کے سُسر) کے پُر آسائش مہمان خانے میں

آرام فرما رہے تھے۔ لیکن آرام کہاں اہلِ خانہ نے دیکھا کہ کمرے کی بتی ساری رات جلتی رہی اور مہمان مصلیٰ بچھا کر یادِ خداوندی میں مصروف تھے۔ صبح کسی نے اتنی ریاضت اور عبادت کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔ ’’جس ذاتِ پاک نے مجھے رات اتنی نعمتوں اور سہولتوں سے نوازا۔ اسے میں غفلت میں کیسے گزار دیتا۔ اور اس صاحب فضل و کرم و عطا کا شُکر کیوں ادا نہ کرتا؟۔

حِس مزاح : با باجی ایک لطیف اور شائستہ حس مزاح کے مالک تھے۔ جب پہلی بار ان کا واسطہ مروت پشتون مریدوں سے پڑا۔ تو چند دن بعد ایک بے تکلف بزرگ نے ان سے حال پوچھا۔ تو باباجی نے مسکرا کر فرمایا۔ ’’عجب بے تکلف اور بے باک قوم ہے۔ محفل میں ہر فرد مجھ سے کہتا ہے ۔ جی دلتہ کُنہ ولگوہ۔ اب اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔‘‘ اب اس پشتو محاورے کا سیدھا سادہ لغوی مطلب یہ ہے۔ کہ یہاں تشریف رکھیے۔ چونکہ پشتو زبان کے محاوروں میں ایک فطری سادگی، شوخی اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ اور لکھنوی درباری خوشامدانہ اور بناوٹی انداز مفقود ہے۔ اس محاورے کے لفظی معنی یہ ہیں کہ حضرت مقعد کے بل بیٹھ جائیے۔اس بارے میں مجھے مشہور سیاسی لیڈر ڈاکٹر خان صاحب کا اسی قسم کا ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ لیکن مضمون کی طوالت کے ڈر سے لکھنے سے قاصر ہوں۔ تاہم مشہور پشتو شاعر غنی خان کا اس پر یہ شعر حاضر ہے۔ (اتفاق سے غنی خان ڈاکٹر خان صاحب کے سگے بتیجھے تھے)۔

والله چې جنت نہ بہ شم راستون
چې پۀ کښې نۀ واورم کنځله د پښتون

ترجمہ۔ خدا کی قسم جنت سے بھی پلٹ آؤں گا، نہ سُنی جو وہاں پشتونوں کی دشنام طرزیاں ۔

ایک دفعہ موضع خواجہ خیل کے ایک حُجرے میں تشریف فرما تھے۔ کسی غرض سے باہر تشریف لے گئے لیکن جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ حاضرین محفل نے وجہ پوچھی ۔ تو فرمایا باھر ایک نوجون اپنی نئی خریدی ہوئی بندوق کندھے پر اُٹھاے آ رہا تھا۔ ایک دوست نے طعنہ دیا کہ نشانہ تمھارا صحیح نہیں ہے ۔ کیا ہوا کہ بندوق نئی خریدی ہے ۔ میں تمھارے سامنے کھڑا ہوں آزماتے ہیں کہ تمھارا نشانہ کیسا ہے؟۔ اب پہلے والے حضرت نشانہ لے رہے ہیں۔ اور اس کا دوست اُچھل کود کر اس کے نشانے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دل میں خیال گزرا ۔ کہیں اس نوجوان کو یہ بات سوجھ نہ جاے کہ یہ پیر بنا پھرتا ہے۔ چلو اس حضرت پر یہ مشق کرکے دیکھتے ہیں۔ کہ گولی سے بچنے کے لیے کسی کرامت کا مالک ہے یا نہیں؟ ۔

مھدی شاہ بابا حضرت کے رشتہ دار اور ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ان کے دو فرزند مستند عالمِ دین اور شیخ الحدیث تھے۔ ایک مسئلے کے بارے میں دونوں بزرگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ معاملے نے طول پکڑا اور بات ان بن اور ذاتی رنجش میں بدل گئی۔ ایک دن میں نے پوچھا باباجی! مھدی شاہ صاحب آپ کے قریبی عزیز اور

ہم عُمر بھی ہیں۔ یاد کریں کبھی ان کی ذات نے آپ پر کوئی احسان بھی کیا ہے؟۔ فرمایا۔ ہاں! طالب علمی کے زمانے میں ایک بار میں ایک دوسرے گاوں کے استاد کی تکلیف تھی۔ مہدی شاہ کچھ اور بچوں کے ساتھ کپڑے سے بنے ہوے ایک سخت گیند سے کھیل رہا تھا۔ میں نے خوشی کے اظہار کے طور پر اس کا نام پُکارا۔ مہدی شاہ نے آوء د یکھا نہ تاوء، سخت گیند تاک کر مجھے مار دی۔ اتفاق سے گیند سیدھی میرے جسم سے نکلی ہوئی ہرنیا پر پڑی۔ چند لمحوں کی تکلیف کی وجہ سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یوں ہوا کہ ہرنیا ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا باباجی! آپ نے اچھی خاصی ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی۔ کیا اس علم نے آپ کو اس دنیا میں کوئی فائدہ بھی پہنچایا ہے؟۔ مسکرائےء اور فرمایا کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کیمبل پور (اٹک) اور پشاور کے درمیان دن ڈھلنے کے ساتھ ریل گاڑی کی آمد و رفت اٹک پُل بند ہوجانے کے باعث رُک جاتی تھی۔ مسافروں کو پیدل پُل عبور کرنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ سخت گرمیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے ماموں مرحوم فضل شاہ صاحب کے ہمراہ اٹک کے پرلے کنارے پر اُتر گیا۔ انتہائی پیاس کی وجہ سے زبانیں سوکھ چکی تھیں۔ اس دوران ایک ایف ۔ سی کا سپاہی ہاتھ میں خط پکڑے بدحواس ایک ایک مسافر کے پاس جا رہا تھا۔ تاکہ کوئی پڑھا لکھا شخص اسے خط کی عبارت سُنا دے۔ ان دنوں پڑھے لکھے فرد شاذ و نادر ہی ملتے تھے۔ سپاہی اس

بھاگم دوڑ کے عالم میں ہمارے پاس بھی آیا۔ ماموں سے پوچھا آپ میں سے کوئی لکھا پڑھا فرد ہے؟۔ ماموں نے جٹ سر ہلایا لیکن پہلے ایک جام پانی کا تقاضا کیا تاکہ گلا اور زبان تر ہوجاے۔ سپاہی خوش ہوکر بولا۔ ایک منٹ میں پانی لایا ۔ کچھ دیر بعد بیچارہ پہاڑی کی چوٹی پر سے بھرا ایک گھڑا سر پر اُٹھا کر لایا۔ ماموں نے خط میرے حوالے کیا۔ میں نے پہلے ایک گڑوی ٹھنڈا پانی ماموں کو پلایا اور اس کے بعد خود پیا۔ بعد میں وۃ خط سپاہی کو پشتو ترجمے کے ساتھ پڑھ کر سنا دیا۔

میں نے اپنے علم کے عوض زندگی میں بس یہ ایک جام ٹھنڈے پانی کا فائدہ اُٹھایا۔ اور اب آخرت میں حوضِ کوثر کے کنارے شافع محشر کے ہاتھوں جامِ کوثر پینے کی آرزو ہے اور رو پڑے۔

باباجی کی وفات کے بعد جب ہم اُن کے جنازے کے ساتھ قبرستان جارہے تھے۔ تو راستے میں ہمارے خاندان کی ایک عظیم دانشور ہستی اور نامور انگریزی، اردو اور فارسی مصنف ، موءلف اور مترجم سیّد محمد ایوب بخاری ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس خاندانی سانحے کے بارے میں میرے تأثرات پوچھے۔ تو میری زبان سے بے ساختہ بصد افسوس یہ الفاظ نکلے چاچاجی! ’’ آج ہمارے خاندان سے معرفت اور فقر رخصت ہوگیا۔ ‘‘

ترکشِ ما را خذ نگِ آخرین ۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔

التجائے مصنف : رب دو جہان اس ذکر صالحین اور عابدین کے صدقے اور طفیل راقم الحروف، اس کے والدین، دیگر ابا و اجداد، آل اولاد، بھائی بہنوں، عزیز و اقارب ، تمام مسلمانان عالم اور اس مضمون کے قارئین کرام کو شافع محشر اور ساقیء کوثر کے دست اقدس سے آبِ کوثر کے بھرے جام عطا فرماےء ۔ آمین ۔

امام سجاد علی بن حسین زین العابدین (رح)

ایک مشہور مستشرق ایم ۔ ڈونلڈسن اپنی کتاب ‘‘شیعیت ریلیجن آف اسلام’’ میں لکھتا ہے:۔

‘‘ آئمہ کرام کے حالاتِ زندگی کے بغور مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی غیر معمولی شخصیات کو غیر فانی بنا دیا گیا ہے ۔ اس مسئلے کے حل کی بہترین صورت یہ ہے کہ قدیم ترین ماخذ سے معلومات اکٹھی کی جائیں اور ان کے بل بوتے پر یہ فیصلہ دیا جاے کہ تعظیم و تقدیس کے جو خیالات ان کی شخصیت سے منسوب کر دیے گئے ہیں، اس سے قطع نظر حقیقی زندگی میں یہ اشخاص کیسے تھے؟ اور زمانہ مابعد میں جن

قصوں اور افسانوں نے ان کے بارے میں الوہیت کا جو تصوّر پیش کیا ہے ان کی صحیح تصویرکشی کی جاے''

ایسا ہی آج کل کا ایک دوسرا محقق سیدنا زین العابدین (رح) کے متعلق پوچھتا ہے کہ اُن کی ذات سے ایسا کون سا کارنامہ ظہور پذیر ہوا، جو دین اسلام کی ترقی اور ارتقا کا باعث بنا؟ انہوں نے اس دنیا میں کونسا علمی کارنامہ سرانجام دیا؟ کونسی جگہوں میں دین کی تبلیغ کی؟ کتنے افراد کو رشد و ہدایت کی راہ دکھا دی؟ اور کس جہاد میں حصہ لیا؟ ہماری معلومات تو یہ ہیں کہ وہ ایک گوشہ نشین بزرگ تھے۔ جن کو اپنے وقت کے حکمرانوں کے عطیات اور وظائف نے دنیا اور روزگار کے غموں سے فارغ کردیا تھا۔

آج ہم اس مضمون میں اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے کہ یہ بزرگ جو زین العابدین، سجاد ، ذوالمحسنات، ابن الخیرتین، سیّدالعارفین اور الزکی الامین کے معزز القابات سے موسوم تھے۔ اپنی فانی زندگی میں وہ ایک مقدس سیرت کے مالک تھے۔ ایک خاموش دل کی دنیا کو بدلنے والی اسلامی تحریک تھے۔ عرب اور عجم کے درمیان ایک مضبوط پُل تھے۔ وسیع اسلامی فتوحات کی وجہ سے بے شمار خادم اور کنیزیں مسلمانوں کے ہاتھوں لگیں۔ جس نے ایک بڑی معاشرتی اور اخلاقی قباحت کو جنم دیا۔ امام سجاد نے اس معاشرتی اور اخلاقی قباحت کا زور گٹھانے کے لیے لاکھوں غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کیا۔ اس طرح اپنے اس عزم سے دنیا کے سارے غلاموں کی غلامی کی زنجیریں توڑ

دینے کی کوشش کی۔ حرہ کی جنگ میں نہ صرف مدینے کی چار سو عورتوں کو پناہ دینے سے ان کی عصمت اور عفت کی حفاظت کی بلکہ مروان اور عبدالمالک کو بھی پناہ دی۔ اگر کثیر ممالک پربزورِ شمشیر و سازش تسلط جمانا، مالِ غنیمت کے نام پر لوٹ مار، ضمیر کے لین دین اور سودے، کنیزوں اور غلاموں کی خرید و فروخت کےلیے منڈیاں قائم کرنا حاکمِ وقت کے لیے عیش و عشرت کے سامان اکٹھے کرنے اور شمشیر کے زور پر اپنے ملوکیتی جذبے کوتسکین مُہیا کرنے کا نام اسلام کی خدمت اور ترقی نہیں بلکہ قیصر وکسریٰ کے استبدادی حربے اور شیوے ہیں۔ اور یہ بزرگ ہستیاں یقیناً اس کام میں ناکام رہی ہیں۔ لیکن اگر اسلام اخلاقِ عالیہ اور فاخرہ کا نام ہے، اعلیٰ انسانی اخلاقی اقدار اور روحانی فیض اور انعام کے بل بوتے پر دلوں کی تسخیر اور ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کا حصول اسلام کی خدمت ہے تو یہ بزرگ ہستیاں اسلام اور انسانیت کے عظیم مُحسن ہیں۔ درج ذیل اشعار جس طرح امام حسین (رض) کی شانِ اقدس میں صحیح ہیں۔ ایسا ہی ان کی اولاد کے بارے میں بھی سچے ہیں۔ جو انسانیت کی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین (رض)
عرش نوعِ بشر کے تارے ہیں حسین (رض)
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پُکارے گی ہمارے ہیں حسین (رض)

حضرت زین العابدین (رض) سیّدالشہدء حضرت امام حسین (رض) اور شہربانو بنت یزد جرد بن شہریار کے بیٹے تھے۔شہربانو بی بی حضرت عمر ابن الخطاب (رض) کے عہد خلافت میں حضرت امام عالی مقام کی زوجیت میں داخل ہوئیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے فرزند سے فرمایاتھا ''اے ابو عبداللہ! اس بی بی کے واسطے سے تُم روے زمین پر سب سے بہترین اولاد کے باپ بن گئے '' اس بی بی کے دیگر نام اور القاب غزالہ، سلافہ اورخولہ تھے۔

خد وخال ، حُلیہ مبارک : علی بن حسین اپنے حُسن و جمال میں لاثانی اور یکتا تھے۔ جسمانی لحاظ سے کمزور اور ناتوان تھے۔ آنکھوں میں نرم و مالئم نُور تھا۔ ان کی والدہ محترمہ اولاد کی پیدایش کے وقت وفات پاگئیں اور ایک کنیز جو غالباً سندھی النسل تھیں، نے آپ کی پرورش کی اور ان پر ایک حقیقی ماں کی محبت اور شفقت نچھاور کی۔

تعلیم؛ تعلیم اپنے والد امام حسین (رض) اور چچا امام حسن (رض) سے حاصل کی۔ ان کے علاوہ چند صحابہ کرام (رض) ، امہات المومنین (رض) یہان تک تابعین کرام کی خدمت میں بھی حاضر ہوے۔ علمی باتوں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات سے خود کو باخبر رکھتے۔ ان بزرگوں میں جابر بن عبداللہ انصاری(رض)، ابن عباس(رض) ، مسور بن مخزومہ (رض)، ابوالحسین ہاشمی مدنی رض) ، ابن عمر(رض) اور امہات المومنین حضرت عائشہ (رض) اور اُم سلمہ (رض) شامل تھے ۔

زید بن اسلم ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ مسجد نبوی میں علمی درس دیا کرتے تھے۔ مروجہ علوم اور فقہ میں ان کو کامل دسترس حاصل تھی، زین العابدین (رض) ان کی علمی صحبت سے بھی مستفید ہوتے۔ ایک دن جابر بن نافع نے ان سے پوچھا، '' بڑی تعجب کی بات ہے آپ ایک سیّد زادے ہیں اور مخلوق میں افضل ترین شخصیت ہیں، آپ کو زیب نہیں دیتا کہ ایک غلام زادے کی محفل میں بیٹھیں۔'' علی بن حسین (رح) نے فرمایا، ''نافع! علم کے واسطے کوئی مقرر منزل نہیں ہے۔ اس لیے جس جگہ بھی اسے پاوء وہاں تک رسائی کی کوشش کرو۔ ''

تسلیم و رضا : زین العابدین (رح) بچپن سے انتہائی متوکل اور صابر انسان تھے۔ایک دفعہ بیمار تھے۔ اس حال میں امام حسین (رض) نے ان سے پوچھا ، ''بیٹا! تمہارے دل کو کونسی شے بھاتی ہے ؟ '' عرض کیا، '' میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی ان افراد میں شامل ہوجاوں جو اللہ تعالیٰ سے کسی بھی چیز کا مطالبہ نہ کریں بلکہ وہ ذات پاک ان کے لیے خود ہی تدبیریں فرمائے۔'' صبر و رضا کا یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جو فقط زین العابدین(رح) کے جد امجد اور امام الانبیاء حضرت ابراہیم (ع) کو حاصل تھا۔ جن کے الفاظ کو قرآن حکیم نے یوں نقل فرما یا ہے : '' میں اپنی نظر صرف اپنے اللہ تعالیٰ پر رکھتا ہوں، وہی میرے لیے کافی اور کارساز ہے۔ ''

حضرت زین العابدین کی شادی اپنے چچا امام حسن (رض) کی بیٹی بی بی فاطمہ سے ہوئی تھی۔ جوانی ہی میں کربلا کا المناک حادثہ پیش ہوا۔ زین العابدین (رح) اس واقعہ میں

بچنے والے بچوں میں سب سے بڑے او نوجوان تھے۔ مدینہ واپسی پر اُم المومنین اُم سلمہ (رض) نے ان کو اپنے والد کی امانت، وصایا اور اسلحہ واپس کردیا۔ زین العابدین (رح) نے انہیں بیچا اور اپنے والد کا قرض جو ستر ہزار درہم بنتا تھا ادا کیا۔ یہ تھی اس جلیل القدر بزرگ کی حضرت حسین کی شہادت کے وقت مالی حالت۔ جن کے بارے میں معترضین کا کہنا ہے کہ حکمران طبقے کے عطیات اور انعامات نے ان کو مالِ دنیا اور غمِ روزگار سے فارغ اور بے نیاز کردیا تھا۔

ذرائع آمدن :- اب سوال یہ ہے کہ امام صاحب کی آمدن کے ذرائع کیا تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ زین العابدین (رح) ایک کثیر آمدن کے مالک تھے۔ اُن کی آمدن کے ذرائع درج ذیل ہیں:-

۱۔ اپنے والد محترم سے اُن کو وراثت میں زمین ملی تھی۔

۲۔ خلفاۓ راشدین کے زمانے میں اُن کو مالِ غنیمت سے باقاعدہ حصّہ ملتا تھا۔ جسے شریعت میں ‘خمس’ کہتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) نے اپنے خلافت کے زمانے میں اس کا دوبارہ اجراء کیا۔

۳۔ زمینی پیداواری آمدن کے ساتھ زمینوں کو سیراب کرنے والے چشموں کے پانی کی آمدن۔

۴۔ تجارت ۔ نجد او حجاز کی پیداوار اونٹوں پر لاد کر شام برائے فروخت لے جاتے اور اس کے بدلے شام سے غلہ اور میوہ جات حجاز لاتے۔

مشاغل:۔ علی بن حسین (رح) نے اپنی ساری زندگی خدائے ذوالجلال کی عبادت میں گذاری اور نمازوں اور روزوں میں مصروف ایک زاہدانہ زندگی گذارتے تھے۔ لیکن علمی مشاغل میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے ساتھ علمی مجالس میں شرکت فرماتے۔ ان مجالس میں فقہ اور قیاس پر گرما گرم بحثیں ہوتیں ۔ یہ باتیں مکمل آزادی اور شخصی امتیاز سے بالاتر فضا میں منعقد ہوتیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں علم سے بڑھ کر کوئی شے نہ تھی۔ تاریخ الیعقوبی نے سعد بن المسیب، جو اپنے وقت کے ایک زاہد عالم، بلا کے ذہین اور عقل مند شخص تھے، کا ایک قول نقل کیا ہےکہ ''میں نے ساری عمرعلی بن حسین (رح) سے افضل ترین انسان نہیں دیکھا۔ میں جب بھی انہیں دیکھتا ہوں تو خود پر حقارت کی نظر ڈالتا ہوں۔ یہ وہ ہستی ہیں جن سے کسی مسلمان کو ناواقف نہیں ہونا چاہیے۔ ''

زین العابدین (رح) سے مدینے میں اس وقت کی ایک عظیم فقیہہ سعید المسیب فقے اور استفتاء میں استفادہ فرماتے۔ ایک دفعہ حدیث اور روایت کے امام محمد بن مسلم عبیداللہ بن شہاب الزہری کے ہاتھوں سے ایک اپنا غلام مارا گیا۔ غلام اُن کی ملکیت تھا۔ اس لیے دیت کا مسئلہ پیش آیا۔ اور توبے اور کفارے کی ایک بھی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ الزہری مدینہ منورہ کے سارے بڑے فقہاء ابو عبدالرحمان،

عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد بن ابوبکر اور سالم بن عبداللہ بن عمر سے فتوے مانگنے گئے۔ لیکن ان کے جوابات سے زہری کی تسلی نہ ہوئی، آخر زین العابدین (رح) کے پاس گئے۔ انھوں نے یہ فتویٰ دیا، ‘‘ تم ایک مسلمان غلام آزاد کردو یا دو مہینے مسلسل روزے رکھو۔’’ اس موقع پر زہری نے فرمایا، ‘‘میں نے زین العابدین (رح) سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا۔’’

برداشت، عفو اور درگزر:۔ حسین بن حسن فرماتے ہیں کہ میرے اور زین العابدین (رح) کے درمیان کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔ میں مسجد نبوی میں ان کے پاس گیا۔ میں بہت زیادہ غُصے میں تھا۔ ان کو کافی بُرا بھلا کہا۔ زین العابدین بڑی خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔ میں واپس گھر آیا۔ رات کا وقت تھا۔ کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زین العابدین (رح) کھڑے ہیں۔ خیال آیا کہ وہ بھی بدلے میں مجھے سخت بُرا بھلا کہیں گے۔ لیکن انھوں نے فرمایا۔ ‘‘بھائی صاحب! آپ نے جو کچھ کہا اگر وہ سچ ہے تو اللہ پاک میرے گناہوں کو معاف فرمائے ۔ اور اگر آپ سچے نہیں ہیں تو خداوند پاک آپ کو اپکے گناہ بخش دے۔’’

مجھے بے حد افسوس ہوا اور روتے روتے ان سے معافی مانگی۔ اور عرض کیا کہ صاحب! جوکچھ بھی میں نے کہا ہے وہ غُصے میں میری زبان سے نکلا ہے۔ فرمایا جو بھی تم نے کہا وہ میں تیرے لیے حلال ٹھراتا ہوں ۔

ایک اور موقع پر ایک شخص نے ان کی شان میں سخت گستاخی کی، اور ان کے بارے میں بُری باتیں کیں۔ امام صاحب کے نوکر اور غلام اُس کے مارنے لیے اُٹھے، علی بن حسین (رح) اپنے نوکروں پر غصّہ ہوے اور فرمایا خبردار اگر تم نے اس شخص کو ہاتھ لگایا۔ وہ اپنے ارادے سے باز آے۔ زین العابدین (رح) نے اُس شخص کو اپنی ایک چادر اور ایک ہزار درہم عنایت کیے۔ وہ اپنے غلاموں کے بارے میں بھی کافی عفو و رحم سے کام لیتے تھے اور بعد میں ان کو آزاد کردیتے۔ ایسے کافی واقعات تاریخ میں مرقوم ہیں۔

شانِ استغناء :۔ خلیفه مالک بن مروان خانه کعبہ کا طواف کر رھا تھا۔ زین العابدین کو بھی طواف کرتے دیکھا۔ زین العابدین (رح) نے خلیفه کو کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پوری خشوع و خضوع کے ساتھ طواف میں مشغول تھے۔ عبدالمالک نے حکم دیا کہ زین العابدین (رح) کو میری خدمت میں پیش کیا جاے۔ وہ تشریف لاے تو عبدالمالک نے ان سے کہا۔ “ تمھارے باپ کو میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے نہیں ملتے؟” زین العابدین نے فرمایا۔ “میرے باپ کے قاتل نے ہماری دنیا برباد کردی۔ اور میرے والد نے اپنی عبادت سے اس کی آخرت تباہ کردی۔ اگر تم بھی چاہتے ہو تو اپنی خواہش پوری کر لو”۔

عبدالمالک نے کہا۔ ‘‘نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعلق رکھیں۔ تمھیں اگر کوئی شے چاہیے تو ہم آپ کی ہر ضرورت پوری کردیں گے۔ زین العابدین (رح) نے فرمایا۔ ‘‘میں بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔’’ اس جواب سے عبدالمالک زیادہ غُصے سے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا گیا۔ لیکن زین العابدین (رح) نے کوئی پرواہ نہ کی اور خانہ کعبہ کے ساتھ لپٹ گئے اور یہ دُعا مانگی، ‘‘ یا الٰہی! دنیا کے بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کردیے اور اُن پر چوکیدار اور پہریدار کھڑے کر دیے لیکن تیرا دروازہ ہر کسی کے لیے کھلا ہے، میں حاضر ہوا ہوں تاکہ تیرے رحم کی نظرمجھ پر پڑے۔ عبدالمالک نے ہشام مخرومی کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا اس نے مدینہ کے لوگوں اور وہاں کے گوشہ نشینوں کو بهت تکلیفیں دیں۔ خصوصاً زین العابدین (رح) اور ان کے اہل بیت کو برملا مسجد نبوی میں بُرا بھلا کہتا اور قسما قسم تکلیفیں دیتا۔ زین العابدین(رح) فرماتے۔ ‘‘مخرومی جو بھی کرنا چاہتا ہے، کر لے، اس کی تباہی اور بربادی کے دن قریب ہیں۔ ’’

جنابِ زین العابدینؒ کے ساتھ عام لوگوں کی محبت اور عقیدت:

ہشام بن عبدالمالک اپنی ولی عہدی کے وقت حج کے لیے آیا۔ پہریداروں اور خادموں کا ایک لشکر ساتھ تھا۔ ہشام حجر اسود تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن لوگوں کا ہجوم راستے میں حائل تھا۔ کچھ ساعت بعد زین العابدین (رح) پہنچے۔ ہجومِ خلق قطاروں میں بٹ گیا۔ لوگ تھے جو اس

مبارک ہستی کے لیےخود راستہ دے رہے تھےکہ وہ حجرِ اسود کو بوسہ دیں۔ ہشام سے کسی نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ ہشام نے قصداً خود کو بے خبر ظاہر کیا کہ وہ ان کو نہیں پہچانتا ۔ اس موقع پر ابو فراس فرزوق شاعر نے کہا،

‘‘یہ وہ ہستی ہے۔ جس کے قدموں سے بطحاء کی زمین آشنا ہے۔ بیت اللہ بھی اس سے واقف ہےاور حرم پاک بھی۔ ’’ فرزوق شاعر کو بعد میں ہشام نے پکڑ کر زندان میں بند کردیا۔ ہشام جب دمشق پہنچا تو باپ کو سارے واقعات بیان کردیے۔ اور زین العابدین (رح) کے عظمت اور جلال کا ذکر اس انداز میں کیا کہ عبدالمالک کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ مبادہ زین العابدین (رح) خلافت کے مدعی نہ بن جائیں۔ مدینہ کے حاکم کو حکم دیا کہ زین العابدین (رح) کو پا بہ جولان دمشق لایا جائے ۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ زین العابدین (رح) اس حال میں زنجیروں میں جکھڑے ہوئے دربار میں پہنچے کہ وہ عبادت اور دُعاوں میں مشغول تھے۔ محوّیت کا یہ حال تھا کہ گویا پاوں میں بیڑیاں ہیں اور نہ ہی ہاتھوں اور گردن میں بیڑیاں اور ہتکڑیاں ۔ عبدالمالک پر ہیبت طاری ہوگئی ۔ محمد بن مسلم زہری کے مشورے پر عبدالمالک نے اُنہیں احترام اور عزت کے ساتھ مدینہ واپس بھیج دیا۔

سر کے دشمن سے انتقام نہ لینا؛   ولید بن عبدالمالک جب تخت نشین ہوا تو اس کی خواہش تھی کہ مد ینۃ الرسول کے لوگوں کو راضی کر لے۔ تو ہشام نے مخزومی کی جگہ عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔ ہشام کے بارے میں یہ حکم صادر کیا کہ اسے

چوراہے کے درمیان کھڑا کیا جاے ۔ ہر وہ شخص جسے اس کے ہاتھوں سے آزار پہنچا ہو، آگے آےء اور اس سے اپنا بدلہ لے۔ ہر کسی نے اپنا بدلہ لیا۔ ہشام کو سب سے زیادہ خطرہ زین العابدین (رح) تھا کہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔ لیکن جونہی زین العابدین (رح) تشریف لے آےء تو ہشام سے ہاتھ ملایا۔ اُسے پیٹھ پر تپھکی دی ۔ ہشام رو پڑا۔ زین العابدین (رح) نے فرمایا، ‘‘اگر تمہیں کسی چیز کی حاجت ہو تو بتاوء تاکہ میں اسے پورا کردوں۔ اگر تم پر کوئی سرکاری قرضہ ہو تو میں اُسے ادا کردوں۔ ’’ ہشام نے جب یہ سُنا تو زور زور سے رونے لگا اور کہا، ‘‘خداوند پاک ان بہترین لوگوں کو خوب جانتا ہے جن کو وہ پاک ذات پیغمبری کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ’’

رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نسبت پر نہیں ہے۔ مشہور محدث اور عابد ‘‘طاوءس’’نے ایک دفعہ اُن کو روتے اور بڑی زاری سے دُعا مانگتےدیکھا۔ تو آگے بڑھے اور عرض کیا ۔ ‘‘ اے صاحبزادة الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ میں آپ کو کس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ اگرچہ حال یہ ہے کہ آپ میں تین صفات قابل رشک ہیں۔ اور اُمید ہے کہ ان کے ذریعے آپ کو آخرت میں خطرہ پیش نہیں آےء گا۔ زین العابدین (رح) نے ان سے پوچھا ۔ ‘‘وہ کون سے اوصاف ہیں؟ ’’

طاوء س نے عرض کیا ۔ ‘‘ اول یہ کہ آپ رسول اللہ (ﷺ) کی اولاد سے ہیں۔ دوم یہ کہ قیامت کے روز آپ کو اپنے نانا (ﷺ) کی شفاعت حاصل ہوگی۔ سویم یہ کہ خداوند پاک کی رحمت آپ کے ساتھ ہوگی۔’’ زین العابدین نے فرمایا۔ ‘‘

اے طاوس! رسول اللہ (ﷺ) کی اولاد میں سے ہونا آخرت کے اطمینان کے لیے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن ایک دوسرے کا نسب ختم ہوجائے گا۔ رسول اللہ (ﷺ) کی شفاعت کے بارے میں ان کا اعلان ہے کہ انبیاء صرف اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے ، جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معاملہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ ہے کہ اس کی رحمت بھی صرف نیکو کار لوگوں کے قریب ہوگی۔ ” طاوس یہ فوری جواب سُن کر دنگ رہ گیا۔

غنا اور سخاوت : حضرت زین العابدین (رح) انتہائی مخیر بزرگ تھے، صدقات، خیرات، عطیات اور بخشش کے ذریعے سے ضعیفوں، بیماروں، محتاجوں اور دوستوں کی ہر قسم کی مدد فرماتے۔ صحابہ کرام، مہاجرین اور انصار کی اولاد کو خصوصیت کے ساتھ یاد رکھتے۔ کیونکہ یہ لوگ اسلام میں سب سے آگے تھے۔

ایک دفعہ محمد بن اسامہ بن زید شدید بیمار پڑ گئے۔ وہ فوراً ان کي عيادت کے لیے تشریف لے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا آخری وقت ہے اور رو رہے ہیں۔ معلوم ہواکہ ان پر قرضہ ہے۔ اور ان کے گھروالوں کا ہاتھ تنگ ہے۔ اب اگر وہ واصلِ حق ہوے توان کا قرضہ کون ادا کرکے ان کی گردن چھڑاےء گا۔ زین العابدین (رح) نے ان سے پوچھا۔ قرضہ کتنا ہے؟ فرمایا پندرہ ہزار دینار۔ علی (رح) نے فرمایا۔ “ ابن اُسامہ! کوئی فکر نہ کرو۔ تمھارا قرضہ میں ادا کرونگا۔ اُمید ہےاب تمھیں آرام مل جاے گا۔ ”

عظمتِ صحابہ کرام: ایک دن رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کو بُرا کہنے والے لوگوں کو اپنی محفل سے دور بھگا دیا۔ اس کے بعد کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ آپ کے سامنے اصحابِ رسول ﷺ کی شان میں گستاخانہ بات اپنے منّہ سے نکال سکیں ۔

خشوع و خضوع: عبادات میں اس درجہ اخلاص اور استغراق سے کام لیتے کہ ایک بار نماز میں مشغول تھے کہ زلزلہ آیا اور چلا گیا۔ لیکن وہ اس سے متاثر نہ ہوےٴ ۔ اور نہ ہی اس کو محسوس کیا۔ اسی طرح ایک دفعہ نماز ادا فرما رہے تھے کہ گھر میں آگ لگ گئی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ گھروالوں نے چیخ چیخ کر ان کو باہر آنے کی صدائیں دیں۔ لیکن انھوں نے سجدے سے سر نہ اُٹھایا اور پورے اطمینان اور تسلی کے ساتھ نماز پوری کی۔ بعد میں گھر والوں نے اس کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا: ''ایک دوسری آگ کے خیال نے مجھے اس طرف سے غافل کردیا۔''

بنواُمیہ کی فوج کے لیے دُعائیں: دین اسلام کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر اموی فوج کی فتح اور نُصرت کے لیے دُعائیں مانگتے، کسی نے ان سے کہا، ''آپ بنو اُمیہ کی فوج کے لیے دُعا گو ہیں؟۔'' فرمایا، ''خدایا! اُن میں سے جو غازی بھی آپ کی ملت میں ہے، اور سُنت کی پیروی کرتا ہے کہ آپ کا دین مضبوط اور آپ کا گروہ مضبوط ترین ہو، تو ان کے لیے اس کام کو آسان بنا دے۔ ان کے سارے اعمال میں خیروبرکت ڈال اور

انھیں فتح یاب فرما۔ ان کو خیر و عافیت سے واپس لا۔ اور امن و عافیت کو ان کا ساتھی بنا۔

سرتاج سلاسل طریقت اولیاء و صوفیاء : یہ ایک بیّن تاریخی حقیقت ہے کہ دُنیا میں اسلام شمشیر کے ذریعے کم اور صوفیاء اور اولیاے کرام کے جہاد اکبر یعنی نفس کی خواہشات کو دینِ برحق پر قربان کرنے، اعمالِ صالحہ اور کردارِ عالیہ کے توسط سے زیادہ پھیلا۔ اور تمام سلاسل طریقت سواےء نقشبندیہ امام زین العابدین (رح) کے واسطے سے شیر خداعلی المرتضیٰ سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ نقشبندیہ طریقہ عالیہ میں امام جعفر صادق (رح) ایک روشن ستارے کی مانند جھلملاتے ہیں جو زین العابدین (رح) کے پوتے تھے۔ جبکہ یہی سلسلہ عالیہ بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو امام الاولیاء گردانتی ہے۔

اولین مجدد اسلام: مورخ اسلام ابوالحسن حسینی ندوی (رح) المعروف علی میاں (1916- 1999ء) نے اپنی ایک کتاب ‘‘تاریخ عزیمت و تجدید دین’’ میں امام زین العابدین (رح) کو اولین صدی هجری کا مجددِ اعظم لکھا ہے۔ جنہوں نے ایک دور آشوب اور سیاہ رات میں شمع اسلام کو بُجھنے نہیں دیا اور صحیح نقوش دین اسلام کو سلامت رکھا۔

فانوس وہ ہے جس کی حفاظت ہوا کرے

وہ شمع کب بُجھے گی جسے روشن خدا کرے

وفات: زین العابدینؒ اٹھاون (58) برس کی عُمر میں **94** هجری میں فوت ہوے۔ اُن کی وفات کے بعد جب ان کی میّت کو غُسل دیا جا رہا تھا۔ تو اُن کے لواحقین کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی پیٹھ مبارک پر نیلے نیلے چھالوں کے نشانات ہیں۔ وہ حیران ہوے کہ ان کا سبب کیا ہے؟ کیونکہ حضرت زین العابدین (رح) کسی قسم کی مزدوری بھی نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ مدینہ میں سو **(100)** ایسے گھرانے تھے جن کے لیے ایک نامعلوم شخص رات کے وقت غلے کی بوری پیٹھ پر لاد کر لاتا تھا۔ مزید تفتیش سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ زین العابدین (رح) تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد نے ہمیشہ سرفروشی، اسلام کے لیے قربانی اور جان نثاری کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ہر میدان میں ان پاک طینت افراد نے کلمہ حق کا برملا اعلان کیا ہے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ ٰ(رح) نے لکھا ہے، ‘‘سادات کا احترام اس وجہ سے بھی فرض ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اسلام کے مقدس دین پر سخت متُعصب اور مُصر قائم رہے ہیں۔ ’’

کُتب حوالہ جات :

۱۔ امام زین العابدین علی بن امام حسین (رض) از عبدالعزیز سید الاہل

۲۔ عزت رسول (ص) از فیض عالم صدیقی

۳۔ خلافتِ معاویہ (رض) و یزید از محمود احمد عباسی

۴۔ تاریخ عزیمت و تجدید احیاے دین از مولانا سیّد ابوالحسن حسینی ندوی (رح)

۵۔ شجرہ جات سلاسلِ طریقت

٦۔ ژوندی خطونہ (زندہ خطوط) ۔ امیر حمزہ شنواری

انصاف پسند ادیب ۔ ایوب صابر

(تاریخ وفات 8 فروری 1989 ء)

آدمی آدمی سے ملتا ہے

دل بہت کم کسی سے ملتا ہے

ایوب صابر نے نظم بھی لکھی اور نثر بھی۔ نقاد بھی تھے اور صحافی بھی۔ کالم نگار بھی تھے اور تبصرہ نگار بھی۔ لیکن وہ شاعر اور ادیب کس زبان کے تھے، پشتو یا اُردو کے؟ اس لحاظ سے وۃ اُردو کے گرو نانک تھے۔ اُن کے بارے میں پشتو کے ادیب کہتے تھے کہ ایوب صابر کا شمار سرحد کے اردو ادیبوں کے زُمرے میں ہوتا ہے۔ جبکہ اُردو دان اُنکو پشتو ادب کے حوالے سے جانتے تھے۔ یہ غلط تاثر درجہ دوئم میں شامل ادیبوں کا معاصرانہ رقابت کے تحت پیدا کردہ ہے۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ایوب صابر کا قلم اُردو اور پشتو دونوں میں یکساں کروفر اور شائستگی سے رواں اور دواں تھا۔

ایوب صابر کی شخصیت کا دوسرا بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ بے حد مخلص اور حساس لکھاری تھے۔ مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ اور بات صاف صاف بہ بانگِ دُھل واشگاف انداز میں کرتے تھے۔ زیرِ لب اور پسِ پردہ کسی کی غیبت نہیں

کرتے تھے۔ بعض لوگوں کی اُن سے یہ شکایت تھی کہ وہ دوستوں کی مدح ضرورت سے زیادہ کرتے تھے اور اپنی ہر تحریر میں اُن کا ذکر دوستی کا فرض سمجھتے ہوئے خامخواہ کرتے تھے۔ یہ دوست ادیب پھر اُن کے اعصاب پر سوار ہوجاتے تھے۔ جبکہ دوستوں کا یہ حال تھا کہ وہ اُن کی سچی تعریف میں بھی بُخل سے کام لیتے تھے۔ ایوب صابر کی ادبی صلاحیتوں اور کمالات کا تذکرہ میں نے ایسے باکمال مشاہیر سے بھی سُنا ہے جنکی عظمت کا اعتراف کرنے میں ایوب صابر صاحب کی نظر التفات اور تجاھلِ عارفانہ کے شکار ایک فاضل اُن کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

''ایوب صابر پشتو اور اُردو دونوں پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ پشتو میں معرا نظم کے اولین موسس ہیں۔

غصہ ناک ہیں لیکن ساتھ ہی انصاف پسند بھی ہیں ۔ ہمارے علاقے کے ایک مرحوم عالم ادیب کا قول ہے کہ '' ایوب صابر جامع الصفات ادیب اور باکمال دانشور ہیں۔ لیکن غریبی نے ان کی صلاحیتوں کو زیادہ اُجاگر ہونے نہیں دیا۔ ساتھ ہی ان کے دوست ادیبوں نے ان کو اتنا پروجیکٹ نہیں کیا جتنا کہ ان کا حق بنتا ہے ۔'' البتہ ''نایاب'' کے مُدیر جناب احمد پراچہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایوب صابر کی وفات کے بعد اس نیک کام کا بیڑہ اُٹھایا اور ممدوح کے مداحوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ فاضل ادیب کے ادبی کارناموں کو مشتہر بھی کریں اور ان کو تحفظ بھی دیں۔ اگرچہ ایوب صابر کی جاندار تحریریں اس معیار اور وزن کی ہیں کہ اُن کے ذکر

کے بغیر ملک کی ہر ادبی تاریخ اور تذکرہ نامکمل ہوگا۔ اور اُن کا ایک مقام تھا جسے مستقبل کا مؤرخ کبھی بھی نظرانداز نہ کر سکے گا۔ اور جہاں تک اُن کی شخصیت کا تعلق تھا تو ایک درویش صفت خوددار انسان تھے۔ جن کو نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پرواہ۔

جدید پشتو ادب میں آزاد نظم کو رواج دینے کے سلسلے میں کئی شعراء کے نام سامنے آتے ہیں۔ لیکن تین نام ایسے ہیں جنھوں نے حقیقت میں اس صنفِ سخن کے ذریعے پشتو ادب کو بہت کچھ دیا۔ غنی خان نے اس ہئیت کا استعمال کرکے پشتو اسلوب میں رنگ و نور کی بارش کردی اور اچھوتے اور سراسر نئے خیالات پیش کیے۔ ہاشم بابر نے تجریدی فکر اور تمثیلی فن کے تجربے کیے۔ لیکن ان سب میں صرف ایوب صابر کی شاعری آزاد نظم کے معیار پر فن اور مقصدیت کے لحاظ سے پوری اُترتی ہے۔ عزت و فضیلت کا یہ شرف ایوب صابر کو نہ بخشنا سراسر بے انصافی اور پشتو کی ادبی تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔

میں ایوب صابر مرحوم کی شخصیت اور فن پر کوئی لمبا چوڑا مضمون یا مقالہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھ ہیچ مدانی سے زیادہ اہل حضرات نے ''نایاب'' کے اوراق میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس نڈر، بیباک اور قلم کے دھنی مجاهد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ لیکن میں موصوف مرحوم کی ان اوصاف جمیلہ اور اخلاقِ حمیدہ کا ذکر بطورِ خاص کرونگا۔ جن سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ وہ ایک علم دوست، حق گو، مهمان نواز

اور سماجی اونچ نیچ سے انتہائی بیزار شخصیت تھے۔ اگر کسی شخص نے صرف ایک اچھی سطر لکھ کر یا ایک آدھ مصرع کہہ کر ادب کی خدمت کی ہے تو ایوب صابر نے اس کو ایک ادیب بھائی اور قلم قبیلے کا ایک فرد جان کر اس کی قدر اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ چاہے وہ کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ غرض وہ ادب نواز ہونے کے ساتھ ایک انتہائی مخلص اور مشفق ادیب نواز بزرگ تھے۔ اور پھر اس تعلق اور دوستی کی لاج رکھنا اور اسکی ریت نبھانا تو کوئی اُن ہی سے سیکھتا۔ آج تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔

” اے تُو مجموعۂ خوبی

تُو را بہ چہ نامت خوانیم ‘

کس نام سے پکاروں کیا نام ہے تمہارا؟

(ڈاکٹر فصیح الدین اشرف سلیمانی ۔۔ شخصیت اور فن)

بال سارترے کا قول ہے " ہم دانشور ایک پتھر کی جیومیٹری میں الجھ جاتے ہیں ۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تاریخ پتھر پیسنے والی مشین ہے ۔ راہنما وہ ہوتا ہے جو تاریخ کے اس عمل کا ادراک رکھتے ہوے اپنے لوگوں کو آگے لے جائے ۔ "

فصیح بھائے ایسے ہی ایک بے شمار صلاحیتوں کے مالک شخصیت ہیں۔ ایک وضع دار پولیس افسر،

معروف دانشور، محقق، مؤرخ، شاعر اور ادیب، اردو کی تین کتابوں خامہ بہ جوش (جلد اول) ، صحرا میں آذان (جلد دوم) ، سفر کی دہول او "د جنون چپے" (پشتو شاعری) کے مصنف ہیں ۔ اس بے باک کالم نگار نے ایک پوری ذاتی عمارت ریسرچ لائبریری کے نام سے علم و تحقیق او اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے سرگردان طالب علموں کی مدد اور راہنمایئ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ جس سے بزرگ جویان علم و دانش بھی فائدہ حاصل کرسکتے ہیں ۔ جرمیات (کریمینالوجی) کے بارے میں ایک علمی رسالہ بھی نکالتے ہیں ۔ اس غرض سے جاپان سے امریکہ و کینیڈا تک ممالک کی سیر کرچکے ہیں اور وہاں کے ماہرین دانشوروں سے ملاقاتیں ۔ مجالس اور مذاکروں سے خطاب کرتے رہے ہیں ۔ ایسے حساس موقعوں پر وہ وطن عزیز کی سلامتی امور اور تقاضا ہائے حب الوطنی کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔ سال دو ہوے ہیں کہ "خپلواک" کے نام سے اردو اور پشتو کا ایک اخبار بھی شائع کر رہے ہیں ۔ قدرت نے ان کارہائے نیک سر انجام دینے کے لیے ایک قابل، ذہین او انتہاہئ پڑھی لکھی رفیقۂ حیات عنایت کی ہے جو ان کی قدرتی استعداد اور صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں کافی ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں ۔ اس طرح ان کو گھر پر ہی ایک ذہین نقاد او ر معاون مل گیا ہے ۔

اس مضمون اور تبصرے کو ایک مناسب عنوان دیتے وقت میرے ذہن میں کئ نام آئے جیسے A Myriad Man یعنی "بیشمار صلاحیتوں کا مالک" ، یہ نام گاندھی جی نے ٹیگور کے لیے استعمال کیا تھا ۔ اس ہیچ مدان نے ایک دفعہ محترم قلندر مومند کو اس لقب سے پکارا تھا ۔ اب تیسری بار کسی کو اس نام سے نوازنا تکرار او تقلید کے زمرے میں آتا محسوس ہوا ۔

۲ ۔ غامدی ثانی: غامدی صاحب اور فصیح بھایئ کی زندگیوں میں کافی علمی منازل اور اقدار مشترک ہیں ۔ لیکن خود غامدی صاحب کو اپنے نام کیساتھ یہ لاحقہ لگانے اور سمجھنے میں کافی تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ عربوں کی تاریخ جہالیت اور کئ لغتوں کو چھاننا پڑا ۔ آخر اقربالموارد کی ورق گردانی کے وقت "غامد" کا لفظ ان کی نظروں سے گذرا ۔ یعنی بمعنی "مصلح" ۔ میں اپنے قارئین کو سردردی کے ان منازل سے نہیں گذارنا چاہتا ۔ ویسے ہمارے ممدوح کا نام پہلے ہی خاصا علمی ، معنی خیز اور با نسبتی ہے یعنی "ڈاکٹر فصیح الدین اشرف سلمانی (پولیس سروس آف پاکستان)

۳ ۔ کلاسرا روہی: خبر ہے کہ سعودی حکمران نے پہلی ملاقات میں ہمارے موجودہ وزیراعظم کو یوں مخاطب کیا " اپنا کلاسر ا ؟ " یوں تو کلاسر پنجاب کے ضلع لیہ میں آباد ایک گاوءں اور قبیلے کا نام ہے ۔ ٹیلی ویژن کے ایک نامی گرامی سیاسی امور

کے تجزیہ نگار رؤف صاحب کیساتھ بھی یہ لاحقہ لگا ہوا ہے۔ دوستوں سے اس کا مطلب پوچھا اور لغتیں کنگالیں۔ لیکن کوشش بسیار او استفسار کے بعد ایک اخباری تراشے سے یہ اشارہ ملا کہ یہ صاحب قدیم جنوبی پنجاب کے ارسطوئے وقت تھے (واللہ اعلم بالصواب) ۔

۴ ۔ علامہ افغانی : ایک وقت تھا کہ ہمارے ملک میں صرف دو چار شخصیات "علامہ" شمار ہوتے تھے یعنی علامہ اقبال، علامہ مشرقی اور علامہ شمس الحق افغانی۔ لیکن آج تو علامہ کا سابقہ خیر سے عام ہوگیا ہے ۔ لہذا یہ ایک حد تک اپنی اہمیت کھو چکا ہے اس لیے ہم اس سے بھی گریز کرتے ہیں ۔

۵ ۔ عبقری ذہن: یہ نام بھی ممدوح کے ساتھ جچتا ہے ۔ لیکن بہ قول شورش کاشمیری ہندوستان میں دو ہی عبقری ذہن گذرے ہیں۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال اور امام الہند ابوالکلام آزاد۔ ان دو کے بعد یہ سرزمین عبقری اذہان جنم دینے سے بانجھ ہو گیئ ہے ۔

٦۔ سُپر مین اِن افغانز: اسٹر اسبرگ یونیورسٹی (فرانس) کے ۲۵ اسلامک سٹڈیز سنٹرز کے دانشوروں نے مل کر "مغز متفکراسلام" امام جعفر صادق کا اصل مسودہ تیار کیا ہے۔ اب اگر راقم الحروف اپنے ممدوح کو "سُپر مین ان افغانز" کا لقب دے تو امام

صاحب کے انسانی، روحانی اور عملی مرتبے کے پیش نظر اس سے کہیں ان کی شان میں گستاخی نہ سمجھا جا ےء ۔ لہذا اس خیال سے بھی رجوع کرتا ہوں ۔

۷۔ جِنی ادیب: ہمارے اسلامیہ کالج پشاور کے اسلامیات کے ڈین قاضی نورالحق صاحب فرماتے تھے کہ مولانا مودودی صاحب نے ِجن پال رکھے ہیں ۔ اب اگر جِنی پیر ہوسکتا ہے جو عالم ناسوت کے جِنوں کو اس طرح قابو کرلیتا ہے کہ وہ ان کے لیے مطلوبہ غیر موسمی پھل وغیرہ لا سکتا ہے تو ادیبوں میں بھی ایسے متصرفین ہو سکتے ہیں۔ موصوف خود بھی تکوینی امور کے مجذوبوں، متصرفین او رجال الغیب سے ملاقاتوں کا ذکر برملا کرتے ہیں ۔ اب اگر ہم فصیح صاحب کی ساری تصنیفات غور سے پڑھیں او انکی من جملہ ساری مصروفیات اور کارکردگیوں پر نظر ڈالیں تو ایک مصرعہ ان کی شخصیت اور فنی بوقلمونیوں کا یہ خوبصورت عنوان اپنے اندر مکمل طور پر سمو دیتا ہے۔

" اے مجموعہ خوبی ترا بہ چہ نامت خوانم "

علم اور عالم : ایک دفعہ میں نے مرحوم روشن خان سے علم او عالم کی تعریف پوچھی تو انھوں نے اس بارے میں میرا سارا نظریہ بدل دیا ۔ فرمایا " علم صرف پڑھنے لکھنے کا نام نہیں ہے، صرف مدرسہ

آنے جانے او طوطے کی طرح چند باتیں رٹ لینے کا نام نہیں ہے ۔ بلکہ خبر، مشاہدے، شوق او مسلسل تجسس کے زور پر ذات، قوم او جھان شناسی کا کام علم ہے ۔ اور ان معیارات پر پورا اتر جانے والی شخصیت کو عالم کہتے ہیں ۔ واضح رہے کہ مرحوم روشن خان کاکا اپنے چند مخالفین کی نظر میں بہ باعث تعصب اور تنگ نظری کے چندان پڑھے لکھے نہ تھے اور صرف دولت کے سہارے نام و ناموس کی خاطر بابائے صحافت سرحد مرحوم اللہ بخش یوسفی اور رئیس المحققین محترم عبدالحلیم اثرکے ہاتھوں کتابیں لکھواکر اپنے خرچ پرچھاپ دیتے تھے ۔

غائبانہ تعلق میں روزنامہ "آج" میں اپنے ایک مخلص، محب الوطن اور انسان دوست ادیب ظہور احمد مرحوم کے ایک کالم "دل پشاوری" کو بڑے شوق اور توجہ سے پڑھتا تھا ۔ میں سکاٹ لینڈ میں تھا کہ ان کی وفات حسرتناک کی خبر کی پٹی ٹی ۔ وی سکرین پر چلتی دیکھی ۔ بے حد افسوس ہوا لیکن وطن واپس آکر دیکھا کہ ایک نئے صاحب نے خامہ بہ جوش / صحرا آذان کے عنوان سے ایک پُرمغز اور تحقیقی کالم کی بنا رکھ دی ہے ۔ کالم کیا تھا۔

دیکھا تحریر کی لذت کہ جو اس نے لکھا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(شعر میں اپنے الفاظ ڈالنے پر معذرت خواہ ہوں)

پولیس کے ایک اعلی حاضر سروس افسر کے قلم سے ایسی جرأت رندانہ، بے خوفی اور روایت شکن تحریر نظام کہنہ و بوسیدہ کے خلاف بغاوت سمجھی جاتی ہے ۔وہ تو اکثر لکیر کے فقیر اور تھانے کے محرر کی خفیہ رپورٹ پر من و عن عمل کرنے والے لوگ ہوتے ہیں ۔اور مولانا ظفر علی خان کو جنگ آزادی کا ایک سرفروش سمجھنے کی بجائے سرکار وقت کا باغی اور جیل کو اپنا سُسرال سمجھنے والا عادی مجرم لکھ کر افسران بالا کو رپورٹ ارسال کرنے کے رسیا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ موصوف کے دیگر علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین نظر سے گزرے اور اپنی دو کتابیں حمایت علی شاعر کے اس شعر کے ساتھ روزنامہ "آج" کے پتے پر ان کو ہدیہ تبریک کے طور پر بھیج دیں۔

اس شہر خاموشاں میں کوئی تو اذان دے

ایسا نہ ہو کہ زمیں کا جواب آسمان دے

ویسے بھی بزرگوں سے سنا ہے کہ اگر کوئی صحرا، دشت یا ویرانے میں اپنا راستہ کھو دے تو تواتر کے ساتھ سات اذان بآواز بلند دے۔مسبب الاسباب کوئی رہب و راہنما پیدا کر دے گا۔اگر ایک علاقے میں بارش مہینوں نہ ہو اور مقامی آبادی قحط سالی کی وجہ سے مہاجرت پر مجبور ہو جائے تو ہمارے بزرگ مسجد میں سات اذانیں دیا کرتے تھے اور اللہ رب العزت تعداد پوری ہونے پر پہلے آسمان پر بادل لاکر زوروں کا مینہ برسانا شروع کردیتا تھا۔

لیجنڈری موسیقار تان سین راگ ملہار گاتا اور رب العزت اس کی لاج رکھ کر زوروں کی بارش برسا دیتا۔ لیکن آج بدقسمتی سے زمانے کے انداز بدل گئے۔ اب ساز بھی بدلنے پڑیں گے۔

اس شہر کے انداز عجب ہیں میرے یارو

گونگوں کو کہا جاتا ہے بہروں کو پکارو

مہینوں پتہ نہ چلا، موصوف نے شکریہ ادا کرنے کے لئے نہ تو فون کیا، نہ خط و پیام کا سہارا لیا۔ ہم سمجھے ہوگا ضرور کوئی اکڑخُو بیوروکریٹ، غلط برجان، خود پرست کالم نگار چھوڑو ویسے بھی۔

یہ دل مُیسر و موجود سے بہلتا نہیں

کوئی تو ہو جو میرے دسترس سے باہر ہو

لیکن دل ناتواں کو قرار کہاں! محکمہ پولیس کے چند دوستوں سے پوچھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس قسم کے باغی او سرپھرے شخص کا وجود ایمرجنسی سروسز کے مزاج اور قانون کے خلاف ہے۔ لیکن جب بھی ان کا یہ کالم چھپتا میری جستجو اور تفتیش کے لیے ممیز ثابت ہوتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ؛

ذرا اور ٹہر جا نقش تربت ڈھونڈنے والے

یہ میری بے نشانی کس کی غفلت کی نشانی ہے

آخر پشاور کے مرکزی پولیس افسر سے پوچھا تو ایک عزیز نے قہقہا لگا کر بتایا کہ"جی ہاں ہمارے

ہاں ایسا افسر پولیس رول پر ہے جو افسران بالا کی نظر میں اکثر معتوب و مغضوب ہوتا ہے لیکن شاعروں اور ادیبوں کے بے کار طبقے مِیں محبوب اور محمود ہے۔ مہینے دو میں ایک آدھ بار ہی دفتر میں نظر آجاتا ہے۔ بالکل آپ (خاکسار راقم الحروف) کی طرح کتابوں کا رسیا۔ دل خوش ہوا کہ محکمہ صحت کی طرح محکمہ پولیس میں بھی ہمچو منے کوئی مس فٹ نکلا ۔ یہ اس خاکے کا سرنامہ تھا جو مشہور نوجوان اردو اور پشتو ادیب حنیف خلیل نے اس ہمچنان کے بارے میں اپنے ایک نوشتہ خاکے کو دے کر افغانستان کے ایک پشتو رسالے کے لیے لکھا تھا اور ستم ظریف افغان ایڈیٹر نے اپنی عادت کے مطابق اسے مشرف بہ خالص پشتو کرنے کی کوشش میں "بے ځایہ" لکھ دیا جس کا سیدھا سادہ ترجمہ ہوا "ناکارہ"

ایک دن کوئٹہ سے فون آیا تو پتہ چلا کہ جنھیں میں آسمان میں ڈھونڈ رہا تھا وَہ تو اس زمین کا باسی ہے اور ہمارے عزیز دوست "نبض شناس امراض بلوچستان اور وہاں کی محرومیوں کے ترجمان" محترم آغا گل کے دفتر سے برآمد ہوا کہ اب بنی بات انشا ء اللہ :

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

تاثرات اور موازنہ: آج جب موصوف کے تین اردو کالموں کے مجموعے انتہائی شوق اور انہماک سے پڑھے تو اکثر جگہوں پر ایسا محسوس ہوا کہ

یہ تو وھی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

کچھ تحریروں کے ذریعے شخصیات او افکار سے متعارف ہوا ۔ ان کا ایک کالم "بلوچستان کا قلندر" بے باک حاوی اعظم فوری اثر دکھا گیا ۔ ہمدم دیرینہ سرور سودائی کا فون نمبر ملایا اور درخواست کی کہ ان صاحب کی جتنی کتابیں دستیاب ہوں ۔ پہلی فرصت میں ارسال کردیں ۔ ان کی کرم نوازی کی بدولت چند دنوں بعد حاوی اعظم کی کتابوں کا پارسل موصول ہوا ۔ ایک ایک کرکے تاریخ و ادب پر ان کی تصنیفات پڑھیں اور یونیورسٹی دور کے اپنے روم میٹ ترتری بیگ یاد آگئے۔ (ان کی شخصیت کے بارے میں میں نے ان کا ایک کرداری افسانہ لکھا ہے) ۔ یہ صاحب جرمن ڈکٹیٹر ایڈولوف ہٹلر کے انتہائی مداح تھے ۔ اپنے کمرے کے دروازے پر نازی نشان"سواستیکا" نمایاں طور پر کندہ کر رکھا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ اندر آتے ہی سامنے دیوارپر مُکہ مار کر فرماتے "تربور کیا حال ہے؟ " ان کا نظریہ تھا کہ ایسا کرنے سے مکے کے عضلات مضبوط ہو جاتے ہیں ۔ اور تربور (چچازاد بھائی) دیوار کی مانند ہمارے پشتون معاشرے میں انسان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے ۔ بعد ملازمت اپنے محکمے اور حکومت پر خوب مُکے برسائے ۔ مارشل

لاء حکام او "نیب" کا ڈٹ کر جرات رندانہ کے ساتھ مقابلہ کیا۔ پشاور میں پلازے بنائے اور آخر قوت بازو، قوت ارادہ اور قوت لسانی کے بل بوتے پر اپنے اصل مرام سیاست کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیئے اور اپنے علاقے سے ایم این اے بن کر اس اکھاڑے کے محمدعلی کلے ثابت ہوئے۔اور اس فلسفے کو سچ کر دکھایا کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"

فاضل مصنف نے اپنے ایک کالم میں ذولفقار علی بھٹو کا بھی ذکر کیا ہے اور انھیں ایک ذ ہین سیاستدان لکھا ہے۔ البتہ ان کی مذہبی اور روحانی ذات میں ایک خلا تھا۔ اس بیان کا پہلا حصہ تو ہنری کسینجر سے لیکر میاں طفیل محمد کی شہادتوں تک ایک مسلمہ حقیقت ہے البتہ دوسرے حصے کے بارے میں ایک وضاحت کرتا چلوں۔ علامہ عبداللہ نے ایک دن چاروں صوبوں سے اکادمی میں آےء ہم زیر تربیت افسران کو بتایا کہ مذہبی لحاظ سے صوبہ سرحد میں دیوبندی مکتبہ فکر چھایا ہوا ہے۔ پنجابیوں کے ذہنوں پر بریلوی فکر حاوی ہے اور سندھ صوفیاء کی سرزمین ہے۔ جبکہ بلوچستان میں سیکولر سرداری نظام حاوی ہے (اس پر ہمارے چند بلوچی ساتھی برا بھی مان گئے) سُنا ہے کہ بھٹو مرحوم نے پھانسی سے چند گھنٹے پہلے یہ کہہ کر کلین شیو کیا کہ میں مولوی بن کر اپنے رب سے نہیں ملنا چاہتا۔ البتہ تسبیح انھوں نے ہاتھوں میں لے کر

اپنے سینے پر رکھ دی ۔ واللہ اعلم۔ سندھی تو من حیث القوم کٹر پیر سائیں پرست ہیں۔ انھیں تو آج بھی چاند میں شہید بھٹو کی شبیہہ نظر آتی ہے۔ ہمارے ایک دوست حاجی شیر بھادر خان کٹر مبلغ اسلام تبلیغی ہونے کیساتھ بھٹو کے جان نثار اور شیدائی ہیں۔ انھوں نے اس قومی سانحہ کی رات ایک خواب دیکھاکہ کچھ ظالم لوگ امام مظلوم سیدنا حُسین (ع) کو تختہ دار کی طرف لے جارہے ہیں۔ عقیدت کے یہ نظارے ہر قوم کی ثقافت، سماجی حیثیت، علمی معیار اور روایات کے عکس ہوتے ہیں۔ جن دنوں بھٹو کیس کا فیصلہ آنے والا تھا تو ایک دفعہ ہماری دوعظیم علمی شخصیات کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ اس کیس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ مرحوم قلندر مرحوم عقاب خٹک کا خیال تھا کہ ضیاء مرحوم ایک ڈرامہ کھیل رہے ہیں اور آخر میں عالمی سربراہان کے دباؤ پر انھیں رہا کردیں گے۔ لیکن محترم عبدالحلیم اثر صاحب اپنی کشفی معلومات کی بنا پر مصر تھے کہ بھٹو کو پھانسی دئے جانے کا حتمی فیصلہ ملاء اعلی میں غوثان زمانہ کرچکے ہیں۔ صرف دو بزرگوں لاہور کے داتا گنج بخش اور سندھ کے لعل شہباز قلندر نے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی۔ بابا شہباز قلندرتو اس قدر آگ بگولا ہوگئے کہ ملا اعلیٰ کو آگ لگانے کی دھمکی دی۔ موحوم اثر صاحب نے مزید فرمایا کہ ان دوبزرگوں کی راے اس لئے نہیں مانی گئی کہ دونوں کی رکنیت ختم ہو چکی تھی۔ اب فلسفی برگسان کی راےء میں کشف و

مکاشفہ انسانی ذہنیت کی ایک اعلی قسم ہے۔ بھٹو مرحوم نے اپنے زمانہ اقتدار میں ملک خداداد کی سرزمین پر دفن ان ہی دو بزرگوں کے مزارات کے لیے اعلی منقش سنہری دروازےبنا کر دئے تھے۔ اب یہ بھٹو صاحب کی عقیدت سیاسی تھی یا روحانی۔ البتہ اثر صاحب نے اپنی اعلیٰ ذہانت کے بل بوتے پر یہ کشفی راز پہلے سے معلوم کر لیا تھا۔

قرۃُالعین طاہرہ؛ مصنف کی طرح قرۃُالعین طاہرہ راقم الحروف کی بھی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ 1978ء میں رسالہ "پشتو" کے اقبال نمبر کے لیے ایک تعارفی مضمون لکھا ۔ لیکن تعارفی سے زیادہ تعریفی کلمات نے میرے لیے کافی ہنگامے کھڑے کیے ۔ قلندر مومند، حمزہ بابا اور بابی مرکز کراچی کے مہتمم محی الدین نے میرے عقیدے کے بارے میں شکوک وشبہات ظاہر کئے اور مجھے بار بار استغفراللہ لکھنا اور کہنا پڑا ۔ شاید اس مضمون میں عقیدت کی چاشنی کچھ زیادہ پڑ گئی تھی۔

لے گیا ہے دل صریحاً وہ بُتِ عیار آج

بن گئے ہیں اس نگاہ شوخ کے بیمار آج

قرۃُالعین کے حسن، صورت و سیرت، جرات مندانہ، مبلغانہ انداز بیان، آزادی نسواں کی تحریک کی دنیا میں اولین بے باک ترجمان اور رہتی دنیا تک ایک بے مثال عاشق، علم و بصیرت میں یکتا۔ واعظ اور صوفی شاعر، ذرین تاج کی ہمہ صفات کو فصیح

بھائی نے جس ساحرانہ، شاعرانہ رومانوی انداز کے نثری شہہ پارے میں پرو دیا ہے، وہ اگر ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کی نظر سے بھی گذرے تو واہ و تحسین پائے ۔ اس کالم میں قرۃُالعین کے بارے میں عالم اسلام کی دو مقتدر دانشوروں کی آراء نے مجھے ایک خوشگوار حیرت میں ڈال دیا۔ یعنی علامہ انور شاہ کاشمیری اور علامہ محمود الوسی بغدادی۔ حالانکہ مارتھا روٹ کی یہ تصنیف کافی عرصہ پہلے میری نظر سے بھی گذر چکی ہے۔

پٹھانوں کی اصلیت؛ اس کالم میں انہوں نے اگرچہ صاف انکار تو نہیں کیا لیکن بین السطور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قیس کے وجود اور اسلام لانے کے واقعہ کو مشکوک اور متنازع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حدیث پاک کی دو مستند کتابوں علامہ ابن اثیر کی اسدالخابہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب الاصابہ میں مختصرا" اس رنگ میں آیا ہے اور یہ مخزن افغانی سے صدیوں پہلے لکھی گئی ہیں ۔ اس کی تصدیق وہ گوگل انٹرنیٹ سے بھی کرسکتے ہیں۔ (دونوں حوالے حاشیہ پرمنسلک ہیں) ۔ البتہ قیس/ کیس نسلا بنی اسراءیل تھا یا آریہ؟ اس پر فیصلہ کن راےء ان کا ڈی ۔ این۔اے کا سائنسی طریقہ کسی حد تک کر سکتا ہے۔ اپنی ایک فی الحال غیر مطبوعہ کتاب "نگارشات چراغ" میں میں نے ان تینوں نظریوں پر بحث کی ہے۔ البتہ ان کے کردار و افعال کو محترم فصیح صاحب سے سالوں پہلے اپنی کتاب "

انوار چراغ" میں چھیڑ کر قوم پرست دوستوں کی جانب سے پٹھانوں کے سلمان رشدی کا خطاب پا چکا ہوں۔اب بھی میرے خیال میں پٹھانوں کی ایک جنیاتی کمی (جینیٹک ڈیفیکٹ) ہے۔ جسے پیر روشان اور خوشحال خان سے لیکر فخر افغان تک کوئی بھی دور تو کیا تشخیص بھی نہ کرسکا۔ میری ناقص رائے میں خان عبدالغفار خان ایک عظیم مصلح تھے۔ (بقول مولانا بھاشانی وہ مہاتماگاندھی ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے پائے کے انسان تھے)۔ مروجہ گندی اور سازشی سیاست سے انکا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ایک سیدھی سادی سچی بات کے آدمی تھے۔ انگریزوں نے ان کی خدائی خدمتگار تحریک کو غلط سمجھا اور ان کو کھینچ کر میدان سیاست میں لے آئے۔ شروع میں وہ مشن سکول کے پرنسپل پادری گراہم سے متاثر تھے۔ بعد میں حاجی صاحب ترنگ زئ کی اصلاحی اور سماجی تحریک کا کچھ عرصہ حصہ رہے اور آخر میں انگریز سرکار کے ناروا ظالمانہ سلوک کی وجہ سے مہاتما گاندھی کی کرشمہ ساز شخصیت سے مکمل طور پر وابستہ و پیوستہ اور ہم رنگ ہو گئے ۔ تقسیم ہند کے فارمولے کے قبول کرنے پر کانگرسی قیادت سے بدظن بھی ہوگئے لیکن پاکستان کی مسلم لیگی قیادت ان کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ متحدہ ہندوستان کے وہ واحد رہنما تھے جو ابتداء میں کشمیر اور آبی وسائل کے بنیادی مسائل اور تنازعات کو اس وقت کے کانگریسی زعماء کے ساتھ

مثبت انداز میں حل کرسکتے تھے۔ انھوں نے یہ پیشکش کی بھی تھی لیکن حکومت وقت نہ مانی اور برابر انکو سرحدی گاندھی کہتی رہی ۔ جمعہ خان صوفی ان کے ایک دبیر کی نظر میں وہ ایک nationalist (قوم پرست) راہنما تھے -

فاضل مصنف نے اپنی کتابوں میں امریکہ، مغرب، اسلام، دہشت گردی، فوج اور جدید تصوف کے بارے میں جو فکر انگیز اور بصیرت افروزعلمی کالم لکھے ہیں وہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ امریکی اور اینگلوسیکسن تہذیب (جس میں یونانی ۔ رومن اور یورپی تہذیبوں کے عناصر شامل ہیں) کا ایک تواتر اور تسلسل ہے ۔ والٹر رسل مینزل اپنی کتاب "گاڈ اینڈ گولڈ" (چھاپ 2007 ء) میں رقمطراز ہے کہ خداوند پاک اور سونا امریکیوں کی ساری زندگی کا معاشی۔ سماجی اور سیاسی فلسفہ اور مقصد ہے۔ وہ ان لوگوں کو اپنے دشمنوں میں سے گردانتے ہیں جو خدائي فرمانروائی ۔ شخصی آزادی اور اخلاقیات کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ اپنے فائدے اور سود کی خاطر ہر حربہ جاءز سمجھتے ہیں اور ففتھ کالم کی سازشی کمک پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے دشمنوں میں سپین کے کیتھولکس، لینن کے پیروکار،نازی ازم کے حمایتی، کمیونسٹ اور القاعدہ کے لڑاکا شامل ہیں۔ ان کے خیال میں یہ سارے مخالفین امریکہ اور برطانیہ کے بارے میں یکساں عقائد رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے مخالفین کے ہاتھوں معمولی ضربیں ضرور

کھائی ہیں۔ لیکن انہوں نے بڑے معرکے جیتے ہیں۔ خاص کر موجودہ وقت میں مشرق وسطی میں انہوں نے آزادی۔ سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت کو بچایا ہے۔ فصیح صاحب کا یہ مشاہدہ کافی وزن دار ہے کہ امریکہ کو ہم معاشی اور جنگی ضربوں سے جھکا نہیں سکتے۔ اس کے لیے ہمیں منظم انداز میں ان کے مثبت سوچ رکھنے والے دانشوروں کو ڈائیلاگ کے ساتھ قائل کرنا ہوگا۔ تو بات کافی حد تک صحیح ہے۔ لیکن پشتو کا ایک محاورہ ہے کہ "غریب ملا کی آذان پر کوئی کلمہ بھی نہیں پڑھتا"۔ امریکہ میں بھی اصل طاقت مادی فوائد کے متلاشی سیاستدانوں یا سی ۔ آئی۔اے جیسی مجرمانہ ذہنیت والی تنظیم (مارفیاز) کے ہاتھوں میں ہے۔ سکندر کی ہر جگہ خو ایک ہی قسم کی استحصالی اور ظالمانہ ہوتی ہے۔ ارسطو کی دانشوری صرف استادی کی حد تک ہوتی ہے۔ امریکی جب کوریا اور ویٹ نام میں ذِلت ناک پسپائی سے دوچار ہوجاتے ہیں تو واشنگٹن ڈی۔ سی میں پوٹیمک دریا کے کنارے مال روڈ پر ان ممالک میں ہلاک ہونے والے اپنے سپاہیوں کی یاد میں یادگاریں تعمیر کرتے ہیں (دنیا افغانستان کی یادگار کی منتظر ہے)۔ پھر ان یادگاروں پر ایسے ملہم زدہ الفاظ کندہ کردیتے ہیں؛

Take a knife and cut open the Earth,

And with time the grass would heal it

(ترجمہ۔ ایک خنجر لیکر زمین کا سینہ چاک کردو ۔ وقت کے گداز ہاتھ سبز گھاس سے اس زخم کو رفو کردیگی)

اور پھر چند ہی سالوں بعد پامال شدہ ممالک کے صدور ان یادگاروں پر پھولوں کے گلدستے رکھ کر سلیوٹ کرتےہیں۔ امریکنز نے یہی سلوک ریڈ انڈینز۔ بلیک نیگروز۔ اپنی جنوبی ریاستوں کی فوجوں اور صنف نازک سے کیا ہے۔لیکن بعد میں آزادی اور جمہوریت کے نام پر ان کی ایسی دلجوئی کی ہے کہ وہ آج بڑے فخر سے کہتے ہیں؛ We are only Americans today. کرشمہ ساز لیڈرشپ اسی کو تو کہتے ہیں۔ خدا جانےہم پاکستانیوں پر یہ برادری ۔ ایک پاکستانی قومیت کاجذبہ اور ہم آہنگی کی یہ خوشگوار فضا کب قایم ہوگی۔

ان کے دو مضامین جو مجذوبوں کی اسمبلی ۔ شہر کی تباہی اور آگ کے ذکر سے معمور ہیں، بھی بڑےمعنی خیز اور وزنی ہیں۔ ورجینیا کی لائبریری میں ایک کتاب سرسری نظر سے گزری تھی ۔جس کانام تھا"نیویرک از برننگ" ۔۔ رات کو جب وہاں کے ایک جزیرے میں نصب مجسمہ آزادی کو دیکھا جو برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا تو ایسا لگا کہ یہ مجسمہ ہی اس کتاب کے سر ورق پر کندہ ہو واقعی جل رہا ہو اور زبان حال ساغر صدیقی کا یہ شعر سنا رہا ہو؛

جس دیس میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی

اس دیس کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

ان کتابوں میں بہت کچھ فکری اور نظریاتی مواد قاری کی ذہنی آدرش کے لیے موجود ہے ۔ وطن عزیز کے افتادگان خاک کے مسائل پر بھی مثبت بحث کی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ بے پرسان مخلوق پشتو ڈرامے "دروغ رشتیا" (جھوٹ سچ) کے کردار بادام گل کی مانند ہیں جو جھوٹ اور سچ میں اچھی طرح تمیز کرنے کی صلاحیت کے باوجود حالات کے جبر کی وجہ سے مجبور و مقہور ہیں۔ نام نہاد رہبر ہی ڈاکو نکلتا ہے اور یہ گھن چکر وہ صدیوں سے اپنی آنے والی نسلوں کو منتقل کرتے جا رہے ہیں۔

بعض موضوعات کا سرسری ذکر کیا ہے جیسے وہ اپنے کالم کا پیٹ بھر رہے ہوں۔ حمزہ شنواری جیسی عبقری اور جید پشتو نابغہ شخصیت کو ایک گم شدہ کیسٹ کے حوالے کردیا اور دوستوں کی سرمستیوں کے جھرمٹ اور لیڈی ڈیانہ کے حسن و جمال کے جلووؤں اور رعنائیوں میں کھو کر یہ بھول گئے کہ بابا سے کیا پوچھا گیا۔ انہوں نے کیا جواب دیا۔ ان کی تو ہر ادا اور بول ہماری تاریخ میں سنہری لفظوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ بہرحال کالم میں کافی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

جدید تصوف کے بارے میں ان کے مرشد اور استاد گرامی جناب علی اصغر باواجی مدظلہ کی رائے کے بارے میں بھی کافی کچھ سوچا اور لکھا جاسکتا ہے۔ اس مسئلے نے آج سے نہیں دو سو سالوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں کو ماؤف کردیا ہے۔ جب مشرق پر اقوام مغرب اپنی محیرالعقل ایجادات کیساتھ حملہ آور ہوئیں۔ روشن خیال سرسید کو غالب نے بھولا سید تک لکھا جب انہوں نے اذکار رفتہ آئین اکبري کا اردو مسودہ تقریظ کے لیے بھیجا۔ باواجیؒ نے یقینا" ایک نہایت ضروري مسئلے کو جدید انداز میں چھیڑا ہے۔

شاعری: ممدوح کے پشتو شعری مجموعے "د جنون چپے" (امواج جنون) پر میں ایک دفعہ ایسا مختصر تبصرہ ان الفاظ میں پیش کرچکا ہوں۔ "ڈاکٹر صاحب ایک اچھے موزوں طبع روان نظم گو شاعر بھی ہیں۔ جنہوں نے غنی خان کی شوخ و رنگین نوری لے میں اپنے مذہبی، صوفیانہ اور رومانوی خیالات و افکارکو تلمیحات، تشبیہات، نت نئے الفاظ اور اصطلاحات کی خوش رنگ مالا میں پرو دیا ہے۔" چونکہ انہوں نے ان نظموں کے ساتھ تاریخِ سال نزول نہیں لکھا اس لیے میں ان کی شوریدہ سری کی تاریخی ارتقاء پر بحث نہیں کرسکتا البتہ اپنی اس رائے میں اردو کے اس روایتی شعر کا اضافہ کرتا ہوں: جنوں میں کہہ دیا گر تجھے خدا میں نے

خدا گواہ ہے نہیں کی کوئی خطا میں نے

مصنف ایک خود شناس، جہاں بین، محب الوطن، صاحب مشاہدہ اور فکرونظر، حقیقت پسند، منصف مزاج اور انسان دوست شخصیت ہیں۔ علم و حکمت اور خیروبرکت کو جہاں کسی شخصیت،کتاب یا ادارے کے پاس پانے کی گن سنتے ہیں تو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں

ورنہ یہاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے

مصطفے زیدی کے ایک شعر کا مصرعہ ہے :

شاہی تو مل گئی دل شاہانہ چھوٹ گیا

لیکن شکر ہے کہ ہمارے فصیح الدین اشرف سلیمانی صاحب (پی-ایس-پی) کا دل ابھی تک سلامت ہے۔ فقیر منش اور حلیم الطبع انسان ہیں۔ برصغیرکے بے مثل خطیب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒلڑکپن میں گولڑہ شریف کے پیر مہر علی شاہؒ سے جب بیعت ہوے تو اپنے لیے حضرت سے اللہ تعالی کے دربار میں یہ دعا کروائی کہ انہیں خطابت میں ایسامقام حاصل ہوجائے جو برصغیر میں بے مثل ہو۔ پیر صاحب کی دعا قبول ہوئی اور شاہ جی کی خطابت اور خوشبیانی کا ڈنکا ہر سوبجنے لگا۔ اس دوران مرشد و مرید میں کچھ اختلافات در آے ء جن کی وجہ سے دوریاں پیدا ہو گئیں اور وہ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے حلقہ بگوش ہوےء لیکن بستر مرگ پر جب پیر گولڑویؒ کے ایک مرید انکی عیادت کے

لیے آے ء تو شاہ جی نے روتے ہوے فرمایا "کاش میں نے حضرت کے توسط سے اللہ رب ذوالجلال سے بیان کی بجاے ء ایمان کی دعا مانگی ہوتی" فصیح صاحب کو قدرت نے زبان، بیان اور تحریر کی بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے ۔ اللہ تبارک و تعالی وقت آخر ہم سب کو ایمان کامل کی دولت سے سرفراز فرماے ء۔ آمین!

اپنا لکھا معیوب لگے مجھے ۔ وقت لکھے گا تعارف میرا

(حافظ هجر عسقلانی اور اِبن اثیرکی گواہی)

"د قیس ذ کر پۀ عربي ثقه او معتبرو تاریخي کتابونو راغلے دے۔ ابن اثیر (26) اسد الغابه ۲۳۹ هجري او حافظ ابن حجر عسقلاني (27) ئې پۀ الاصابه ۲٦۸ هجري کښې د قیس ذکر کړے دے، چې د سلیمان د غرو ځخه لاړو او د حضور صلے الله علیه وسلم پۀ خدمت کښې حاضر شو۔ د دې روایاتو منبع کتاب الکبیر دے۔ د دې معتبرو کتابونو روایاتو ته ځنګه افسانه اووایو؟

26 ۔ علامه ابن اثیر (۱۱٦۰ء نه تر ۱۲۳۴ء) پۀ خپل کتاب اسدالغابه جلد ۴ص ۲۲ کښې لیکي؛ "قیس بن یزید نه د هغۀ اولاد دا روایت کړے دے چې هغه (قیس ابن یزید) د رسول الله صلے الله علیه وسلم پۀ خدمت کښې حاضر شواو مسلمان شو او آنحضرت صلے الله علیه وسلم هغه د خپل قام والي کړو او پۀ سر ئې ورله (د مخه مهربانئ) لاس راښکلو (نو

بیا هغه) خپل قام ته راستون شو او یو غرۀ ته راوبللو چې نامه ئي سلیمان وۀ او هغه هم مسلمانان شول او د قیس د سر هغه ځائ ویښتۀ چې حضور صلے الله علیه وسلم پرې خپل مبارک لاس راښکلے وۀ، د هغه (قیس) تر مرګه پورې سپین شوي نۀ وو- (دا بیان ابو موسیٰ' راوړے ده)

و)-

27 - حافظ بن حجر عسقلانی (۱۳۷۳ ء نه ۱۴۴۹ء) پۀ خپل کتاب الاصابه جلد ۵ ص ۲۶۸ کښې دا وقعه داسې لیکي: "قیس بن یزید د هغه ذکر ابو اسحاق شملي د بلخ د بنو پۀ خلکو کښې کړے دے چې قیس بن یزید اوویل چې زۀ پۀ وادي بسع کښې د نبي صلے الله علیه وسلم پۀ خدمت کښې حاضر او مسلمان شوم او بیعت مې وکړو او ما له ئې فرمان ولیکلو او عصا ئې راوبخښلو (نو دې نه پس) هغه خپل قام ته راستون شو او د قام ئې یو غرۀ ته چې نامه ئې سلمان وۀ، را اوبللو او د اسلام دعوت ئې ورکړو او هغوئ اسلام قبول کړو- (ابو اسحاق شملي نه دا روایت د عباس بن ذنباع پۀ ذریعه او هغه ته د خپل پلار او هغه له لۀ ضحاک نه، او هغه د خپله پلاره او هغه ته د فالک بن قیس نه رسیدلے دے-

---

زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے
(غلام محمد نذر صابری)

بچپن ہی سے کتاب گھر یا کوئی لائبریری کا گوشہ تنہائی میری پسندیدہ جاےء سکون و عافیت ہے - جھاں میں اپنی

متاع عزیز کتاب کا مطالعہ انہماک اور توجہ سے کرسکوں ۔ اسی طرح کتاب دار جو کتاب گھر کے ایک کونے میں ایک اونچی کرسی پر تشریف فرما ہوتا تھا۔ میری مثالی (ideal) شخصیت ہوتی ان کے ارد گرد مقفل الماریوں میں بے ترتیب رکھی ہوئی متنوع المعلوم کتابوں کو میں انتہائی رشک اور شوق کی نظر سے دیکھتا تھا

دو یار زیرک و از بادۂ کُہن دو منے

فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے

ان دنوں ہم بنوں شہر کی ایک گلی مابین چمبیلی چوک اور غلہ منڈی(123/C) میں رہائش پزیر تھے ۔ گھر پر راولپنڈی سے شائع ہونے والا ایک اردو اخبار تعمیر/ کوہستان ہاکر دن کے قریب ڈھائی تین بجے پہنچا دیتا۔ گھنٹی کی اواز سن کرمیں لپک کر اس سے اخبار جھپٹ کر جلدی جلدی قبضے میں لانے کی کوشش کرتا۔ اس دوڑ میں چھوٹے ماموں صاحب اکثر میرے حریف ہوتے۔ اخبار کو میں سرے سے آخر تک نمایاں سُرخیوں سے لیکر ٹنڈر نوٹس تک لفظ بہ لفظ سطر بہ سطر یعنی حرف بہ حرف ھو بہ ھو تفصیلا" پڑھتا اور پھر بوقت دیگر اپنی سائیکل سمبھال کر مقامی میونسپل کمیٹی لائبریری کا رُخ کرتا۔ لائبریری میں ایک بڑی لمبی میز پر مختلف مقامی و ملکی اخبارات، رسالے ، کتابچے، پمفلٹ اور اشتہارات بکھرے پڑے ہوتے ۔ قارئین اکثر نظر کی عینکیں اوپر نیچے کرتے ہوے سال خوردہ بزرگ ہوتے۔ میری عمر کا شوقین

مزاج کتابی کیڑا قاری ان صفوں میں شاذ و نادر ہی ایک آدھ براجماں ہوتا۔

بنوں کمیٹی کا کتاب دار ایک درمیانی عمر عجب کتاب بیزار بے ذوق انسان واقع نظر آتا تھا۔ کتب خانے کے ایک کونے میں ایک خاصی بڑی میز کے سامنے ایک اونچی سائز کی کرسی پر بیٹھا ھوا چند ساتھیوں کے ساتھ گپیں ہانکتا اور چاے کی پیالی سے چسکیاں لیتا مصروف دکھائی دیتا۔ میں نے کبھی بھی اس کو کتاب پڑھتے یا دوستوں کے ساتھ کسی علمی موضوع پر بحث و تمحیص کرتے نہیں پایا۔

میڈیکل کالج پہنچتے پہنچتے ادب ، شاعری، تاریخ، دینیات اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں پڑھنے کا یہ شوق جنون کی حدوں کو چھونے لگا ۔ لکی کالج کا لائبریرین نور جلال شاہ ہو، لکی ٹاون کمیٹی کا ہیڈ کلرک جناب محمود شاہ صاحب ھو یا پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈمی کے تاریخی نامی گرامی کتب دار مولانا اسحاق صاحبؒ ابن مولانا عبدالرحیم مرحوم ہوں کتابیں ہی ہمارے درمیان دوستی تعلق اور مؤدت کا ذریعہ بنیں ۔

صابرین : ۔ کتاب بینی کتاب خوانی او کتاب فہمی کے بعد جب صاحب کتاب بننے کی سعادت حاصل کرنے کا مرحلہ آیا تو صاحبان علم و فن روزگار وقت مولانا امتیاز علی عرشی مولانا محمد شفیع او خاص کر حافظ محمود شیرانی مرحومین کا بیتا ہوا دور یاد آیا۔ لیکن وہ نابغان روزگار اب یادگار سلف میں شمار ہوتے تھے ۔ میں تو اب دور

صابرین میں جی رہا تھا۔ ان میں سے ایک کوہاٹ میونسپل کمیٹی کے لائبریرین مرحوم ایوب صابر تھے جو اردو اور پشتو کے نامور ادیب ہونے کی وجہ سے ادب کے گرونانک اور پنجاب او سرحد (حال خیبر پختون خواہ) کے ادیبوں کے درمیان تعلق دوستی اور خیرسگالی کا خوشحال گڑھ پُل کہلاتے تھے۔ دوسری ادبی و ثقافتی ہستی اٹک شہر کے چودھری غلام محمد نذر صابری مرحوم تھے اس وقت سرزمین اٹک کے جلیل القدر علمی، ادبی او مذہبی ہستی جناب غلام جیلانی برق کے جانشین سمجھے جاتے تھے ۔ ان دونوں صابرین میں ایک قدر مشترک تھی کہ دونوں عہدے او پیشے کے لحاظ سے کتاب دار، علم دوست اور سخن فہم حضرات تھے ۔ اور عجب اتفاق یہ تھا کہ میرے پہلے تحقیقی اور تاریخی مقالے کا تعلق ان ہی دو حضرات کے شہروں سے تھا۔ ان دنوں تعلق قائم کرنے کے دو ہی طریقے تھے ۱ ۔ مکتوب نگاری یا مراسلت ۲ ۔ ٹیلیفونک (PTCL) رابطہ جو شاذ و نادر ہی مختصر بات اور دقیقے کے لیے بروے کار لایا جاسکتا تھا۔

لطیفہ : ۔ نذر صابری مرحوم سے میرا قلمی تعلق اور پہچان کب سے شروع ہوا اس کی صحیح تاریخ تو اب مجھے یاد نہیں آ رہی لیکن ان کے ایک خط محررہ ۱۲۔۱۱۔ ۱۹۷۹ سے پتہ چلتا ہے کہ میں نے اپنے ایک خط میں شاید ان کا ایڈریس یوں لکھا تھا۔ ‘نذر صابری بمعرفت غلام محمد ’ جوابا" وہ تصحیح فرماتے ہوے لکھتے ہیں ‘‘میرا قلمی نام نذر صابری ہے اور اصل نام غلام محمد

ہے۔ آپ کا ایڈریس نذر صابری c/o غلام محمد بڑا لطف دے گیا ہے ۔ ''

تعلقات اور مراسلت : ۔ ۱۔ صابری صاحب کے ساتھ کوشش اور جہد کے' ان سالوں کے تعلقات او مراسلت کے باوجود بد قسمتی سے میری کبھی ان سے روبرو اور بالمشافہ ملاقات نہ ہو سکی۔ انہوں نے اس عجب اتفاق کا ذکر اپنے ۳ اگست ۱۹۸۳ء کے ایک خط میں یوں بہ انداز شگفتہ و والہانہ فرمایا ہے ۔ '' جو لوگ مکاتبت سے شرح صدر کی دولت حاصل کر لیتے ہیں وہ ملاقات سے کس قدر خلد بکنار نہیں ہونگے ۔ ''

۲۔ قاضی عبدالحلیم اثر افغانی اور چودہری غلام محمد صابری دونوں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے دوست اور علمی رازداں تھے ۔ دیوان شاکر کی رونمائی کے موقع پر ایک تقریب کے دوران شاکر کی شخصیت کے بارے میں ان دونوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ صابر صاحب ایک محقق شاعر مخطوطہ شناس فہرست نگار اور کتاب دار تھے ۔ جبکہ اثر صاحب جامع الصفات عالم ہونے کے علاوہ کشف علی الدوام رکھنے کے بھی دعویدار تھے ۔ ساتھ ہی عقلی دلائل کے انباربھی ڈھیر کردیتے۔ ساتھ ہی علم ترکیب السان کے زور پر ہر علمی معرکہ ایسا سر کر لینے کی بھرپور صلاحیت سے ایسے مالامال تھے کہ قاری کا ذہن تسلیم نہ کرنے کے باوجود اس تاریخی افسانے کے صریحا ابطال پر قادر ہونے سے قاصر ہوجاتا۔

مرحوم صابری صاحب کو بھی اثر صاحب کے مقابلے میں اس موقع پر ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

مورخہ ۸۔ ۹۔ ۱۹۸۳ء کو لکھے گئے ایک خط میں اثر افغانی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں ''اس (اثر افغانی) کی تخلیقات یا اشارات کا تتبع کرنا اپنی زندگی کے اوقات عزیز کو ضائع کرنا ہے اور اپنا علمی وقار کھونا ۔ ''

جبکہ بر سبیل تذکرہ ان کے ایک تیسرے معاصر محقق جناب عقاب خٹک تو شاکر کو سرے سے ایک شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔ ان کی نظر میں تو شاکر صرف ایک متشاعر تھے جس کی غزلیں مطلع و مقطع کی قید سے عاری ہیں ۔

۔ روضۃ الصابرین : ۔ میں نے اپنے خاندانی قلمی ذخیرے سے جوچند نسخے صابری صاحب کو ارسال کیے ان میں روصۃ الصابرین (کا ایک خوش خط قلمی نسخہ) بھی شامل تھا ۔ صابری صاحب کو یہ نسخہ اتنا لبھا گیا کہ انہوں نے اسے اپنے ہم کار غضنفر علی وہڑائچ کو پی ایچ ڈی مقالے کے لیے منتخب کرلیا۔ غضنفرصاحب کے استادوں نے اس نسخے پر چند بھاری بھرکم اعتراضات یکے بعد دیگرے کیے۔ صابری صاحب نے بھی ان اعتراضات کو بھرپور دفاعی جواب دے کر رد کیا ۔ نذر صابری صاحب کی راےء تھی کہ :

۱۔ صابر ایک پختہ کار شاعر نظر آتا ہے۔

۲۔ اسے زبان پر استادانہ عبور حاصل ہے ۔

۳۔ مثنوی کی روانی سلاست حقیقت نگاری اور متانت اس کے جوہر ہیں ۔ لیکن افسوس کہ غضنفر کے اساتذہ کو مثنوی میں حقائق پسندی کی وجہ سے شعریت شاید کم نظر آرہی ہوگی۔ اب جبکہ کلیات مکاتیب نذر صابری (جلد اول) بمعہ علامہ عبدالعزیز ساحر کی ترتیب، متن،مقدمہ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع ہوچکا ہے۔ جس میں مرتب کلیات نے تونسہ شریف کے نواحی علاقے کے اس نوخیز عمر شاعر کے مزید حالات زندگی، علمی کوائف اور اس مثنوی کے دو اور نسخوں کا بھی انکشاف کردیا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ فن اپنے نظریوں پر نظر ثانی فرماکر اس مثنوی کو اپنی خوبیوں اور محاسن کے باعث اس کا اعلی اور جائز علمی مقام دے کر اہل علم و فن کی تشنگی کو رفع کریں ۔ عجب حیرت کا مقام ہے کہ ایران اور پاکستان دونوں ملکوں میں اس کے نُسخے موجود ہیں لیکن ایک نامعلوم خوف او وجہ سے نظر التفات سے محروم ہیں۔ یہاں تک کہ مصنف نے خود بھی اسے بعد کے سالوں میں نظر انداز کردیا تھا۔ آخر معقول وجہ بتائیں تاکہ صابری مرحوم کی روح سکون پاۓء ۔

۴ ۔ صابری صاحب مرحوم کے ساتھ قلمی مراسلت باقاعدگی سے قائم اور جاری رکھنا ایک پیشہ ور مصروف انسان کے لیے کبھی کبھار دشوار ہوجاتا تھا خاص کر مجھ جیسے ایک جامد اور متلون مزاج انسان کے لیے کہ وہ ایک شخصیت کی تاریخ ، کارہاۓ نمایاں اور حدود اربعہ کے ساتھ وہاں کے مکمل جغرافیہ بمعہ نقشہ جات کے ذریعے بیان کر سکے ۔ فروری ۱۹۸۷ء کے ایک خط

میں انہوں نے کوہ سلیمان کے بارے میں چند اساطیری قصوں کی تصدیق چاہی ۔ میں نے جو کچھ تاریخی کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس پہاڑ کا پہلا نام ستی پرلات پربت تھا۔ پھر کوہ سلیمان پڑا اور آجکل اسے کسئ غر کہتے ہیں ۔ اور ان ناموں کی ممکنہ توجیہات بھی ذکر کیں لیکن وہ اپنی چند سُنی ہوئی اساطیری قصوں کے صحیح ہونے پر مصر رہے اور ساتھ ہی اپنے ایک ساتھی پروفیسر جو کبھی ٹانک میں نوکری کرچکے تھے کو بطور چشم دید گواہ کے پیش کرتے۔ لیکن سب سے مشکل مرحلہ مختلف تاریخی مقامات کی نشاندہی ، شناخت اور فاصلہ بذریعہ نقشہ جات ان کو سمجھانا اور مطمئن کرنا ہوتا۔

۵ ۔ بخاری اور صابری چپقلش اور ناراضگی : محترم ایوب بخاری ایڈوکیٹ ہمارے خاندان کی ایک بزرگ مایہ ناز اعلیٰ گل سرسید ہیں ۔ انھوں نے دوستوں کے اسرار پر چاہا کہ اپنے جدامجد پیر زین الدین کی فارسی کتاب بدعۃ الاربعین کا اردو ترجمہ چاپ دیں۔ باقی قصہ آپ بخاری صاحب کے زبانی سنیں : ‘‘جن صاحب (نذر صابری) نے سب سے پہلے ترجمہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ انھوں نے وعدہ فردا پر ٹالتے ٹالتے نو (۹) سال بعد بڑے فخریہ انداز میں جب یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ ترجمہ کے لیے اب یہ کتاب میرے سرہانے پہنچی ہے تو یہ نوید میرے لیے مہمیز کا کام کر گئی اور اسی لمحہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۶ جنوری ۱۹۹۹ یہ فیصلہ کرلیا کہ اب یہ ترجمہ ہوکر رہے گا (انشا اللہ)۔ بخاری صاحب کی غیرت سادات جاگی ایوب بخاری شعلہ ہے یا چنگاری کی مجسم تصویر بن

گئے ۔ صابری صاحب کے ساتھ تعلقات اتنے بگڑے کہ رسمی آنا جانا بھی موقوف ہوگیا۔ صابری صاحب طبعا ایک حساس اور زودرنج انسان تھے ۔ اس صورت حال پر سخت پریشان تھے ۔ ‘‘ ایک ذرہ سی بات پر برسوں کے یارانے گئے ’’

راقم الحروف کے نام ایک خط محررہ ۲۵۔۸۔۱۹۹۹ میں یوں رقم طراز ہیں۔

بڑھاو نہ آپس میں محبت زیادہ

مبادا کہ ہو جاے نفرت زیادہ (حالی)

‘‘ سید ایوب بخاری سے پچھلے دنوں بڑھتے ہوے تعلقات نفرت پر منتج ہوے ہیں۔ انھوں نے بدگمانی اور الزام تراشی کی حد کردی ہے ۔ میں نے اس طرف جانا چھوڑ دیا ۔ ’’

٦ ۔ ہمارے علاقے کے میاں وکیل شاہ فقیرخیل جو ایک مخلص او محنتی ادبی اور تحقیقی میدان کے ایک نامور شاہسوار ہیں ۔ نذر صابری مرحوم اور ان کے درمیان بھی ایک موقع پر غلط فہمی کی وجہ سے اچھی خاصی تلخ کلامی پیدا ہوئی۔ مجمع البرکات فارسی نثر میں لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب صابری صاحب کی ملکیت میں تھی ۔ کتاب ہذا اس زمانے کے مطابق خشک و تر (ربط و یابس) رکھنے کے باوجود کاکا صاحب کے بارے میں تفصیلی معلوماتی کتاب ہے ۔ کاکاخیلوں کا ایک ٹولہ آیا اور صابری صاحب کی علم دوستی او سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے

ہوے وہ کتاب ان سے لے گئے ۔ صابری صاحب کی بار بار یاد دہانیوں کے باوجود وہ کتاب ایک دوسرے زورآور کاکاخیل میاں جمال شاہ کے مضبوط نرغے میں چلی گئی اب واپسی تقریبا ناممکن ہو گئی ۔ صابری صاحب غُصے سے بھرے پڑے تھے کہ اسی وقت میاں وکیل شاہ فقیر خیل آن ٹپک پڑے ۔ صابری صاحب نے اپنے غُصے اور گلے شکایتوں کی بھڑاس ان پر نکالی حتیٰ کہ تمام پشتونوں کو سخت بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ فقیرخیل نے پہلے تو ان کی بزرگی اور عمر کا لحاظ رکھا لیکن آخر تنگ آمد بہ جنگ آمد اینٹ کا جواب پتھر سے دینے پر مجبور ہوے ۔

۷ ۔ پروفیسر عبدالعزیز ساحر صاحب کی مذکورہ کتاب کی ورق گردانی کرتے وقت جب میری نظر اس شعر پر پڑی تو دل کو لبھا گیا اور میں نے اس شعر کو دیگر ہم ذوق دوستوں کے ساتھ فیس بک کے پردے پر شئیر کردیا ۔ ہم ذوق ساتھیوں نے خوب داد دی ۔ شعر یوں ہے ۔ ع

خوابوں میں بھی آتے ہیں تو کُھل کر نہیں آتے

یہ اوٹ ، یہ پردہ ، یہ ادا میرے لیے ہیں

ساتھ ہی نیچے لکھا نذر صابری صاحب رحمہ اللہ ان کے ہمدم دیرینہ ایوب بخاری یہ شعر سن کر تڑپ اُٹھے اپنی ساری پرانی تلخیاں، بدگمانیاں اور شکایتیں بھول گئے ۔ شاہ جی کی کوڑ (غُصہ، نفرت) محبت اور الفت میں بدل گئی اور اپنی خاندانی روایتی وسیع القلبی، وجاہت اور

مخلصانہ ذاتی علمی تعلق کا ثبوت دیا اور اس شعر پر یوں تبصرہ فرمایا:

‘‘ واہ کیا خوب زمانہ تھا

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اور میں اُس زمانی نشتر و ارمان کے تیر چلانے والے امیر مینائی کے اس شہرہ آفاق شعر کو یوں مکمل کرتا ہوں :

ہوے نامور بے نشاں کیسے کیسے

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

لیکن شُکر خداوندی ہے کہ اٹک کے یہ نامور فرزند اپنے پیچھے اپنی تخلیقات، تالیفات، تحقیقات اور مقالات کا ایک وسیع خزانہ چھوڑ گئے ۔

نذر صابری مرحوم اصل میں ملتانی ثم جالندھری تھے تقسیم کے بعد انہوں نے آبِ اٹک نوش فرمایا اور اپنے اوصاف حمیدہ اور اخلاق عالیہ سے اس سرزمین کو گلِ گلزار اور رشکِ لاہور بنا گئے ۔

ہـــر آں کـــس کـــہ آب اٹـــک نـــوش کـــرد
طریـــقِ محبـــت دریـــں

جوش کرد

خُدایا اٹک را کُنی گُلِ گُلاب ۔ دُعاے
فقیراں کُنی مستجاب

آخری کلام و گفتگو : ایک بار میں اٹک شہر اس پختہ ارادے سے گیا کہ آج اُن سے ضرور روبرو ملاقات کا فیض پاوں گا۔ ایک رشتہ دار کو بھی ساتھ لیا جو اٹک کالج کے دو سال تک طالب علم رہ چکے تھے ۔ ایک ٹیلیفون گھر(PCO) سے ان کے گھر کا نمبر ملایا۔ انھوں نے خود ہی ٹیلیفون اُٹھایا۔ میں نے معمول کے مطابق جانے پہچانے بے تکلفانہ لہجے میں یوں پوچھا کدھر سو رہے ہیں نذرصابری ؟ ان کے کان پہلے ہی سے ان الفاظ سے آشنا تھے اور جب انھیں پتہ چلا کہ میں ان ہی کی طرف آرہا ہوں تو انتہائی پیار اور بے حد خوشی سے یہ خیر مقدمی کلمات کہے " زہے نصیب زہے نصیب " اور میرے ساتھی کو اپنے گھر کا راستہ بتلا دیا ۔ لیکن میری بدنصیبی پھر بھی آڑے آگئی ۔ میرا ساتھی حد سے زیادہ اناڑی نکلا۔ شام اندھیرے تک اٹک شہر کی گلیاں چھانیں لیکن منزل مقصود و گوہر نایاب نہ پا سکے اور بے نیل و مرام واپس ہوے ۔

توصیفی کلمات : ایک خط میں محترم راجہ نور محمد نظامی صاحب کا ذکر ان مختصر احسن الفاظ اور انداز میں یوں کرتے ہیں ۔ "آج اتفاق سے بھوئی گاڑ والے نظامی مل گئے ۔ آثاریات اٹک پر کام کر رہے ہیں ۔ ارکیالوجی پر قائم ادارہ ان کا اپنا پرائیویٹ آفیئر ہے ۔ حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ آدمی ذہین ہے محقق ہے ، باذوق ہے اور وسیع مطالعے کا مالک بھی ہے"

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی

اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ ۔   (داغ دہلوی)

آج بھی ماشاء اللہ نذر صابری مرحوم کی علمی محفل کی رونق جناب پروفیسر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اور ان کے دیگر نیازمندوں کے دم قدم سے قائم ہے ۔ وہی اس علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی چمن کی آبیاری اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں ۔ بہت سے نکتے اور مسائل جو اس وقت دھندلائے اور حل طلب تھے ۔ آج ان ہی حضرات کی تحقیق، سعی مسلسل اور قلمی کاوشوں سے آہستہ آہستہ آشکارہ ہو رہے ہیں ۔ قاضی زاہد الحسینی اور چودھری غلام محمد نذر صابری مرحومین کے دست ہائے فیض کرم ان کے کندھوں پر ہے اور وہ غلام جیلانی برق قدس سرہ کی مشعل علم و عقل اور معرفت ان کے لیے مشعل راہ ہے ۔

بدلہ نہ میرے بعد بھی موضوع گفتگو

میں جا چکا ہوں پھر بھی تیرے محفلوں میں ہوں

ب ۔ کتابیات (تبصرے اور مقد مے)

۱۔ ایک علمی کتاب

(جواھر اقبال ۔)

(الف) مقالہ تقریب رونمائی ؛

زیر نظر مقالہ برادرم سید مشتاق حسین شاہ کی تالیف "جواہرِ اقبال" کے حوالے سے برینز پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج حیات اباد میں منعقدہ تقریب رونمائی بتاریخ 14 جنوری 2012ء پڑھا گیا۔ اوربعد ازاں "معمار انٹرنیشنل" رسالے میں قارئین کے مطالعے اور استفادے کے لیےشائع ہوا۔ (سید چراغ حسین شاہ)

صدر عالی وقار اور معزز سامعین کرام! اہل علم کو مخاطب کرنا اور مجمعے کو مخاطب کرنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔ آپ نے بھی سُنا ہوگا کہ عظیم فلسفی علامہ اقبال اور بین الاقوامی شہرت یافتہ پہلوان رُستم زمان گاما ایک دوسرے کے بڑے دوست تھے۔ ایک سُپر نارمل ذہن کے مالک اور دوسرے سُپر نارمل جسم و وجود کے پیکر۔ ایک دن لاہور کے موچی دروازے کے باہر ایک خاصہ بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ مہمان خصوصی کے آنے کا انتظار تھا۔ سامعین کو کچھ دیر مشغول رکھنے کے خاطر علامہ اقبال صاحب نے عظیم پہلوان سے درخواست کی کہ وہ حاضرین سے خطاب فرمائیں۔ پہلوان بہرِ خاطر احباب بادلِ ناخواستہ اُٹھے اور بڑی مشکل سے یہ چند الفاظ کہہ سکے۔ "بھائیو! صبح سویرے اُٹھیں، خوب کسرت اور خوب ورزش کریں۔ ڈنڈ نکالیں تاکہ آپ کی صحت اچھی ہو۔" یہ چند باتیں کرنے کے بعد یہ عظیم پہلوان سٹیج سے نیچے اُترا۔ حالت یہ تھی کہ سارا وجود پسینہ پسینہ تھا۔ بعد میں اس ناقابلِ تسخیر پہلوان نے دوستوں کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ کسی اکھاڑے

میں اتنا پسینہ مجھ سے نہیں نکلا جتنا آج کی تقریب میں یہ چند الفاظ بولتے ہوئے۔ جو کچھ مجھ پہ گزری سو گزری۔

۱۔ عزیزانِ گرامی! حقیقت یہ ہے کہ ایک ابنارمل (غیر معمولی) کارنامہ سرانجام دینے کے لیے پسینہ بہانا ایک ضروری امر ہے۔ انتھک اور مسلسل جدوجہد کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ خدائی کا حصول ہو یا بندگی کا انعام دونوں مقامات و انعامات تک پہنچنے کے لیے دردِ سر اور دردِ جگر کی کلفتیں سہنی پڑتی ہیں۔ اقبال کے یہ دو اشعار کافی مدت کے بعد محترم دوست محمدخان صاحب کی زبان سے ایک بار پھر گوش گذار ہوے۔

خدائی اہتمامِ خُشک و تر ہے

خداوندا ! خدائی دردِ سر ہے

و لیکن بندگی استغفراللہ

یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اقبال کو اپنا یہ مقامِ بندگی اتنا عزیز تھا کہ فرماتے ہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

گرچہ اس بندے اور خاکسار کا ذاتی رجحان اور نظریہ مندرجہ ذیل شعر میں زیادہ صحیح منعکس ہوتا ہے۔

خدا مجھے ایسی خدائی نہ دے

کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

۲۔ اقبال (رح) اگرچہ اپنے کلام میں عمل پیہم، جدوجہدِ مسلسل اور تب و تابِ جاودانہ پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ سخت آرام طلب، اکثر بیمار اور سُست مزاج واقع ہوئے تھے۔ وَ خود ایک بار اپنا اور ٹیگور کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"Tagore preaches rest and takes action. I preach action and take rest."

ترجمہ: " ٹیگور سکون او جمود کی تعلیم دیتا ہے لیکن خود متحرک رہتا ہے۔ میں عمل اور حرکت کی تلقین کرتا ہوں لیکن خود اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ "

مشہور ہے کہ ایک دفعہ جنگ آزادی کے شعلہ جوالا راہنما مولانا محمدعلی جوھر جب جیل سے رہا ہوئے تواقبال بھی ان سے ملنے گئے۔ مولانا صاحب نے اس موقع پر انہیں مردِ تن آسان کہا ۔ اس پر علامہ اقبال نے جواب میں اپنا یہ شعر پڑھا۔

دیا اقبال نے ھندی مسلمانوں کو سوز اپنا

ایک مردِ تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا

لیکن ماشاء اللہ آج ہم سب پاکستانی تن آسان، ذہنی بیمار اور کج فکر سب کچھ ہیں۔

۳۔ علامہ کی شاعری الہامی اور ملکوتی ہے۔ بقول ایک افغان سفارت کار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک (فرشتہ) ان کی زبان پر موزوں اور مترنم الفاظ اور تراکیب رکھتا ہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اردو بھی پنجابی لہجے میں بولتے تھے۔ اس طرح ون کو فارسی زبان میں بھی تقریر کرنے کا ملکہ حاصل نہ تھا۔ دورہ افغانستان کے دوران فارسی تقریر ان کے لیے سید سلیمان ندوی صاحب نے لکھی تھی۔ خود فرماتے ہیں۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوھرِ ملکوتی

خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

۴۔ ملت اسلامیہ سحر فرنگ سے مکمل طور پر تب ہی آزاد ہوسکتی ہے۔ جب گردشِ زمانہ، سعی و عمل یا کسی صاحبسیرت و بصیرت بندہ خدا کے اعجاز کے طفیل ان میں لا الہ کے ایسے وارث پیدا ہو جائیں جو گفتار دلبرانہ اور کردارِ قاہرانہ کے مالک ہوں۔ فرماتے ہیں۔

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں

گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ

۵۔ اقبال کا بنیادی ماخذ قران پاک تھا۔ اور انسانِ کامل رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اعلی صفات تھے۔ برصغیر ھندوپاک کے بے مثال خطیب عطاء اللہ شاہ بخاری (رح) فرماتے ہیں۔ "بابو لوگو! قرآن پڑھا کرو۔ اس کی قسمیں نہ کھایا کرو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح سھی جس نے دانش فرنگ حاصل کرکے دانش کدہ فرنگ پر ھلہ بول دیا۔ اسی طرح ایک پنڈت نہرو اپنی ان سے آخری ملاقات کے ذکر میں کھتے ہیں کہ اقبال نے دنیا جہان کے فلاسفروں اور مفکرین کی شخصیات اور افکار پر بحث کی لیکن آخر میں انھوں نے یہی نتیجہ حاصل کیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی انسان کامل ہیں اور اسلامی نظام میں ہی دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔

گوھرِ دریاے قرآن سفتہ ام

شرح رمزِ صبغت اللہ گفتہ ام

٦۔ اقبال فقہ اسلامی کی جدید تدوین کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ھندوستان اور مصر کے چیدہ علماء سے رابطہ قائم کیا۔ وہ جامد تقلید اور منجمد ذہن کے خلاف تھا۔ مشہور محدث مولانا انور شاہ کاشمیری (رح) کا قول ہے " مجھ سے جتنا استفادہ اقبال نے کیا کسی مولوی نے نہیں کیا۔"

۷۔ جہاں تک مؤلف کا تعلق ہے تو وہ ایک میٹھے ماٹھے انسان ہیں۔ طویل عرصے سے کُنجشک

ہارے فرومایہ کو شاہین زادے بننے پر تُلے ہوے ہیں۔ ان کے شاگرد پشاور اور ملک کے ہر گوشے میں ماشاء اللہ پھیلے ہوےء ہیں۔ اور قوم و ملک کی مختلف حیثیتوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اقبال فنا فی القرآن تھے۔ مؤلف ہر نوجوان کو فنا فی الاقبال دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ نئی نسل کا بھی قرآن عظیم کے ساتھ ایک عملی سچا اور دائمی رشتہ قائم ہو جائے ۔

۸۔ کتاب ھذا ہر لحاظ سے شائستہ اور دیدہ زیب ہے۔ اللہ پاک ان کو اپنی خدمات کے بدلے میں دین و دنیا کی سعادتوں اور مہربانیوں سے نوازے۔ آمین ۔ شکریہ۔

(ب) مقدمہ کتاب "جواھر اقبال" (تحریر ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ)

علامہ اقبال (رح)عصر حاضر میں عالم اسلام کے سب سے بڑے اور بے مثال شاعر اور فلاسفر ہیں۔ جنھوں نے فلسفہ خودی کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ عالم اسلام کو اتحاد کی دعوت دی اور رنگ و نسل کے امتیازات کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت، فکری نظام، تخلیقی صلاحیتوں اور دینی اور دنیاوی بصیرت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اور خوش قسمت سے مسلمانوں کے ہر فرقے میں یکساں مقبول اور محبوب ہے۔ عالم اسلام کا ایک نامور عالم دین ان کے فکری اور ذہنی احسان کو

یوں سراہتا ہے۔ "اقبال" میرا سب سے بڑا روحانی سہارا ہے۔" ایرانی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی "ان کو "علی نما" کہتا ہے۔ " جو اہل بیت کے ایک انتہائی ممدوح فرقے ایک وسیع النظر مفکر کی طرف سے ان کی روحانی فکر کے لیے ایک بہت بڑا خراج تحسین ہے۔ہندوستان کے ایک عظیم صوفی گدی نشین اور صحافی خواجہ حسن نظامی (رح) جب ایک جلسے میں ان کی ایک نظم "تصویرِ درد" سنتے ہیں۔ تو بے اختیار یہ مصرعہ پڑھ کر اپنا عمامہ ان کے سر رکھ دیتے ہیں۔

"تمھارے جامِ مے کی نذر میری پارسائی ہو"

یہاں تک کہ علامہ غلام احمد پرویز بھی عقل و خرد کی گتھیاں سلجھانے کی حد تک اقبال کی فکری عظمت کے معترف اور معتقد ہیں۔ لیکن ان کی راہیں اس وقت جُدا ہو جاتی ہیں جب وہ مولانا روم (رح) کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ اور صاحب جنون بننے کی تمنا کرتے ہیں۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں

میرے مولا مجھے صاحب جنوں کردے

ایک مشہور ہندو وکیل اور دانشور پنڈت سرتیج بہادر سپرو اقبال کو "شاعر فردا" قرار دیتے ہیں۔ پشتو کے شاعر رنگ و نور غنی خان جو مشہور قوم پرست سیاستدان خان عبدالغفار خان کے فرزند اور ٹیگور

کے قائم کردہ مدرسے شکتی نگیتن کے طالب علم تھے، راقم الحروف نے خود ایک دفعہ خان غنی خان کو اقبال کے شعر سننے پر وجد کی کیفیت میں جھومتے ہوے دیکھا۔ ساتھ ہی فرما رہے تھے کہ اگر پشتو کے مشہور شاعروں خوشحال خان اور رحمان بابا (رح) کے اشعار کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جاے اور اقبال کے اشعار کو دوسرے پلڑے میں تو میں اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار کو ان عظیم شعراء کلام پر ترجیح دونگا۔

گر کبھی خلوت مُیَّسر ہو تو پوچھ اللہ سے

قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح

تُو فقط اللہ ھُو، اللہ ھُو ، اللہ ھُو

حالانکہ اقبال خود خوشحال خان کی فکر، شاعری اور شخصیت کے مداح خواں ہے۔ ان کو شاعرِ افغان شناس کہتے ہیں۔ اور "حرفِ حق بہ شوخئ رندانہ گفت" یا "حرفِ بے باکانہ گفت، ہر چہ گوید بے حراس" اور نہ جانے کن کن پیارے الفاظ میں ان کے افکار کا ذکر کرتے ہیں۔ حیدر آباد کے ایک رسالے میں "Warrior Poet of Afghans" کے عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون لکھتے ہیں۔ محترمہ خدیجہ

فروزالدین ان ہی کی ترغیب اور ہدایت پر خوشحال پر پہلا پی ایچ ڈی تھیسس لکھتی ہیں۔

علامہ اقبال (رح) کو شاعری میں اللہ تبارک و تعالی نے لحنِ عربی، سازِ عجم اور سوزِ ھندی سے نوازا تھا۔ جو ان کے محبوب الفاظ بھی ہیں اور اسکی روایت کو انھوں نے اپنے فلسفے اور فکر کی روشنی میں شاعرانہ پیکر بخشا ہے۔ تاریخِ ادب عربی کے مصنف اُستاد احمد حسن زیات لکھتے ہیں۔ "حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اسلام کا آفاقی تصور جس طرح رومی اور اقبال نے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ اس کی مثال صدرِ اسلام سے لیکر عباسی دور بلکہ جدید دور کے عربی شعراء میں بھی دستیاب نہیں۔"

بیدلؔ واحد ھندوستانی فارسی گو شاعر تھے۔ جن کے کلام کی ادبی عظمت اور فکری تفکر کو اہلِ ایران بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ملک الشعراء بہار، اقبال کو بیدل کا نعم البدل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ------
"بیدلے رفت و اقبالے رسید"

مولانا شیر محمد شرقپوری سرزمینِ پنجاب کے ایک انتہائی متشرع عالم، بزرگ اور صاحب حال سالک گذرے ہیں۔ وہ جسٹس محمد شفیع کے ماموں تھے۔ وہ ایسے شخص سے ملتے بھی نہ تھے جس کے چہرے پر شرعی داڑھی نہیں ہوتی تھی۔ اقبال بھی ان سے ملنے گئے۔ حسب معمول مریدوں اور شاگردوں

نے ان کو اندر نہ جانے دیا۔ لیکن جب پتہ چلا کہ اقبال ہیں تو ننگے پاؤں یہ کہہ کر ان کے پیچھے لپکے کہ اگرچہ یہ شخص بظاہر ریش تراش ہے لیکن اس کا باطن ایک خوبصورت باطنی ریش سے مزین ہے۔

فیض احمد فیض جدید اردو شاعری میں ایک بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے ایک فارسی تصنیف پیام مشرق کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جب ان سے استفسار کیا گیا کہ آپ تو خود اقبال کے پائے کے شاعر ہیں۔ تو انھوں نے اس خیالِ فاسد کی پُرزور الفاظ میں تردید کی اور فرمایا۔ "اقبال تو ایک بھاری بھرکم پہاڑ اور میں اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا ٹیلا ۔ میرا اور اس کا کیا مقابلہ " فرماتے ہیں۔

آیا ہمارے دیس میں ایک خوشنوا فقیر

آیا اوراپنی دُھن میں غزلخواں گزر گیا

کلام اقبال کی ایک مترجم اور مفسر ڈاکٹر اینی میری شمل نے ایک جگہ اقبال کا درج ذیل شعر بہ طور حوالہ پیش کیا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

لکھتی ہیں۔ " اس شعر میں جتنی روحانی رفاقت اور شعری نفاست ہے وہ انگریزی شاعری میں ہمیں صرف ملٹن کے ہاں ملتی ہے۔ "

علامہ اقبال بنیادی طور پر فلسفے اور قانون کے طالب علم تھے اور ا نہی دو مضامین میں انھوں نے انگلیڈ اور جرمنی کی اعلی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کیں۔ لیکن شعر گوئی کا ملکہ انہیں شروع ہی سے حاصل تھا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ان کی نظمیں شوق سے سُنیں جاتی تھیں۔ پہلے ہی مشاعرے میں انھوں نے درج ذیل شعر پڑھنے پر فارسی کے مشہور شاعر مولانا بلگرامی سے بہت داد پائی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے

قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

فلسفے میں انھوں نے کتاب " تشکیل الہیات جدید اسلام" یعنی "Reconstruction of Religious thoughts in Islam" لکھی۔ اس کتاب کے بارے میں خود ان کا قول ہے کہ اگر میں خلیفہ ھارون الرشید کے وقت میں یہ کتاب لکھتا تو اپنے زمانے کا امام غزالی (رح) ہوتا۔ لیکن شعر و فلسفے سے ان کا مقصد آدم گری اور وراثتِ پیغمبری کا حق ادا کرنا ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکوں روبرو

شعر را مقصود گر آدم گریست

شاعری ہم وارثِ پیغمبریست

نغمہ کُجا و من کُجا سازِ سُخن بہانہ ایست

سوےء قطار می کشم ناقئہ بے زمام را

اقبال دنیائے علم و ادب کی انتہائی کثیرالمطالعہ شخصیت ہیں۔انھوں نے اپنے وقت تک ماضی و حاضر کے ہر ادیب، فلاسفر و عالم کی تحریروں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ شاعری کا جوہر ان کے پاس عطیہ خداوندی تھا۔ انھوں نے اسلامی نقطہ نظر سے اس کا تجزیہ کیا اور اس کا بہترین عطر کشید کرکے اپنے اُمتِ مرحومہ کے پاس پیش کیا۔ تاکہ اس کے بدنِ ضعیف میں ایک متحرک و چُست روح گردش کرنے لگے۔ انھوں نے اس ضمن میں فلسفہ خودی کا نیا تصور پیش کیا۔ ملتِ اسلامیہ اور اقوامِ مشرق کو ان کے شاندار ماضی کی جھلک دکھا کر متحدہ اُمت کی پہچان دی۔ اگرچہ انھوں نے مشرق و مغرب کے ہر مے خانے کی تلخی و شیرینی چکھی۔ لیکن ان کی فکر کا بنیادی ماخذ قرآن پاک ہی تھا۔ انھوں نے کارل مارکس کا ذکر اگرچہ والہانہ الفاظ میں کیا ہے اور ترقی پسند انقلابی نظمیں لکھیں۔ جو آج تک کسی کٹر کمیونسٹ شاعر کے کلام میں بھی نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے عظمتِ انسانی کے لافانی گیت لکھے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں به کمند آور' اے ہمتِ مردانہ

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

غلغلئہ الاماں بُت کدہ صفات میں

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ ماہِ کامل نہ بن جاے

لیکن اس کے باوجود فقط حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وَہ انسان کامل سمجھتے تھے۔ عشق و وارفتگی شوق کی اس تُند و تیز کیفیت کا عجب پیارا انداز ان کے ان اشعار میں پوشیدہ ہے۔

تُو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روزِ محشر عُذر ہاے من پذیر

تو اگر بینی حسابم ناگزیر

از نگاہِ مصطفی پنہاں بگیر

جیسے کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اقبال کی تعلیمات کا منبع قرآن پاک ہے۔ خود فرماتے ہیں کہ اگر میں نے اپنے کلام میں قرآن پاک کے علاوہ کسی اور شے کی ترجمانی کی ہے تو قیامت کے دن مجھے ذلیل و خوار کر اور حبیب کبریا (ص) کے بوسہ پا سے محروم کردے۔ یہ ایک ایسی بد دُعا ہے جس کا تصور ایک مسلمان کو لرزا دیتا ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است در فہم غیر قرآن مضمر است

پردہ ناموسِ فکرم چاک کُن

ایں خیاباں را زِ خارم پاک کُن

روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا

بے نصیب از بوسہ پا کُن مرا

مجھے شدت سے احساس ہے کہ میں نے اپنے اس مضمون میں اقبال کے فارسی اشعار کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جبکہ مولف کتاب نے مفکر و شاعرِ مشرق کے صرف اردو اشعار کو یکجا کیا ہے۔ اور فارسی تصانیف کا ذکر اپنے پیش لفظ میں کیا ہے۔ لیکن وجہ صاف ظاہر ہے کہ ایک تو صاحب مطالعہ لوگ ہی بہت کم ہیں۔ فارسی زبان اب اس علاقے سے معدوم ہوچکی ہے۔

ہمارے ملک کا طبقہ اشرافیہ تو اب اردو زبان سیکھنا اور بولنا بھی ضیاعِ وقت گردانتا ہے۔ جہاں تک دیکھیے انگریزی کی حکمرانی ہے۔ اردو اب قومی زبان کی بجاے فقط رابطے کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری اب صرف قوالی تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبال کی جامعیت سے حکمران طبقہ ناجائز فائدہ بوقتِ ضرورت اٹھاتا ہے۔ جمہوریت پسند، فاشسٹ، حتی' کہ دہشت گرد سب اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

برادرم سیّد مشتاق حسین بخاری نے وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اقبالؒ کا اردو کلام یک جا کرکے پیش کیا ہے۔ اقبال کی نظر میں مثالی نظام حکومت نہ مغربی جمہوریت ہے اور نہ مشرقی مطلق العنانیت ۔ صرف خلافت راشدہ کا نظام ہی ان کی تمنا ہے۔ وہ ملت مرحومہ کی شکست و ریخت کا مرثیہ خوان بھی ہے اور اس کی نشاط ثانیہ کا حُدی خوان بھی۔ وہ ایک روحانی دولت مشترکہ کے قیام کا خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال نے اس بارے میں اپنے متنوع خیالات اور تصورات کا اظہار اپنے اردو اورفارسی اشعار میں جامعیت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی اردو شاعری اب صرف پاکستانیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جبکہ فارسی کلام تمام عالمِ اسلام کے لیے ہے۔

عزیزم سید مشتاق حسین بخاری سکول ہی کے زمانے سے کلام اور شخصیت اقبال کے پرستار، عقیدت مند اور طالب علم رہے ہیں۔ ان کے اس ادبی اور فکری شوق کو جلا بخشنے اور پروان چڑھانے میں ان کے ایک استاد اور دو صاحبانِ ذوق بھائیوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔خوش قسمتی سے ان کا گھریلو ماحول بھی دینی، مذہبی اور روحانی اقدار کا حامل تھا۔ والد صاحب محترم ایک جید عالم، صاحب بیعت و ارشاد بزرگ اور سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔ کلام اقبال دینِ اسلام کی ایک جدید تفسیر ہے۔ اور اسی پیغام کی بنیاد پر مملکت خدا داد پاکستان اور نظریہ

پاکستان وجود میں آیا۔اور اسی نظام کی قیام میں پاکستان کی بقا مضمر ہے۔ بانیء پاکستان محمد علی جناح نے اپنے الفاظ میں۔

“To me, he was a friend, a guide and a philosopher. He stood by me like a rock when everybody in India abandoned me.” اس طرح یہ سب باتیں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ محترم مولف کو اپنی طویل معلمانہ زندگی کے دوراں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہماری نسل اپنے اس عظیم روحانی ورثے سے تقریبا محروم اور نابلد ہوتی جارہی ہے۔ اُمید ہے اشعار کہ یہ گلدستہ ہمارے بے بال و پر شاہینوں کے لیے بانگ درا اور بال جبریل ثابت ہوگا۔ علامہ مرحوم کے کلام کے ساتھ ایک اور المیہ بھی اکثر پیش آتا ہے کہ اہلِ غرض ان کے چند اشعار کو سیاق و سباق سے الگ کرکے دہراتے رہتے ہیں۔ تاکہ حسبِ خواہش اپنے منحرف خیالات و افکار کے لیے تائید و جواز فراہم کر سکیں۔ بخاری صاحب نے انکے سارے افکار کو جو اردو شعر و نغمہ کی صورت میں ان کے تصانیف میں بکھرے ہوے ہیں، سب کو یکجا کرکے شائع کر دیا۔

اس طرح قاری کے لیے علامہ اقبال کے خیالات اور پیغام کی اصل روح تک رسائی سہل بنا دی۔ یہ کام انھوں نے جذبہ ایمانی، عقیدہ راسخ اور اقبال کے ایک شیدائی کے طور پر سرانجام دیا ہے۔ خدا کرے ان کی یہ کوشش ان کے لیے دنیا و دین میں سعادت

کا باعث بنے۔ اس کتاب کا ایک ایک نُسخہ ہمارے جواں سال اور سال خوردہ شاہینوں کے مطالعہ اور راہنمائی کے لیے ہر لائبریری، مسجد، خانقاہ اور دفتر کی زینت بنے۔ آمین۔

اقبال فنا فی القرآن تھے۔ مؤلف ہر جوان کو فنا فی الاقبال دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ نئی نسل کا بھی قرآن عظیم کے ساتھ ایک عملی، سچا اور دائمی رشتہ قائم ہو جائے۔

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم

مرا یاران غزل خوانے شمردند

ریاضِ حکیم خانی

بین کہ باہم این پیری و پریشانی

دلم کشید بہ سر ریاض حکیم خانی

حکیم خان مروت ایک دردمند ملی وجود، قوی قومی شعور اور سیاسی و سماجی سوجھ بوجھ اور بصیرت کے حامل ایک پیاری شخصیت ہیں۔ آغازِ ملازمت میں ہی ان کو بیگوخیل کے خان عالی جاہ صاحب کی صحبت نشینی کا موقع ملا۔ خان صاحب مروت قوم کی تاریخ، شجرہ نسب اور ان کی مخصوص شعری

صنف "کسرونو" پر ایک اتھارٹی سمجھے جاتے تھے اور اس بارے میں ان کے دستاویزات اور معلومات کا ایک وافر ذخیرہ موجود تھا۔ حکیم خان صاحب کے لیے انکی ہم نشینی اور خیالات کا تبادلہ ایک مہمیز کا کام کر گئی۔ جس نے ان کے شوق اور تاریخ سے رغبت کو ایک نئی جلا بخشی۔ بعد میں مولف کو دورانِ ملازمت بعض دوسرے علمائے تاریخ اور ادباء و شعراء کرام کے ساتھ بھی بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ساتھ ہی وہ خود بھی ایک کثیر المطالعہ اور وسیع المشاہدہ حساس انسان ہیں۔ ان کو اس حقیقت کا بھی شدت سے احساس تھا کہ کسی قوم، ملک یا علاقے کی تاریخ لکھنا اتنا اسان کام نہیں ہے۔ مستند تاریخی دستاویزات بہت ہی کم ہیں۔ ضعیف اور ناقابل یقین روایات کا ایک گورکھ دھندا ہے۔ التباسات اور اشتباہات کی گرد نے اصل واقعات کا حُلیہ بگاڑ دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مولف نے ہمت نہیں ہاری اور سالوں کی محنت آخر رنگ لائی اور آج 600 صفحات سے زائد تاریخی مواد اپ کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخ کی ایک عام تعریف یہ ہے کہ ابتدائے افرینش سے اس وقت تک ساری دنیا میں جو کچھ ہو چکا ہے یا جو محسوس کیا گیا ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے یا محسوس کیا جا رہا ہے، تاریخ ہے۔ مشہور عالم اور تاریخ دان جناب صفدر محمود علم تاریخ کی افادیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔ "تاریخ کسی قوم کا

قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ اور جو قوم اپنی تاریخ فراموش کردیتی ہے۔ اس کا جغرافیہ اسے فراموش کر دیتا ہے۔ تاریخ کا مطلب محض داستان گوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ تاریخ ماضی کا بے باک اور غیر جذباتی تجزیہ پیش کرتی ہے۔ جس کی روشنی میں آئندہ نسلیں اپنی راہ متعین کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے مورخ کا کردار اس معالج کا ہوتا ہے جو مرض کی تشخیص کرتا ہے اور علاج بھی تجویز کرتا ہے۔" آج سے صدیوں پہلے ایک نابغہ مسلمان مدبر نظام الملک طوسی علم تاریخ کی افادیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔ "تاریخ کو تدبیرِملکی میں بہت کچھ دخل ہے۔ کیونکہ عالمِ اسباب میں کبھی کسی نئے واقعہ کا ظہور نہیں ہوتا بلکہ وہی ہوتا ہے جو بار ہا ہو چکا ہوتا ہے اور جس کے مظاہر موجود ہیں۔ اور چونکہ پچھلے واقعات پڑھے ہوۓ، سمجھے ہوۓ، سُنے ہوۓ ہوتے ہیں کہ فلاں کام کا خاتمہ یوں ہوا تھا۔ لہذا جب کوئی ایسا ہی معاملہ سامنے آتا ہے ---- تو یقین رکھو کہ اسکا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ "

فاضل مصنف نے علم تاریخ کے ان ہی اصولوں اور مؤرخین و مُدبرین کے ان ہی اخذ کردہ نتائج کو مد نظر رکھ کر مروت قوم کی یہ تاریخ لکھی ہے۔ اس ضخیم تالیف کا سب سے اہم حصہ وہ شجرہ ہائے انساب ہیں جو مؤلف کتاب نے صیغہ مال کے کاغذات اور علاقہ مروت کے مختلف دیہات کی مثل حقیّتوں کے بیانات کو مد نظر رکھ کر مرتب کیا

ہے۔ اھلِ عرب کے ہاں پرانے زمانے میں علم الانساب کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ حضرت عمر (رض) کے بارے میں روایت ہے کہ وہ انسانوں کے سلسلہ انساب کے علاوہ گھوڑوں کی نسب کے بھی حافظ تھے۔ اھل عرب جب اپس میں متعارف ہوتے تو ان کے سب سے پہلے سوالات ایک دوسرے کے نسب اور قبیلے کے بارے میں ہوتے۔ صرف ان ہی دو سوالات سے وہ اجنبی کے طول و عرض کو ناپ لیتے تھے۔ کیونکہ ہر قبیلے کے افراد میں چند مخصوص اوصاف پائے جاتے اور ان کی قدر و منزلت ان کے معلوم اوصاف پر بمنی ہوتی تھی۔ اگرچہ اج کل کے مادہ پرستانہ ماحول میں اب علم الانساب قابلِ توجہ نہ رہا۔ کیونکہ اختلاط نسل اب عام ہوچکا ہے۔ اور شجرہ نسب کی وہ سابقہ اہمیت اب باقی نہیں رہی۔ لیکن اس کے باوجود اہلِ مغرب اب بھی اپنے سلسلہ نسب اور شجروں کے ذکر کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ 2011 ء میں راقم الحروف کو اِسکاٹ لینڈ میں چار مہینے تک رہنے کا اتفاق ہوا۔ جس علاقے میں رہائش پذیر تھا وہاں زیادہ تر طبقہ شرفاء کا قیام تھا۔ علاقے کا نام بیئرز ڈن تھا۔ میں وہاں کی مقامی مرکزی لائبریری میں کبھی کبھی جاتا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں وہاں ہفتہ تاریخ منایا جا رہا تھا۔ سامنے فولڈنگ تختیوں پر پوسٹر چسپاں تھے۔ جن پر مقامی قابلِ ذکر افراد کے ابا و اجداد کی تاریخ' شجرے اور تصویریں آویزاں تھیں۔ ان کے اجداد کون تھے؟ کس سن میں کہاں سے آےء تھے؟ کونسا

کاروبار کرتے تھے؟ اولاد میں کون کون مشہور شخصیتیں گزری ہیں؟۔ انگریز شرفاء اپنے شجروں پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ ان کے نام کے تین حصے ہوتے ہیں۔ اول عیسائی نام آتا ہے۔ جیسے تھامس۔ دویم مڈل نیم یا ذاتی نام ہوتا ہے۔ اور تیسرا آخر میں خاندانی نام ہوتا ہے۔ جب کسی کے ساتھ زیادہ آزادی ہوجاتی ہے تو وہ ذاتی نام سے پکارتا ہے۔ ورنہ عموما لوگ خاندانی نام سے پکارتے ہیں۔ یوں انگریز اپنے نسبی شجروں ۔ بنیادوں یا جڑوں (روٹس) کی تلاش میں کافی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس سلسلے میں خوب تحقیق اور تالاش سے کام لیتا ہے۔ لائبریری میں جینیالوجی (علم الانساب) کے بارے میں کافی کتابیں اور کتابچے دستیاب تھے۔ اور ان کے سر ورق پر اس قسم کے عنوانات درج ہوتے تھے۔ (اپنی جڑوں کا سراغ لگائیں وغیرہ) ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند سال پہلے پشتو اکیڈمی کے رسالے "پشتو" میں ایک مضمون باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ "اپنے شجروں کی تصحیح فرمائیں" اور یہ سلسلہ مہینوں قسطوں میں چھپتا رہا۔

انگریز قوم اپنے شاہی خاندان کے شجروں میں بھی کافی دلچسپی لیتی ہے۔ جن دنوں میں سکاٹ لینڈ میں تھا۔ شہزادہ ولیم اور شہزادی کیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ وہاں کے اخبار اور رسائل شہزادی کے پدری اور مادری شجروں کے سلسلوں سے بھرے پڑے ہوتے تھے اور اس موضوع سے بھرے ہوتے

تھے۔ اور اس سلسلے میں کافی تحقیقی مواد شائع ہوتا تھا۔ شہزادی کے دو تین پُشت پہلے کے جدامجد لوہار تھے۔ ساتھ ہی میرا ذاتی مشاہدہ یہ تھا کہ پاکستانی نژاد برطانوی نوجوان اکثر اپنی نسل اور قومیت کے رشتے چھپاتے تھے۔

فاضل مولف اگر اس تالیف میں صرف مروت قبیلہ {جو چونڈا (ڈیرہ اسماعیل خان) سے سرائے نورنگ اور ملازئ (ضلع ٹانک) سے لیکر درہ تنگ تک بھیلا ہوا ہے} کے مختلف شاخوں کے مفصل شجرے محفوظ کر لیں تو یہی ان کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جائیگا اور مروت قبیلے کا ہر فرد اسے ایک متبرک دستاویز سمجھ کر اپنے پاس رکھے گا۔ اور وقت کے ساتھ اس میں اضافے اور ترمیمات کرتا رہیگا۔ فی الوقت یہ ایک نامکمل کرسی نامہ ہے۔ اور تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہرحال یہ مشقت اور محنت بھی کچھ کم اہمیت اور قیمت کی حامل نہیں ہے۔ مستقبل میں آنے والی نسل کے لیے یہ ایک بنیادی دستاویز۔ حوالہ اور مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

اب آتے ہیں اس مسودے کے تاریخی ابواب کی طرف۔

1. مروت قوم کی وجہ تسمیہ ؛

(1)۔ مروت قبیلے کی شرافت اور نیک نیتی ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ ایک ویدی روایت ہے کہ قدیم آریائی لوگ جب اپنے نئے سردار کا انتخاب کر لیتے تو سب سے پہلے

اسے مروت قبیلے کی شرافت کی قسم اُٹھانی پڑتی۔ ساما ئی قبائل سے میل جول کے بعد اس قصے نے ماروت کی شکل اختیار کرلی۔ شاہ حسین کا فرشتہ صفت زہد و تقوی اور بعد میں انسانی فطرت کے تحت ایک گناہ کا ارتکاب اور پھر علاقہ مروت جیسے بے آب و گیاہ اور اکثر سخت دُھند کے جکڑوں اور گرد و غبار میں شدید ریتلے مرغولوں کی سرزمین والے علاقے میں اس کی اولاد کا بطور سزا مستقل آباد ہونا اس آبائی گناہ کی طرف ایک استعاراتی اشارہ ہے۔

(2)مروت قبیلے کو مکہ معظمہ کی ایک مقدس پہاڑی "مروہ" سے منسوب کیا گیا ہے۔ اثر و تاثیر کا عمل اگرچہ زبانوں میں عام بات ہے۔ لیکن یہ دونوں نظریے مجھے دور از کار تاویلات معلوم ہوتے ہیں۔ اس دعوے کے لیے سند یا ماخذ فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ قرین از قیاس باتیں صرف دو ہیں۔ (الف) مروت قبیلِہ کے جد امجد کا نام مروت تھا۔ (ب) کٹہ واز (ملک افغانستان) میں ایک پہاڑ کا نام "مروتی " ہے، زمانہ قدیم میں وہاں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے مروت مشہور ہوے۔ (بحوالہ ۔ بنوں اور وزیرستان کی تاریخ ۔ مصنف گل ایوب سیفی)۔

(3)قاضی عبدالحلیم اثر مرحوم اپنے ایک مقالے میں لودھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 24 ھ میں جب مسلمانوں نے کابل پر حملہ کیا تو وہاں لونیکہ خاندان کی حکومت تھی۔ لونیکہ۔ لوزی۔ لوزئ یا لودھی، لاوی بن یعقوب(ع) کی نسل کے لوگ تھے۔ شاہ حسین

کے بارے میں خیال ہے کہ ان کا تعلق علوی خاندان سے تھا۔ اس خاندان نے پانچ چھ نسلوں تک علاقہ نور پر حکومت کی۔ افسوس! فاضل اثر صاحب کی تحقیق بوجوہ کئی مورخین کے نزد قابل اعتبار نہیں۔

(ii) کُتب مخزن افغانی اور حیات افغانی کے مطابق مروت لودھیوں کے زمانے میں علاقہ ٹانک اور دامان پر قابض ہوے۔ اس سے پہلے بلوچ اور سرنگ یہاں آباد تھے۔ دی کاسٹس آف پنجاب کے مصنف سر ڈینزل ایبٹس اس سے متفق نہیں۔ وَہ لکھتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں لوہانی ٹانک پر قابض ہوے اور سور اور پڑنگی قبائل کو ہندوستان کی طرف جانے پر مجبور کیا۔ شیرشا ہ کے زمانے میں مروت نزد بئینہ ۔ پیزو اور شہبازخیل کی پہاڑیوں میں مقیم تھے۔ اور یہاں سے ٹانک کو حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ موجودہ لکی مروت میں دریاے گمبیلا سے مشرق کی طرف کا علاقہ کافی عرصہ بعد مروتوں کے قبضے میں آیا۔ خوشحال خان نے بھی مروتوں کی بجاےء لوہانیوں کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مروت اس وقت اپنے موجودہ نام سے مشہور نہ تھے۔ اس سے بہت پہلے بابر نے بھی اس علاقے میں نیازیوں کا ذکر کیا ہے۔

(4)مولف کا شہبازخیل شاخ کے بارے میں یہ انکشاف کم از کم میرے لیے ایک نئی بات ہے کہ وہ وصلی مروت ہیں۔ ویسے میں نے شہبازخیل کے نزدیک ایک شاخ حیات خیل کے متعلق سنا ہے کہ وَہ وصلی مروت ہیں۔ معاملہ مزید تحقیق طلب ہے۔

(5)سپین اور تور گُند (سفید اور سیاہ گروپ) کی ابتداء اور ان کے مابین شدید نفرت اور دشمنی کا ذکر فاضل مصنف نے قدرے اختصار سے کیا ہے۔ ان کے خیال میں اس کی ابتداء بنگشوں سے ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موضع بلندخیل علاقہ بنگش میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر دو گنبدیں ہیں۔ مقامی لوگ ایک کو سپین خاخ بابا اور دوسرے کو تور خاخ بابا کہتے ہیں۔ سپین خاخ سے منسوب گنبد کے اندر راقم الحروف کے بارویں پشت میں جد امجد حضرت پیر سباک(رح) آرام فرما ہیں۔ (حوالہ تاریخ کُرم و ٹل از اسیر منگل) مزید یہ وضاحت بھی کرتا جاؤں کہ صفحہ 589 پر فاضل مصنف نے بنوں اور لکی کے قبائل کے ساتھ سکھوں کی لڑائیوں مین پھولا سنگھ نہنگ کا ذکر کیا ھے۔ واضح رھے کہ یہ سفاک اور ظالم سکھ جنگجو 1823 ء میں پشتونوں کے ساتھ ایک جنگ میں راقم الحروف کے اجداد کے ہاتھوں مارا گیا۔ موضع پیر سباک (نوشہرہ) میں آج تک زرعی تحقیقی مرکز کے اندر اس سکھ نہنگ کی سمادھی موجود ہے۔ اسی طرح تواریخ رحمت خان (جو اس کتاب کی ماخذ میں سے ہے) بھی پیر سباک (رح)

کے پانچویں پُشت میں انکے پوتے پیر معظم شاہ(1181ھ) کی تصنیف ہے۔

(6)مروت قوم کے مورث اعلی شاہ حسین ضحاک کی اولاد سے تھا۔ شجرہ نویسوں نے یہ نام ضحاک تازی لکھا ہے۔ انسائکلوپیڈیا کے مطابق ضحاک، سہاک یا اجی دھاک ملکِ شام کا ایک افسانوی شہزادہ تھا۔ ایرانی بادشاہ جمشید کو شکست دے کر تخت ایران پر قابض ہوا۔ ضحاک کے کندھوں پر دو اژدھے ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ ضحاک کے خلاف کادہ نامی لوہار نے انقلاب کا پرچم بلند کیا۔اور اس کو آگ میں پھینک دیا گیا۔ اور فریدون کو تخت پر بٹھایا۔ جدید مورخین اور محققین کا خیال ہے کہ ضحاک سامی نسل سے نہ تھا۔ بلکہ نسلا" سُمیرین تھا۔ اور سُمیرین موجودہ ھندوستان کے شمال مغربی پہاڑوں کے لوگ تھے۔ ایرانی روایات کے مطابق ضحاک کی بادشاہت کا عرصہ ایک ہزار سال تھا۔ ظالم، بدصورت اور دائمی دوزخی یاد کیا گیا ہے۔ زرتشتی مذھب کا سخت مخالف تھا۔ ضحاک عربی میں "زیادہ ہنسنے والے" کو کہتے ہیں۔ اور اجی دھاک قدیم فارسی میں سانپ کے لیے مستعمل ہے۔ اس طرح ایرانیوں اور پشتونوں کی دُشمنی بھی صدیوں پر محیط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر قوم اپنی مخالف قوم کے هیروز کو ایسے ہی بُرے القابات سے نوازتی ہے۔

(7)فاضل مصنف نے اپنی تالیف میں کہیں بھی "خواص خان ولی" کا ذکر نہیں کیا۔جو شیر

شاہ سوری کا امیر الامراء تھا۔ "نوابان ٹانک" کی ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ مروتوں کی خانی خواص خان کے پاس ہے۔ خواص خان کے دو بیٹے تھے۔ شیرخان اور میرخان۔ شیرخان کی اولاد سے میدادخیل ہیں اور میرخان کی نسل میں ازغر(اذر) خیل ہیں۔ یوں میدادخیلوں کی خانی شیرشاہ کے وقت قائم ہو گئی تھی۔ بیگوخیلوں کو خانی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں سے پانی پت کی تیسی جنگ کے بعد ملی۔ جبکہ میناخیلوں کو انگریزوں نے انیسویں صدی کے آخر میں (اغلبا 1896 ء کے لگ بھگ) خان کے لقب سے نوازا جب ان کے جد امجد حکیم خان نے لکی قلعہ فتح کرنے کے موقع پر سکھوں کے خلاف میجر ٹیلر کی مدد کی (بنوں کا گزیٹئیر) ۔

(8)احمدخیل شیخ احمد روحانی(رح) کی اولاد سے ہیں۔ "مخزن افغانی" کے لکھے کے مطابق بیٹھنی افغانوں میں سے تین احمد نام کے بزرگ گزرے ہیں۔ (شیخ احمد لودھی اور شیخ احمد شون لوحانی(رح) اکبر بادشاہ کی بادشاہت کے آغاز میں گذرے ہیں۔ آخر الذکر شیخ احمد شون لوحانی کو شیخ احمد افرین یاد بھی کہا گیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بنوں (کوٹی سادات) اور لکی مروت میں آباد دیگر جو سید شیخان احمدخیل آباد ہیں وَہ اس شیخ احمد روحانی(رح) کی اولاد ہیں۔ جن کے حکم پر بنوچی قبیلہ منگل اور بنی قبائل پر حملہ آور ہوا اور یہ تیمور لنگ کا زمانہ تھا۔ (1394 ء) ۔ یاد رہے کہ ان

احمدوں میں صرف شیخ احمد سروانی(زندہ پیر) شیخ بہاالدین ملتانی(رح) (متوفی 661 ھ) کے خلیفہ تھے۔ اسی طرح نیازی قبیلہ کی ایک شاخ بھی موضع خڑو کورونہ لکی مروت نزد درہ تنگ آباد ہے۔ محترم ماسٹر غلام رسول نیازی اسی احمد خیل شاخ کے گلِ سر سبد ہیں۔ میرے خیال میں ان میں سے شیخ احمد شون لوحانی(رح) کا نام امتدادِ زمانہ سے بگڑ کر احمد شاہ روحانی (رح) مشہور ہو گیاہے۔ ان کے اصلی اور وصلی سیّد اور پشتون ہونے کے بارے میں تحقیق کا میدان آج بھی مورخین کے لیے کھلا پڑا ہے۔

(9)اب شہید خیلوں کو بھی "تاریخ ٹانک" کے مصنف نے "درے پلاری" مروتوں میں سے ایک نیک بزرگ دولت شاہ کی اولاد لکھا ہے۔ جبکہ شجرہ نسب میں ان کو سیّد بخاری بتایا گیا ہے۔ حاجی غلام حسن خان مرحوم دلوخیل کے شجرے میں یہ گیلانی حسنی سیّد ہیں۔ عقاب خٹک مرحوم کے پاس بھی ایک دستاویز تھی جس میں چار بھائیوں کا ذکر تھا (1) خواجہ لا بابا (رح) (خواجہ لا یا خواجہ الدولا) جن کا مزار اقدس بنوں کے قریب دریائے کرم کے کنارے واقع ہے۔ (2) سرود نیکہ (رح) (سراج الدولہ سہروردی ، تخت نصرتی کرک (3) دولت شاہ ابا شہید اور (4) خولگی شاہ (علاقہ کُرم)۔ ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ "خواری درستی کولہ برخہ ابا شہید یووڑہ " (محنت درستی نے کی اور فائدہ ابا شہید کے حصے میں

آیا) روایت ہے کہ درستی ابا شہید کے بھائی تھے۔ اس طرح یہ پانچواں بھائی ہوا۔
ان میں سے خواجہ لا بابا اور سرود نیکہ کے شجرے میں نے دیکھے ہیں۔ جو حسینی سادات کی دو الگ الگ شاخوں سے متعلق ہیں۔ بھرحال یہاں بھی محققین کے لیے طبع ازمائی کا کافی سامان موجود ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ان پانچوں بزرگوں کی ارواح مقدسہ اس معاملے میں بحکم حق تعالی محقق کی دستگیری فرمایں گی۔" ابا شہید بابا مد د کرامت دے رارسیژه "

(10) محترم حکیم خان صاحب نے مروتوں کے "خولو ویش" (تقسیم اراضی) پر بھی مفید بحث کی ہے۔ جس طرح شیخ ملی (رح) نے یوسف زیوں (خادیزیوں) اور غوری خیل قبائل کے مابین زمینوں کی تقسیم کی۔ (ویش۔ دفتر شیخ ملی) خٹک قبائل کے لیے یہ کارنامہ خوشحال خان خٹک نے سرانجام دیا ہے۔ یعنی مروت قبیلے میں تقسیم اراضی کا یہ مفید اور فی زمانہ بہترین بندوبست اراضی کا سہره ملک قتل خان موسی' خیل کے سر ہے۔ جو نیازیوں کے ساتھ ٹھٹی مچن خیل کے مقام پر آخری جنگ کے موقع پر سارے قبیلے کا سردار اور امیر لشکر تھا۔ (استاد اسلانوف کی تحقیق کے مطابق ویش کا یہ طریقہ پہلے اُرمڑ قبیلے میں رائج تھا)
(11) فاضل مولف ھی کی تحریر سے مجھے لکی شہر پر سوہان خان وزیر

(1780ء) کے حملے کے واقعے کی تفصیلات معلوم ہوئیں کہ ایسی جرات سوہان خان نے صرف اپنوں کی مدد سے کی۔ اور ویسی ہی بے اتفاقی اور بدبختی کا سامنا مروتوں کو مالک راۓء کی یلغار کے وقت بھی کرنا پڑا۔

اے باد صبا این ہمہ اوردۂ تُست

پشتو کا زمانہ۔ مغلوں کے زوال سے لیکر سکھ شاہی کے خاتمے تک کے زمانے کو مروت اپنی زبان میں پشتو کا زمانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ مرکزی حکومت کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے پشتو رواج ہی پشتونوں کا قانون اور ضابطہ حیات تھا۔ دلاوری، سخاوت اور ننگ و ناموس کی ساری داستانیں اسی وقت کی پیداوار ہیں۔ مروتوں کی مخصوص عوامی صنف شاعری ''کسر'' کے خالق دوران، جرس، میرھوس،لاجمیر اور نورمحمد تقریبا اسی دور میں گذرے ہیں۔ فاضل مولف نے نسلی پشتونوں کے علاوہ اپنے علاقے کے زرگروں، دھوڑان، ملاخیل، قریشوں اور سرودیان وغیرہ کے شجرہ نسب اور تاریخی حالات لکھ کر ایک منفرد اور قابل ستائش فریضہ سرانجام دیا ہے۔ یہی ھُنرمند اور عالم و فاضل افراد ایک قوم کا تہذیبی، ادبی، علمی اور مذہبی اثاثہ ہوتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کی تشکیل میں جنگجو افراد سے زیادہ انہی لوگوں کا حصّہ ہوتا ہے۔ جنھیں ہمارے اکثر مورخ نیچ، کمی اور غیر افغان سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جبکہ ایک ترقی یافتہ، متوازن اور پُرامن معاشرے میں یہ لوگ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی جرس، نورمحمد،

میرھوس اور گُل ھوس ہماری پرانی شاعری، روایات۔ عقیدوں اور تاریخ کے محافظ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر مصنف اس کتاب میں مروت قبیلے کے رسم و رواج، طرز بودوباش، کھیل تماشے و تفریح، صنعت و حرفت، ہُنر و فنون، مذھبی عقائد، تھذیب و تمدن، علم و ادب، شاعری اور طرز و اطوار پر بھی بحث کرتے۔ دلوخیل کے پرویز مروت نے صرف مروت قبیلے کی شادی بیاہ کی رسومات پر ایک مکمل معلوماتی کتاب لکھی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ''کسروں'' پر پوری تفصیل سے کام کیا ہے۔ بنوں کے پروفیسر شمشیر علی خان نے متعدد کسروں کو اردو جامہ پہنایا ہے۔

مولف نے علاقہ مروت میں مغربی تعلیم کی کمی کا بجا طور پر رونا رویا ہے۔ لیکن ہمارے زرین علمی و ادبی ماضی کی چند اھم شخصیات کو بھول گئے ہیں۔ مذھبی اور صوفیانہ شاعری میں موضع بدنی خیل کی بی بی گُلہ (رح) ، گاوں میداد خیل میں دیوان جلالی کا خالق جلال دین استاد، فارسی کا بے بدل شاعر سعدی زمان بلبل مروت رضا خان المعروف رضوگُل، مروت قبیلے کا پہلا گریجویٹ جنگ آزادی کا مجاھد اور جمھوریت پسند مظفرخان ساکن سمندر تترخیل ، مسافر مروت، عمرخانی خیل، مصنف مثنوی حُسن و دل اور اس طرح کی اور۔ ہمارا عظیم اثاثہ ہیں۔ ساتھ ہی خوانین تختی خیل سوران خان اور دُرانہ خان کی علم دوستی اور علماء کی قدردانی بھی قابل یاد اور لائق ستائش ہے۔

فاضل مصنف نے تحریک خلافت کے دوران مروت قبائل کی سرفروشی، مالی قربانیوں اور تکالیف کا ذکر کیا ہے۔ (یہاں پر میں بیرے فقیر کے دست راست ملک اکرم خان سپرلی خیل مرحوم کے وسیع جائداد کی قُرقی اور اس پر قبضہ مخالفانہ کا ذکر کروں گا) بے شک ان مخالفین کے خلوص ، جذبہ ازادی و ایمانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن امیرکابل کا بعد میں ان کے ساتھ ؑخود غرضانہ برتاوء اور مطلب پرستانہ سلوک و رویئے کے لیے ہمیں عبیداللہ سندھی (رح) کی تحریریں اور میاں اکبرشاہ بدرشی کی کتاب ''ازادی کی تلاش میں'' ضرور دیکھنی چاہیے۔

نورنگ خان گنڈہ پور کی حسرت اور ارمان بھری داستان کو ہم ایک فقیر کی بد دُعا کا اثر سمجھیں یا انگریز سرکار کی حکمت عملی۔ بھرحال یہ اس فانی دنیا کا ایک عبرت آموز واقعہ ہے۔ حکیم خان کے اس تاریخی مسودے سے ہمیں جان نکلسن کے خطوط کا سُراغ ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی انے والے محقق کی تلاش و تحقیق کے بعد انگریزی ادب کے یہ شاہکار جواہر پارے ہمارے ہاتھ لگ جائیں۔ مولف نے اس مسودے میں مروت قبیلے کو اتفاق، تعلیم اور خودشناسی کی تلقین کی گیٔ ہے اورجا بجا وعظ و نصیحت کا رنگ نظر اتا ہے۔ یہ مروت ضرب المثل ہر قاری کی زندگی میں مشعل راہ ثابت ہوگی۔ '' الحمدللہ ہر چوک وائی خو خُلہ د مُلا عثمان غواڑی''۔

اس کتاب کے اخری چند ابواب جس میں عسکریت پسندوں اور اغواکاروں کے اتحاد ، فنڈز کے حصول اور طریقہ کار پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ اج اگرچہ غیر متعلقہ

اور غیر ضروری اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ائیندہ نسل کے لیے یہ ایک چشم دید تاریخ اور تحقیقاتی رپورٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگرچہ کتاب جدید تحقیقی طریق کار پر نہیں لکھی گئی ہے لیکن پھر بھی حکیم خان صاحب نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ مروتوں کی تاریخ بغیر کسی تعصب غیر ضروری تنقید و تلقین، غیرمتوازی بے جا تعریف یا جانبداری کے ایک کُھلے ذہن اور روشن دلی کے ساتھ لکھی جاے اور میرے خیال میں وہ اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوےء ہیں۔ فصیح الملک مرزا صنعائی شیرازی کے درج ذیل شعر میں اگر میں میر احمد شاہ رضوانی کی روح جلیلہ سے بعد بصد معذرت کے رضوانی کی جگہ حکیم خانی کی ترمیم کرلوں تو شاید میں ان کے کام کو بہتر و مناسب خراج تحسین پیش کرسکوں۔

بین کہ با ہم این پیری و پریشانی

دلم کشید بہ سر ریاض رضوانی

رہبر دین متین پیر زین الدین (رح)

[مضمون هذا کتاب ''بضع و اربعین'' مرتب کردہ سید زین الدین بخاری (رح) کے اردو ترجمہ از سید محمد ایوب بخاری کا پیش لفظ ہے۔]

در دفتر زمانہ قند نامش از قلم

ہر ملت کہ مردم صاحبِ قلم نداشت

تقریباً سب کتابوں بشمول ان کی تصنیف، کتب مناقب، شجروں اور مثلِ حقیت میں ان کا اسم گرامی زین الدینؒ درج ہے، ماسوا زمانہ حال کی ایک کتاب ’’احوال العارفین‘‘ مؤلفہ جناب حافظ غلام فرید (1979ء) میں ان کا پورا اسم گرامی حضرت سیّد زین الدین عبد القادرؒلکھا ہوا ہے جس کا حوالہ مؤلف نے جناب عبدالحلیم اثر افغانی مرحوم کی غیر مطبوعہ کتاب ’’ اولیاء پشاور‘‘ کا دیا ہے۔ آپؒ سادات بخارا میں سے تھے، حنفی المذہب تھے اور آبا و اجداد سے سلسلہ عالیہ سہروردیہ میں صاحب سجادہ و مسند اور صاحب بیعت و ارشاد تھے۔ آپ کے والد محترم فرید العصر پیر فرید الدینؒ تھے۔ جو خود قطب الاقطاب ناصرالدین محمود شاہؒ المعروف پیر سباکؒ کے فرزند ارجمند اور شیخ المشائخ سیدنا ابا بکرؒ کے پوتے تھے۔ سید ابابکرؒ، شاہ اسماعیل سہروردیؒ کے فرزند،ماذون، خلیفہ اور جانشین تھے۔ شاہ اسماعیلؒ نے طریقہ عالیہ سہروردیہ میں غوث العالم بہاءُ الدینؒ کے خاندان کے ایک بزرگ سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ پیر زین الدین صاحبؒ کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ جن میں صرف ایک کتاب بنام بضعۃ الربعین آج دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہے۔

1 ۔ **اساتذہ :** پیر زین الدین بخاریؒ کے اساتذہ کرام میں دو نام نمایاں ہیں۔

(الف) ۔ جامع الفضائل و کمالات حضرت مولانا اخوند چالاکؒ جو مشہور عالم، فقیہہ مؤرخ، غازی اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ پیر زین الدین نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ اخوند چالاکؒ کا سنِ وفات 1067ھ یا 1075ھ مختلف تاریخی کتب میں مرقوم ہے۔ ان کو کابل گرامؒ بھی کہا جاتا ہے۔

(ب) ۔ نورالعلماء اخوند محمد یونس فیضی معروف بہ شیخ نور محمدؒ پشاوری (متوفی 1059ھ) جن کو خادو بابا بھی کہتے ہیں۔ عالم، عارف اور مجاھد تھے۔ پیر زین الدینؒ نے اپنے ایک شعر میں ان کو از راہِ احترام و عقیدت ، یونس افلاک، بھی کہا ہے۔ اور ان کو موضع طورو میں ہشت راہٹی زمین بھی دی تھی۔

2 ۔ **سن ولادت** ؛ سید شاہ ولی اللہ نقشبندی قادری کی تحقیق کے مطابق سیدنا پیر زین الدینؒ کا سنِ ولادت 1035ھ اور 1040ھ کے مابین ہے۔ جو موجودہ دستاب معلومات کی رُو سے اندازا" و قیاسا" صحیح معلوم ہوتا ہے۔

3 ۔ **سلسلہ طریقت؛** '' احوال العارفین'' ان کے سلاسلِ طریقت کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے۔ '' آپ اپنے والد ماجد سید فریدالدین قدس سرہ سے سلسلہ سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ مجددیہ، چشتیہ و غیرہ سلاسل میں مجازِ بہ طریقت تھے۔ جبکہ ان کے والد ماجد سلاسلِ طریقت قادریہ نقشبندیہ مجددیہ، چشتیہ صابریہ اور سہروردیہ کے مجمع البحرین تھے۔ سید فریدالدینؒ سلسلہ سہروردیہ میں اپنے والد بزرگوار سیدنا ناصرالدین محمود پیر سباکؒ سے ، سلسلہ قادریہ نقش

بندیہ مجددیہ میں شیخ سید آدم بلوری قدس سرہ سے، سلسلہ چشتیہ میں اخون پنجو بابا قدس سرہ اور سلسلہ قادریہ میں حضرت سلیمان گیلانی اور ان کے فرزند یونس گیلانی قدس سرہما سے مجازِ طریقت تھے۔ مناقب زین الدین میں لکھا ہے۔ کہ انھوں نے طریقت و سلوک کے منازل زبدۃ العارفین حضرت مولانا شیخ سعدی لاہوری (رح) کی صحبت بابرکت میں طے کیں۔ اور کتاب بضعۃ العارفین انھوں نے اپنے پیرومرشد شیخ سعدی لاہوری (رح) کے اشارہ اور دعوت پر لکھی۔ کتاب بضعۃ العارفین سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ پیر زین الدین (رح) ہادی المسلمین الی اللہ میاں شیخ اسد مرحوم (977 ھ تا 1102 ھ) اور شمع عرفان و ہدایت شیخ سعدی لاہوری (رح) (1003 ھ تا 1108 ھ) کے ہم صحبت و ہم نشین رہے ہیں۔ بہرحال ان پر اپنے ابائی سلسلہ طیبہ سہروردیہ کے احوال غالب تھے۔

4 ۔ **سن تصنیف بضعۃ العربعین؛** چاپ کتاب کے مندرجات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ اسداللہ وزیر آبادی (رح) اور شیخ سعدی لاہوری (رح) کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔ کیونکہ اول الذکر بزرگ کے نام کے ساتھ مرحوم اور شیخ سعدی لاہوری کے نام مبارک کے آخر میں رحمہ اللہ علیہ لکھا گیا ہے۔ شیخ اسداللہ (رح) نے 1102 ھ اور شیخ سعدی لاہوری نے 1108ھ میں وفات پائی۔ (شیخ سعدی لاہوری (رح) کیلیے مصنف کا لفظ مرحوم استعمال نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں لکھی گئی، البتہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ زیر حوالہ کے کاتب نے شیخ موصوف کو رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کی مناسبت

سے تحریر کیا ہے۔ جن سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کتاب بضعۃ الاربعین ۱۱۰۸ھ کے بعد لکھی گئی۔ (مترجم) ۔

5 ۔ **حالات، فضائل اور اخلاق :** قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، شیخ المشائخ، عمدۃ العلماء و الراسخین، گنج علوم سیدنا زین الدین (رح) سیدنا فرید الدین (رح) کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے تین اور بھائی بھی تھے۔ عبدالعزیز، شاہ عظیم الدین اور شہاب الدین (رحمہ اللہ تعالیٰ) ۔ ان میں سے شہاب الدین (رح) کا ذکر تاریخ مرصع میں آیا ہے۔ اور ان کو صراطِ مستقیم پر چلنے والا کہا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے اور بھائی بھی عالمان باعمل اور صالحین وقت تھے۔ لیکن ان سب میں پیر زین الدین (رح) علومِ ظاہری اور باطنی میں امام عصر اور مقتدائے وقت تھے۔ والد محترم کی وفات کے بعد مسند ارشاد کے وارث ہوئے کیونکہ اپنے سب بھئیوں سے لائق اور فائق تھے۔ فضل حسین ولد عبدالصمدانی نے ان کی علمی فضیلت، زہد و تقویٰ اور پرھیزگاری کی بہت تعریف کی ہے اور ان کو مجتہد وقت لکھا ہے۔ بڑے مؤثر خطیب محراب و منبر تھے۔ بڑے سے بڑے مجمع کے سامنے ایک مسئلے پر یہاں تک بولتے کہ کسی کو انکار کی جرأت نہ رہتی۔ ان کے شدید مخالف بھی ان کے علم ظاہر کی فراوانی، طاقت لسانی، قوت قائلانہ اور قدرت و قابلیت استدلال اور اثر کے قائل تھے۔ اس کے ساتھ آپ اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ اور انہوں نے اپنے سخت ترین مخالف کو بھی بُرے الفاظ سے یاد نہیں کیا بلکہ ان کے حق میں دُعائیں کیں۔ ایک دفعہ فرمایا؛ ” اللہ تعالیٰ

نے اپنے فضل و کرم سے مجھے شریعت پر استقامت عطا فرمائی ہے۔ جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمریں دراز کرے۔''

6 ۔ **شرکت جہاد ؛** بقول قاضی عبدالحلیم اثر افغانی ''جب اخوند چالاک (رح) کوہستان کے کفار کے خلاف جہاد کے لیے جارہے تھے تو ان کی سرکردگی میں جانے والے لشکر میں سید محمد یوسف ابن سید محمد یونس (رح) اور سید علی گیلانی (رح) [المعروف سید زندہ پیر و علی مست و زندہ علی کیساتھ سید فریدالدین (رح) بمع فرزندوں کے شامل تھے اور موضع طورو میں سید فریدالدین کی زمین کو مجاھدین کے کیمپ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ '' اس زمین کو عیدگاہ کے وزن پر جھادگاہ کا نام دیا گیا ۔ جسے بعد میں پشتو میں جھاد کے نام سے شہرت ملی۔ (واللہ اعلم)

7 ۔ **بیت الغریب :** آپ (رح) نے بیت الغریب یا پیر زین الدین کلے یا پیران کلی کی بنیاد ڈالی۔ اس بارہ میں صاحب مناقب زین الدین لکھتے ہیں۔ ''جب اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے محبت اور کامل جذبہ رجوع الٰہی نے ان کے دل میں جگہ پائی تو دن رات عبادت، ریاضت اور مجاھدے میں مشغول ہوگئے] بال برابر بھی شریعت اور سُنتِ بیضاء کے راستے سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔ عام لوگوں کے اژدھام سے متنفر ہوگئے۔ ان کی طبیعت خلوت اور گونشینی کی طرف مائل تھی۔ اسی وجہ سے اپنے خویش و اقارب سے تعلق تھوڑ کر فقر اور غربت کا راستہ اختیار کیا، اپنے چند خلفاء کے ساتھ پیر سباک سے روانہ ہوئے اور پہاڑوں کے درمیان ایک جگہ کو اپنی طبیعت کے موافق پایا، وہاں

سکونت پذیر ہوئے۔ کچھ گھر اپنے خلفاء کے لیے تعمیر کیے۔ اس جگہ کا نام '' بیت الغریب'' رکھا یعنی مسافروں کی جگہ۔ اپنے لیے وہاں خلوت خانہ بنا کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ وفات تک وہیں مقیم رہے۔ وہیں اس دارِ فانی سے دارِ جاویدانی کی طرف رحلت فرمائی۔ جب ان کی شرفِ اقامت سے وہ گاؤں مشرف ہوا تو اس گاؤں میں مزید آبادیان بننی شروع ہوئیں۔ لوگ ان کے سایہ عاطفت کو غنیمت سمجھتے اور ان کی ہمسائیگی میں رہنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے تصرف و برکت سے وہ جگہ آباد و معمور ہوگئی اور اس مقام نے سلاطین و خوانین کو متوجہ کیا۔ بہت سے لوگ دینی و دنیاوی حاجات کو پورا کرنے کے لیے وہاں آجایا کرتے تھے۔ خانقاہ بیت الغریب شریف تقریباً دو سو سال تک مرکزِ رشد و ھدایت اور چشمہ فیض و عطا رہی۔ درس و تدریس اور سلوک و معرفت کے جویا آتےاور بقدرِ ظرف مُستفید ہوکر چلے جاتے، علم و عرفان اور دیگر مروجہ علوم و فنون کے رسالوں کے قلمی نسخے یہاں تیار کیے جاتے اور شائقین اور معتقدین انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہاں سیّد عبدالشکور (رح) ، خواجہ حافظ محمد معصوم (رح)، حافظ محمد عُمر (رح)، پیر محمد فاضل (رح) ، پیر معظم شاہ (رح)،محمد علی شاہ (رح)، سید محمد حسن (رح) اور شاہ یحیٰ (رح) جیسے صاحبانِ سجدہ و عمامہ صوفی عالم مدّرس خطیب مؤرخ اور شاعر پیدا ہوئے اور ایک جہاں کو منور کیا۔

8 ۔ **سنِ وفات:** بموجبِ تحریر سیّد ولی اللہ شاہ قادری نقشبندی، جمال و کمال کے یہ پیکرِ شریعت و طریقت کے یہ

روشن چراغ،علمائے حق کے سرخیل، اولیاء کے سردار 1119 ھ میں اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو رحلت فرما گئے اور اپنے ہی بسائے ہوئے گاؤں بیت الغریب میں آسودہ خاک ہوئے۔

9 ۔ **عُرس :** کاکا صاحب (رح) کے عُرس کی آخری تقریبات پیر زین الدین کے مزار پر اہتمام پذیر ہوتیں۔ 1926ء تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔

0۔ **پیر مطیع اللہ کوہاٹی (رح) :** پشتو کے مشہور عالم فاضل اور رحمانی المسالک شاعر پیر مطیع اللہ کوہاٹی (زمانہ 1150 ھ تا 1260ھ) نے بھی کچھ عرصہ خانقاہ بیت الغریب شریف میں گذاراا اور یہ شعر کہتے ہوئے یہاں سے رُخصت ہوئے ؛

بل یو کان د معرفت بیت الغریب دے

د عرفان پہ دریا غرق لہ دے ساحل لاڑ

ترجمہ۔ ’’ معرفت کی ایک دوسری کان بیت الغریب میں ہے۔ میں (مطیع اللہ) عرفان کے اس دریا میں غرق ہو کر ساحل مراد پا چلا۔ ‘‘

11. شاہ محمود شاہ ولد شیر علی شاہ، جو اس وقت موضع لنگر ضلع اٹک میں قیام پذیر تھے، وۃ بھی اصل میں بیت الغریبکے رہنے والے تھے، راقم الحروف نے ایک نایاب خوش خط قلمی نسخہ’’روضۃ الصابرین ‘‘مصنفہ صابر نامی شاعر سنِ تصنیف 1198ھ پشتو اکیڈمی پشاور کے حوالے کیا ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے ’’از ید احقر محمد بخش

سکنہ تونسہ شریف بیاد خاطر سیادت پناہ سید محمود شاہ ساکن قریہ لنگر اصلی متوطن بیت الغریب علاقہ خٹک (خٹک نامہ) 1288 ھ در ہفتم ماہ جمادی الاول تحریر یافت''

12۔ **بیٹے :** پیر زین الدین قدس سرۃ کے گیارہ فرزند تھے، عبدالشکور اور کرم دین (اولاد زوجہ اول)، اسد اللہ اور حافظ محمد عُمر (اولاد زوجہدوم)، محمد علی اور نجم الدین (زوجہ سوم کی اولاد)، عمادالدین، عبدالحق اور قیاس الدین (زوجہ چہارم)۔ محمد سعید جنکو مسعودشاہ بھی کہتے ہیں اور سعدالدین (اولاد زوجہ پنجم) ۔ مناقب زین الدین میں ایک بھائی کا نام غلام محی الدین درج ہے۔ (تاریخ پشاور کے ایک اقتباس دربارہ موضع ولئ (ضلع نوشہرہ) ۔ مؤرخ بہادر شاہ ظفر کاکا خیل کے ایک خط اور شہباز خٹک دویم کے ایک قبالہ کے مندرجات کے باھمی موازنے، تقویمی تطبیق اور استخراج سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ محمد سعید (مسعود شاہ) اور سعدالدین کی والدہ خوشحال خان خٹک کی دختر نیک اختر تھی۔ کیونکہ مراقباتِ رحمکار (رح) اور مقاماتِ قطبیہ کی عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موضع ولئ ان کے دادا حضرت پیر سباک (رح) کی ملکیت تھی۔ ویسے پیر زین الدین (رح) کثیر جائداد کے مالک تھے۔ پیر صاحب کے دو بیٹوں حاجی عبدالشکور (رح) اور حافظ محمد عمر (رح) کے بارہ میں مصنف مناقب زین الدین لکھتے ہیں ''صاحب کمال اور اربابِ حال تھے ۔ ''

13۔ **کرامات؛** اولیائے کرام سے خوارق عادات اور کرامات کے ظہور کا طریقہ اہل سُنت و الجماعت کے ہاں

ایک مسلم عقیدہ ہے۔ لیکن سب سے بڑی کرامت شریعت مقدسہ پر استقامت ہے۔ جو بفضل خدا پیر زین الدین (رح) کو زندگی اور بعد از وفات بھی بہ درجہ کمال حاصل ہے۔ لیکن یہاں ان کے مناقب کی کتاب سے ان کی دو کرامات کا ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

(الف) ساغری خٹک افغانوں کی ایک شاخ ہے ۔ جو علاقہ نرڑہ چھب ضلع اٹک میں آباد ہے۔ تواتر سے روایت چلی آرہی ہے کہ پیر زین الدین (رح) ایک دفعہ بغرض سیر و سیاحت اس علاقے میں پہنچے، چند دین قیام فرمایا۔ جب اس علاقے کے لوگوں کو ان کی آمد کا پتہ چلا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ''ہم لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، لیکن اس زمین میں سانپ بہت پائے جاتے ہیں۔ سانپوں کے ڈر سے یہ علاقہ غیر آباد اور بنجر ہے۔ اگر حضرت عنایت اور مہربانی فرما کر دُعا فرمائیں تو یقین ہے کہ اس دُعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہمیں سانپوں کے آزار سے محفوظ کردیگا۔'' حضرت نے ان کے حق میں دُعا کی اور فرمایا۔ '' جاؤ اور اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ، سانپ تم لوگوں سے کوئی غرض نہیں رکھیں گے۔'' آج تک یہ علاقہ آباد ہے، سانپ وہاں کے رہنے والوں سے کوئی غرض نہیں رکھتا اور بالفرض کسی کو ڈس بھی لے تو تکلیف نہیں پہنچاتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان محفوظ و مامون رہتا ہے۔

(ب) نیز ایک دفعہ اس علاقے میں بارش نہ ہوئی تو اس علاقے کے لوگ جمع ہوگئے اور اس جگہ مل کر طلب باران کے لیے دُعا مانگی جہاں پر پیر زین الدین (رح) نے

چند روز قیام فرمایا تھا۔ صدقہ و خیرات کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان پر باران رحمت نازل فرمائی۔

14 ۔ **کتب مناقب:** پیر زین الدین کے مناقب فارسی نظم اور نثر میں لکھے گئے ہیں۔ نثری مناقب فضل حسین ولد عبدالصمدانی نے تحریر کیے۔ نظم میں ان کے مناقب حضرت مولانا خواجہ فضل احمد ملنگ کی جولانیء فکر، زورِ قلم اور بھر پورعقیدت کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں مناقب 1146 ھ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ دونوں مناقب نگار پیر صاحب (رح) کے خاندانی مرید اور فیض یافتہ ہیں۔ فضل حسین ولد عبدالصمد الہٰانی کے مناقب کو شاہ ولی اللہ قادری نقشبندی پیرسباکی نے یکم جنوری 1992ء کو ایک دیباچہ اور چند اضافوں کے ساتھ شائع کیا ۔

15۔ **مزارِ اقدس :** پیر زین الدین (رح) موضع بیت الغریب میں دفن ہیں۔ وہاں مغل طرز تعمیر کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے، جس کی دیواریں مغل طرز کی چھوٹی اینٹوں کی بنی ہیں۔ عمارت کے اندر چار قبریں ہیں۔ ان میں مشرق کی طرف سے تیسری قبر جس پر جھنڈا لگا رہتا ہے پیر زین الدین (رح) کی ہے۔ باقی تین قبریں ان کے بھائیوں کے ہیں۔ عمارت کے اوپر کوئی چھت نہیں ہے۔ حالانکہ عمارت کے شمال مغربی کونے میں چھوٹی اینٹ کا بنا ہوا ایک زینہ اب بھی موجود ہے۔ چھت نہ ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے ’’جب پیر زین الدین (رح) رحلت فرما گئے تو ان کے بیٹوں نے ان کی قبر مبارک پر روضہ اور گنبد تعمیر کرنا چاہا۔ قبر کے ارد گرد اونچی دیوار تعمیر کی، جب مزار کا گُنبد تعمیر کرنے کا مرحلہ آیا تو باوجود کوشش

کے نہ بن سکا اور ہر بار گر جاتا، بیٹے بڑے فکرمند ہوے، ایک رات اپنے والد ماجد پیر زین الدین (رح) کو خواب میں دیکھا جنھوں نے فرمایا۔ ’’مجھ سے بارانِ رحمت کو نہ روکو، بیٹے سمجھ گئے اور گنبد کی چھت بنوانے سے ہاتھ روک لیے۔ اس طرح روضہ مبارک نامکمل رہ گیا‘‘۔ 1992 ء میں محترم سیّد محمد ایوب بخاری ایڈوکیٹ نے، جو آج کل اس خاندان کی ذی علم، صاحب بصیرت، محترم داعی اتحاد المسلمین اور نامور گل سر سبد شخصیت ہیں۔ اس مزار کو دوبارہ شان شایاں طریقے سے تعمیر کیا۔ اس کی مناسب تزیّن و آرائش کی، اللہ تبارک تعالیٰ ان کو اس کار نیک کا اجر نیک دنیا و آخرت میں دے ۔ آمین!

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ

ڈی۔ ایچ ۔ او کرک (صوبہ سرحد)

یکم جون ۱۹۹۹ء

وقت کب شروع کہاں ختم

(چند گم ہوتی یادیں) (مصنفہ "سید احمد عالم"

ہر کسی را دامان تر ہست اما دیگراں

باز می پوشند و من در آفتاب انداختم
(شیخ سعدی)

محترم سید احمد عالم نے کوثر و تسنیم میں دُھلی بریلی میں بولی جانے والی ٹکسالی اُردو زبان استعمال کی ہے۔ جسمیں پشتو لہجے کی تمکنت، لکھنوی بانگپن اور دہلوی مکتبۂ فکر کی نفاست اور شائستگی جھلکتی ہے۔ وطن مالوف میں اپنے والد بزرگوار کی سائنسی طریق پر زرعی کاشتکاری اور ہندوستان سے آنے والے لٹے پٹے مہاجر قافلوں کی درد بھری داستان کو مکمل سیاسی و معاشی سیاق و سباق کے ساتھ ایک معنی خیز انداز میں بیان کیاہے۔ محنتی اور لائق و فائق اساتذہ نے ان کی تعلیم کی بنیادی خشت اول رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ کئی مشہور ہستیاں جنہوں نے اپنے اپنے شعبہ ہائے زندگی سیاست، صحافت، سفارت اور شعروادب میں آنے والے وقت میں بڑا نام پایا مثلافرحت اللہ بابر، رستم مہمند، جمال شاہ المعروف بیرسٹر باچا،ظہور احمد اعوان اور ماجد سرحدی ان کے ہم جماعت رہے لیکن صرف ایک کھلاڑی (سپورٹسمین) اختر المعروف پاڑہ آنے والی زندگی میں ان کے آئیڈئیل رہے۔ حصول تعلیم اور دوران ملازمت دونوں میں یہ شعر ان کا نصب العین رہا؛

آگے بڑھتے چلو اونچا چڑھتے چلو

یہ سوانح حیات ایک کامیاب عملی انسان کی مکمل سرگذشت ہے جو زمانے کے بدلتے معاشی،

معاشرتی اور سیاسی ارتقاء کی ایک مستند عکاس تصویر ہے۔ پشاورشہر میں نسلی اختلاط – تاریخي اور جغرافیائی حالات – میوہ جات کی بہتات – یہاں کے مخصوص کھانوں کی لذتوں کابیان اور پشاور صدر کے علیگ ریسوتوران اور پریمیئر ہئیر ڈریسر کی آرائش گیسو کی مشہور دُکان میں خواص شہرکی ادبی، سیاسی اورعلمی مجالس اور گفتگو کے خوشگوار احوال درج ہیں ۔ ماشاءاللہ ان کی صحت کے بارے میں ان کے مرحوم و مغفور والد صاحب کی رائے آج بھی سو فیصد صحیح اور دُرست ہے ۔ اپنی صحت کے بارے میں وہ آج بھی بے حد حساس ہیں انسانی مدافعاتی نظام اور مسائل پر بھی اس مسودے میں کافی فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے ۔

سید احمد عالم ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ ہیں لیکن ان کی اُٹھک بیٹھک میں روایتی بیوروکریٹ کا وہ اکڑپن اور برتری کا احساس موجود نہیں ہے ۔ طبیعت میں انکساری اور یک گونہ عجز پایا جاتا ہے ۔ ملنسار، وطن دوست، دوست پرور، مہمان نواز اور شریف انسان ہیں ۔ پھولوں کے ساتھ کانٹوں سے نبھانے کا ہُنر خوب جانتے ہیں ۔ شاعرانہ اور فلسفیانہ مزاج پایا ہے ۔ پٹھانوں کے علاوہ دیگر اقوام جن کیساتھ زندگی گذاری ہے، کے مزاج اور نبض شناس ہیں ۔ بچپن اور لڑکپن کے زمانے سے غیر نصابی سرگرمیوں میں فعال حصہ لیتے رہے ہیں ۔

ان کے ہاں سائینسی مذہبیت اور روحانیت پائی جاتی ہے ۔ بنیادی طور پر نفسیات دان ہیں ۔ اس لیے نفسیات شناسی میں ان کو ید طولی' حاصل ہے ۔ ملازمت کے دوران وہ ایک کامیاب اور ہردلعزیز افسر رہے ہیں ۔ وہ مطالعے سے زیادہ مشاہدے میں یقین رکھتے ہیں ۔ اپنی اس کتاب میں جب وہ پارہ چنار کی منظر کشی کرتے ہیں تو قاری فطرت کی رنگینیوں کے سحر میں گُم ہو جاتا ہے ۔

اس طرح جب وہ اپنے اساتذہ کی کردار نگاری کرتے ہیں تو ان کی خاکہ نگاری کی داد دینی پڑتی ہے ۔ عالم صاحب موجودہ ملکی صورت حال پہ کُڑتے ہیں ۔ دوستیاں بنانا اور پھر نبھانا خوب جانتے ہیں ۔ وَہ احسان کو ہمیشہ یاد رکھنے والی شخصیت ہیں ۔ کتاب کے بعض حصوں کو پڑھتے وقت اس پر ایک بہترین سفرنامے کا گمان ہوتا ہے ۔ پاکستان کے شمالی علاقاجات کی سیر کے واقعات پڑھنے کے بعد قاری پاکستان کے اس جھومر کے متعلق دیگر مصنفین کے تحریر کردہ سفرناموں کے مطالعے سے بے نیاز ہوجاتا ہے ۔ گوپس (گلگت) کے علاقے کے بارے میں ان کی حقیقت بیانی دل میں اُتر جاتی ہے ۔ کوہ پیمائی اور مہم جوئی کا شوق اور جنون ان کو موت کی سرحدوں تک لے جاتا ہے۔

محکمہ ڈاک کی ملازمت؛ انہوں نے کچھ عرصہ اس شعبے میں بھی گذارا ہے اور اس دور کی

خوبصورت یادوں کو قلم بند کیا ہے ۔ اس محکمے میں ناجائز آمدن کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے ۔ انگریزوں کے عہد کے زرین محکمانہ اصول و ضوابط پر بدستور سختی سے عمل ہوتا تھا ۔ مصنف نے دوران ملازمت مشکلات تکالیف اور رکاوٹوں کو ڈسپلن کے اندر رہ کر تدبر اور خندہ پیشانی سے برداشت اور حل کیا ۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ سائنسی معلومات کو عقلی ثبوتوں اور شماریات کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ ایک بیوروکریٹ کا علم، مشاہدہ، معلومات اور تجربہ وقت کیساتھ وسیع ہونے کی وجہ سے بگھڑ بھی جاتا ہے اور پھر اسے سمیٹنے کا ہُنر اور فن بہت کم افراد کے پاس ہوتا ہے ۔ صاحب کتاب ان کمیاب شخصیات میں سے ایک ہیں ۔

سبق آموز تحریر: یہ عجائبات سے بھری ایک ایسی تصنیف ہے جسمیں اس شاہی محکمے کے مٹتے ہوے آثار کا نوحہ ہے ۔ اور بہترین حکومتی کارکردگی (گُڈ گورننس) کا قصۂ پارینہ ہے ۔ یہ ایک سیلف میڈ نوجوان کے عزم ، حوصلے ، لگن، فرض شناسی اور بہتر مستقبل کے خوابوں کی دل چسپ اور فکر انگیز داستان ہے ۔ ایک ارضی جنت کی سیر کے دوران ان کے ذہن پر جنت گُم گشتہ کا نقشہ چھایا رہتا ہے اور قاری کا خیال اواگون کے نظریے کی جانب چلا جاتا ہے ۔ مصنف کے پاس ماضی کی یادوں کا ایک سرمایہ ہے ۔ اس کی

بازگشت کے دوران ان کے حافظے اور یاداشت کی داد دینی پڑتی ہے۔

حرص اور طمع کا مقابلہ ؛ سید صاحب کی متوکل علی اللہ اور فرض شناس شخصیت نے سرکاری محکموں کی تطہیر کے لیے مختلف تجاویز پیش کرکے ایک محب الوطن پاکستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔ کسٹم کی پرکشش اور متمول محکمے کی ملازمت کے دوران ان کا واسطہ سیاست دانوں، صنعت کاروں، ٹیکس گذاروں اور سمگروں سے پڑا ۔ یہاں اُنہوں نے یہ سنہری نسخہ بڑے ہُنر اور کامیابی سے آزمایا کہ کارسرکار بھی چلتا رہے اور متعلقہ لوگ بھی ناراض نہ ہوں ۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اپنے صوبے کے ایک وزیر اعلی' میرافضل خان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "ایک ایورج (متوسط) ذہانت رکھنے والا افسر ہی ایک کامیاب بیوروکریٹ ہوتا ہے ۔" ان کا یہ فرمان قابل بحث و توجہ ہے ۔ مصنف نے سن ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ہیپی ازم کا دور دیکھا جو منشیات اور سکون کی تلاش میں افغانستان اور پاکستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان اور نیپال کا رُخ کرتے ۔ وہ 1980 ء میں ہیروین سمگلنگ کی پہلی کیپ پکڑنے کے ہیرو بھی تھے ۔ ہر کام میرٹ پر کیا ۔ کہتے ہیں کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک سلیقہ شعار بیوی کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ مصنف کی مرحومہ زوجہ محترمہ بھی صدق و مہر و وفا کی پیکر، غریب

پرور اور بھرپور مذہبی شخصیت کی مالک تھیں۔ اللہ پاک نے ان کو نیک عمل، صالح اور فرمانبردار اولاد سے نوازا ہے۔

غرض یہ تصنیف باریک جُزیات نگاری اور حقیقت پسندی کا ایک ایسا ادبی نثری مرقع ہے جس میں آپ کو سفرنامے ، خاکہ نگاری اور منظرکشی کے عناصر کی ایک خوش رنگ قوس قزاح ملے گی۔ ان شاء اللہ صاحب ذوق قارئین کے ہاں قدر و منزلت کا مقام پاے گی اور ملک کی بڑی بڑی لائبریریوں کی زینت بڑھاے گی۔

ڈاکٹر چراغ حسین شاہ

حیات آباد 20/02.2018

بگڑے چہرے / عبدالکافی ادیب

پشتون معاشرے کو بِن دیکھے سمجھنے، پرکھنے، پڑھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لیے صرف عبدالکافی ادیب کے افسانوں کا مطالعہ ہی کافی سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ جن میں پشتون معاشرے کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں کردار اور واقعات مافوق الفطرت یا مبالغہ امیز نہیں ہوتے۔ نہ ہی وہ ابہام، علامت اور تجرید کے ذومعنی جگڑوں میں پڑتے ہیں۔ معاشرے نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ انھیں دیا، اسے انھوں نے اپنے مخصوص رنگ میں قرطاس پر بکھیر دیا اور پھر اسے اسی معاشرے کے

سامنے بطور آئینہ اس دعوے کے ساتھ پیش کر دیا۔ ’’دیکھو یہ ہیں تمھارے معاشرے کے صحیح خدوخال اب اگر اس چہرے کے نقوش ہی بگڑے ہوئے ہیں تو اس میں فنکار یا اس کے آئینے کا کیا قصور؟ ‘‘

1960 ء سے لیکر سن 1992 ء تک ان بتیس سالوں میں پشتو افسانہ بھت آگے نکل گیا ہے۔ لیکن اس میں تین نام ایسے ہیں جو اپنے منفرد اندازِ فکر و تحریر سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ قیوم مروت جو ایک رومانوی افسانہ نگار ہیں اور جن کے اعصاب اور موضوعات پر صنف نازک کی حکمرانی ہے۔ طاہر آفریدی اپنے آجکل کے افسانوں میں استعارے، علامت اور تمثیل کے اتنے موتی پرو رہے ہیں کہ ان کے پس منظر میں کہانی مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ باقی رہے میرے دوست عبدالکافی ادیب تو ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ سنگین صداقتوں کے کشف۔ لیکن اب افسانے میں حقیقت کی مقدار کتنی ہونی چاہیے اور مبالغے کی چاشنی کتنی ڈالنی چاہیے، تو اس توازن کو قائم رکھنا اور اسے گھٹانا بڑھانا بھی کوئی ان ہی سے سیکھے۔

ان کے افسانوں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں؛ 1 ۔ تاثیر 2 ۔ جدّت

شغلہ خو، داؤ، رشتہ اور خونی (جو قدرے طویل افسانہ ہے) میں انتہائی اثرانگیزی، حقائق کی تلخی، جذبات کی شدتاور احساس کی لو موجود ہے۔ ان کا تقریباً ہر افسانہ شروع سے آخر تک کافی کسا ہوا، مربوط او باہم پیوستہ ہوتا ہے۔ بعد میں ایک سنسنی خیز لیکن خوبصورت موڑ دے کر کہانی کا

اختتام بڑی خوبی سے کرتے ہیں جو ان کی افسانوی تکنیک کا ایک مخصوص و منفرد انداز ہے۔ قاری کا تجسس اول سے آخر تک قائم رہتا ہے اور پھر تلخ نتائج کا استنباط کرنے کے لیے اسے کافی مواد بھی مل جاتا ہے۔

افسانہ شغلہ خو، میں پشتون قوم کی پیغور اور بدلے کی جاہلانہ بلکہ ابوجہلانہ عادات کو جن مختصر زوردار متاثر کُن الفاظ میں سیدی او ماں کے منّہ سے مکالموں کی صورت میں ادا کیا گیا ہے۔ وۃ اظہار بیان، ابلاح زبان اور طرز تحریر کے اچھے نمونے ہیں اور ان بد عادات سے نفرت کے باوجود پتھر سے دلوں کو بھی پگھلنے اور اس بدنصیب قوم سے محبت کرنے پر انسان کو مجبور کردیتے ہیَ میرے خیال میں ان افسانوں میں اقوام کے افراد کے لیے مضمون، خیال اور مضوع کی حد تک ایک چونکا دینے والا نیا پن بھی موجود ہے جو پہلی با پشتونوں کے قبائلی رسم و رواج کے تلخ حقائق اور سنگین مناظر سے واقف ہو رہے ہیں۔ اسی طرح افسانہ ’’بش‘‘ اور ’’ آس‘‘ میں پشتو کی حد تک ایک جدت اور تاثر موجود ہے۔ جو ہمارے افسانہ نگاروں میں علامت اور تمثیل کا سہارا لینے کے باوجود آج کل مفقود ہے۔

یہ افسانے پشتو سے اُردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان میں چار تو فقیر حسین ساحر کے ساحرانہ قلم کا اعجاز ہیں۔ باقی افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہیناور ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے اور کم از کم میرے لیے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مصنف پشتو میں اچھا لکھتے ہیں یا اُردو میں یا پھر یہاں تک کہ وہ لکھنے

سے پہلے پشتو میں سوچتے ہینیا اُردو مین۔ بہرحال ایک بہترین مترجم کا یہی تو کمال فن ہوتا ہے ۔

مختصر یہ کہ ادیب کے افسانوں میں پشتونوں کے رسم و رواج، معمولات اور خاص کر جنس ضعیف کے سماجی مقام کی تاریخی داستان رقم ہوئی ہے ۔ افسانے جاندار، بیشتر المیہ لیکن پُر تاثیر اور مقصدی ہیں۔ افسانوں کے موضوعات کا خمیر اسی سنگلاخ سرزمین سے اُٹھا ہے۔ افسانوں میں طنز ہے نہ نصیحت بلکہ یہ پشتون کے کردار و عمل کی سچی اور حقیقی تصویریں ہیں۔ لیکن ان کی تصویر کشی میں تجربے، مشاہدے، خلوص اور جذبے کے ساتھ ساتھ انتہائی فن کارانہ ہُنرمندی اور اچھوتے پن سے بھی کام لیا گیا ہے۔

تیرا انتظار ہے اب بھی

(مصنف شاعر محمد اظہر)

میری نظر میں؛

اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت نے جدید اُردو شاعری کی انفرادیت کو مستحکم بنانے کے لیے جو مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ اس میں دہلی کی دبستانِ شاعری بہت نمایاں طور پر متحرک نظر آتی ہے۔ اس تحریک میں فکری حوالے سے جو داخلیت اور ڈکشن کے حوالے سے سلاست اور سادگی پائی جاتی ہے اس کے مثبت اثرات سے ہمارے شاعر محمد اظہر صاحب بھی بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوے ہمیں اُردو کے ممتاز نقاد الطاف

حسین حالی کے اس قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے جو انھوں نے مغربی نقاد جان ملٹن کے افکار سے مستعار لیا تھا وہ یہ کہ افاقی و فطری شاعری میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ جذبہ، اصلیت یا جوش اور بیان کی سادگی و سلاست۔

اظہر صاحب کی شاعری اس تناظر میں نہ صرف آفاقی و فطری ہے بلکہ منفرد اور مؤثر بھی ہے۔ وۃ غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی بارکیوں سے اشنا ہیں۔ اگرچہ اُن کے اس مجموعے میں حمد و نعت اور قطعات بھی شامل ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اُن کی شاعری میں تغزل کی جو شان ہے، ترنم کا جو اثر ہے، مضامین و مفاہیم کی جو اصلیت و داخلیت ہے اور زبان و بیان کی سلاست و برجستگی ہے، وۃ ان کی شاعری کے مجموعی تاثر کو بہت زیادہ محبوبیت اور مقبولیت بخشنے کی ضامن ہو سکتی ہے۔

میں اہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے پہلے شعری مجموعے ’’آ تیرا انرظار ہے اب بھی‘‘ کے منظر عام پر آنے کے بعد قارئین کو ان کے دوسرے مجموعے کا انتظار رہیگا۔ میرے خیال میں سرزمینِ ڈیرہ کے نامور غزل گو شاعر غلام محمد قاصر کی شعری روح اُن میں حلول کر گئی ہے۔ وۃ میر تقی میر کی طرح غم و اندوہ کو اپنے گھر مہمان بنانے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی یک گونہ بے خودی کی کیفیت طاری کرنے کے لیے مے و ساقی کو بغرض نشاط برتنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کو پہاڑپور یا ڈیرہ اسماعیل خان کا شاعر نہیں بلکہ اُردو زبان کا ملکی سطح کا شاعر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد چراغ حسین شاہ

ڈیرہ اسماعیل خان 27 ستمبر 2002ء

پائندہ محمد خان کی کتاب ’’دشت لوط کا مسافر‘‘

پائندہ محمدخان کی کتاب ’’دشت لوط کا مسافر‘‘ کے بارے میں ایک خط سے اقتباس؛ ’آپ کا پہلا ناول ’’دشتِ لوط کا مسافر‘‘ میں نے پڑھا۔ سچی بات یہ ہے کہ پشتو میں میرے خیال میں آج تک اس طرح کے عالمی معیار کا ناول نہیں لکھا گیا۔ تنقید نگاروں کے ڈر سے لکھنے والے اکثر روایتی دائروں سے باہر بہیں نکلتے۔

آپ کا ناول پڑھ کر دل خوش ہوا اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ؛

’’ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی ‘‘

(ڈاکٹر چراغ حسین شاہ کا خط مورخہ 5 مئی 2006 ء)

سفیر صاحب امیر عثمان کی کتاب ’’چراغ تلے اندھیرا‘‘ پر تبصرہ

افغان سربازوں نے ایک سُپر طاقت کو اپنے زور ایمانی او حوصلے سے شکست دے دی۔ تو نتیجہ میں یہ بدقسمتی بھی دیکھنی پڑی کہ یہ سادہ بادہ آگاہ نہ تھے کہ ان کے پیچھے استعماری اور طاغوتی طاقتوں نے ایک دام بچھا رکھا ہے۔ ان استعماری طاقتوں نے افغان وار لارڈز کو ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یوں یہ جہادی گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ زبردست خانہ جنگی ہوئی جس کے نتیجے میں بے بس، سادہ دل مظلوم عوام ناحق شکار ہوے اور ایک نہ ختم ہونے والی آفت سے دوچار ہوے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اخلاص اور ایمانی جذبہ سے جہاد میں حصہ لیا تھا۔ امیر عثمان صاحب نے جو کچھ دیکھا یا قابل اعتماد لوگوں سے سُنا وہ قلم بند کردیا۔ یہ سچی کہانیاں ہیں اور افغانی جِبِلت و سرشت کے تجزیئے ہیں۔

ڈاکٹر چراغ حسین شاہ
حیات آباد ۔ پشاور

‘‘میرے سپنے’’ (سحر بلوچ کی شاعری) ۔۔۔۔۔ نقد و نظر

محترمہ سحر بلوچ کی شاعری ایک درد بری آواز ہے۔ مس میں محرومی، جدائی و تنہائی کی شدت اور کرب و غم و

اندوہ کے جذبات کا اظہار بڑے سادہ ---- رواں اور دردناک انداز میں کیا گیا ہے۔ اُن کی شاعری میں میرِسخن میرتقی میر کی شاعری کا پرتو نظر آتا ہے۔ لیکن موضوع، اظہار اور بیان میں ویسا ہی فرق ہے جو اُجڑی ہوئی دہلی اور مرجھائے پھولوں کے سہرے ڈی۔ آئی۔ خان کے ایک دور اُفتادہ گاؤں پروہہ کی تہذیبی اقدار اور مٹتے ہوۓ ثقافتی و تمدنی نقوش اور آثار میں پایا جاتا ہے۔

سحر الفاظ کی حُرمت سے باخبر اور احساس اور جذبے کی الہامی توانائی سے معمور شاعرہ ہیں۔ اس شعر میں ہم کو حُسنِ تغزل، نازک خیالی اور جذبات کی شوخ اداؤں کی ایک متحرک تصویر نظر آتی ہے۔

یہ اور بات ہے آپ سے ملنا محال ہے ۔

سپنوں میں لا کے آپ کو چھیڑا کریں گے ہم

اسی کتاب میں آپ کو صفحہ 114 پر ایک غزل ''تُم کو اس سے کیا '' کی ردیف ملے گی۔ اس کا مطلع ہے ؛

لوٹا ہے تُم نے دل کا نگرتُم کو اس سے کیا؟

چھوڑا ہے تو مجھ کو بیچ بھنور تم کو اس سے کیا؟

اس غزل کو پڑھتے وقت قاری پر وھی وجد، سرور اور بیخودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے جو اُستاد قمر جلالوی کے غزلوں کو مسرت نظیر کی سُریلی اور مترنم آواز میں سننے کا مزہ اور جادو آفرین خاصہ ہے۔ گرچہ میں ذاتی طور پر اس غزل کے چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے؛

’’ویران پڑی ہے دل کی ڈگر تُم کو اس سے کیا؟

کو اپنے پشتون وال اردو لہجے میں تذکیر و تانیث کے جنجٹ سے آزاد ہو کر یوں پڑھنے کو ترجیح دون گا ۔

’’ ویران پڑا ہے دل کا ڈگر تُم کو اس سے کیا ؟ ‘‘

غرض سحر بلوچ کی شاعری حساس سل کے نگر میں آباد ہونے اور آہستہ آہستہ قاری کے سوچ، فکر اور تخیل پر حاوی ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ جدید غزل کو اپنا خونِ جگر دے کر اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ اب یہ نقاد حضرات کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ فن و فکر کے لحاظ سے غزل کو کیا ملا۔ اسکی شاعری کو پڑھتے وقت نجانے کیوں میرے ذہن کے پردے پر ایک ندھ بھکشو کی تصویر نمودار ہو جاتی ہے جو مراقبے میں بیٹھا ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہا ہو اور پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار اذیت ناک مسکراہٹ پھیل جائے۔ سوز و گداز اور درد و تاثیر کی ایسی ہی لمحاتی تصویرگری کا فن ہے جو سحر کو اپنی ہم عصر شاعرات میں ایک انفرادیت بخشتی ہے۔

ان دیکھی بلا

(افسانہ ۔ تخلیق۔ سید چراغ حسین شاہ / پشتو سے اردو ترجمہ ۔ عبدالکافی ادیب)

’’ہاں! تیری رضا میں میری رضا ہے ۔ مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔ قیامت تک ممکن نہیں۔ ٹھیک ہے والدین کا اپنی اولاد پر اپنے خالق سے بھی زیادہ حق ہے۔ مگر جب میں نے کسی کو دیکھا تک نہیں۔ اسے ملا نہیں، اس کے ساتھ نشست و برخاست نہیں کی، اس کے اخلاق و عادات کا مجھے اندازہ نہیں تو پھر اسے اپنا جیون ساتھی کیسے بنالوں۔ اللہ مجھے ایسی ان دیکھی بلا سے بچائے رکھے۔ ‘‘

’’دیکھ ناصیہ ! تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اولاد کے حق میں والدین کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ تیری عمر اتنی نہیں کہ تو اپنا بُرا بھلا سمجھ سکے ۔ ‘‘

’’والدین کو اپنی اولاد ہمیشہ کمسن ہی دکھائی دیتی ہے۔ بی۔اے کیا، ایم اے میں سونے کا تمغہ حاصل کیا ۔ دنیا کے ہر علمی موضوع پر بحث کرسکتی ہوں۔ دفتر میں ہر آنے جانے والے کو ڈیل کرسکتی ہوں ۔ مگر ان باتوں کے باوجود میں اپنا جیون ساتھی خود منتخب نہیں کر سکتی اور نہ ہی زندگی کے اس نازک مرحلے پر اپنا عقل استعمال نہیں کرسکتی ہوں۔ ‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے بیٹی۔ مگر عورتوں کی عقل ان کے ٹخنوں میں ہوا کرتی ہے۔ انھوں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔‘‘ ’’ماں ! تم بھی تو عورت ذات ھو۔ اس کے باوجود تم عورتوں کو ناقص العقل سمجھتی ہو۔ بابا نے اپنے مفادات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے۔ ‘‘

ناصیہ کی آواز غُصے سے بھاری ہوتی گئی۔ چہرہ سُرخ پڑتا گیا۔ وہ ایکدم کھڑی ہوگئی۔ ماں اور بیٹی کے مابین یہ گرم بحث گذشتہ دو ماہ سے روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ مگر ناصیہ اپنے والدین کے فیصلے کے آگے سر جھکانے پر امادہ نہیں تھی۔

ایک رات ناصیہ نے خواب دیکھا ۔ ایک اجنبی دیس جس میں اجنبی خوشبودار پھول ہر سو اُگے ہوے تھے۔ اجنبی میوہ جات اور پھل میز پر چُنے ہوے تھےمگر سخت گرمی تھی۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، اس کے دل میں بے قراری تھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ گرمی جب برداشت سے باہر ہوگئی تو وہ غُسل خانے میں گھس گئی، اور شاور کو کھولا۔ مگر یہ سب کچھ اچانک ہوا ۔ اسے اپنا سانس رُکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اعصاب میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ سارے وجود میں ارتعاش سا اُٹھا۔ یہ کیفیت چند لمحوں تک جاری رہی۔ شاور کے ٹھنڈے پانی نے اس کا وجود ٹھنڈا کردیا۔ رفتہ رفتہ تناؤ کی کیفیت ختم ہونے لگی۔ پھولوں کی خوشبو پھیل جاتی ہے اور پھر وہ لمبی تان کر سو گئی۔

ناصیہ کی آنکھ صبح سویرے کُھل گئی۔ گذشتہ رات کے خواب کا اثر اب تک اس کے دامن پر چھایا ہوا تھا۔ مگر اس نے اس کے باوجود خوشی محسوس کی۔ وہ سیدھی ماں کے کمرے میں پہنچی، ماں مصلے پر بیٹھی نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگنے میں مصروف تھی۔

”ماں “ ناصیہ نے کہا ۔ ”مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے ۔ “

ماں حیران ہو کر ناصیہ کو تکنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ضدی لڑکی بالاخر مان جائے گی۔ بے اختیار ہو کر مسکرائی اور خود سے بڑبڑانے لگی۔ ''توبہ ہے اس زمانے کی لڑکیوں سے شکر ہے ۔ میری دعا قبول ہوئی۔ اب اس لڑکی کے دل و دماغ سے ان دیکھی بلا اُتر گئی ہے۔ ''

مُطلق سچائ کی تلاش

جو تتلیوں کے پروں پر بھی پھول گاڑھتا ہے

یہ لوگ کہتے ہیں اِس کی کوئی نشانی نہیں

ہستی کی اِبتدا سے ابتک نوعِ بشرمیں دو گروہ موجود رہے ہیں۔ جن میں سے ایک ہمارے عقیدے کے مطابق منفی اور دوسرا مثبت ہے۔ ایک طائفہ حق باری تعالی' کے وجود سے اِنکاری ہے اور دوسرا اِقراری ۔ اور ہر گروہ اپنے موقف کے ثبوت میں دلائل رکھتا ہے ۔ جب یہ دلائل فرسودہ ہوجاتے ھیں تو نئے دلائل میدان میں لانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اِس کے علاؤہ کائنات کے ہر مظہر میں تغیر جاری ہے ۔ اور ساتھ ہی اشیاء میں تضاد کی وجہ سے تصادم بھی رواں دواں ہے ۔سائنس دانوں اور دانشوروں کا یہ نظریہ ہے کہ فطرت کی ہر شے اپنی تکمیل کی طرف حرکت کررہی ہے ۔ جب تک

ہر شے تکمیل تک نہ پہنچ پائے ۔ نقص موجود رہیگا اور تکمیل کا نقطہ دور رہیگا۔ تب سائنسدان اور دانشور ہر زمانے میں پُرانے نظریات کی تردید کرتے رہینگے اور نئےنظریات وجود میں آتے رہینگے (حمزہ بابا) ۔

نوعِ اِنسانی نے جب سے اِس جہاں میں شعور و آگہی کی آنکھ کھولی ہے ۔ اِس کا ذہن اِن سوالات کے تسلی بخش جوابات کی تلاش کرنے میں لگا ہوا ہے ۔ یہ جہانِ رنگ و بو کیسے اور کس وقت سے وجود میں آیا ہے ؟ اِس کا کوئ خالق و موجد بھی کہیں ہے یا نہیں؟ یہ واقعہ ایک حادثہ ہے یا پھر ایک عظیم ہستی جو اِنسانی ذہن کے حدود، خامیوں اور نقائص سے پاک ایک بے عیب اعلی' و برتر ذاتِ کامِل ہے ۔ اور اِس عالمِ عجائب کا خالق و مالک اور موجد ہے ۔ اِنسان اشرف المخلوقات ہے ۔ یہ اپنے موجد کا اعلی' ترین شہکار بے معنی و بے مقصد نہیں ہے ۔ اِس کا ایک آغاز بھی ہے اور ایک فنا اور آخری انجام بھی ہے ۔ اِنسانی ذہن نے اپنی عصری تقاضوں اور مجبوریوں کے مطابق اِن سوالات کا جواب، غرض و غایت اور محدود عقل کے مطابق سوچا، سمجھا اور بوجھا ہے ۔ اِس دوڑ میں اِن گُھتیوں کی ڈوریاں سُلجھانے کے لیے دلچسپ اساطیری قِصے گھڑے گئے ۔ آثارِقدیمہ اور

تاریخ کا سہارا لیا گیا ۔ مذہب کے اِلہامی عقائد اور نظریوں کا حوالہ پیش کیا گیا ۔ اہلِ تصوف نے اپنی ایک الگ دنیا بنائ اور سجائ ہے ۔ فلسفیانہ موشگافیوں کی دُھندلی فِضا میں اِ ن مسائل پر بحثیں کی گئیں ۔ عصرِ حاضر کی دو تین صدیوں کے سائنسی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اِن کا حل پیش کرنے کی سعی کی جارہی ہے ۔ اِ ن سائنسی توجیہات کو حتمی قولِ فیصل قرار دیا جارہا ہے ۔ مختصراً اِس کی دونوں متقابل مادی اور روحانی تعبیریں ازل سے ایک نہ ایک سے بہتر انداز میں سامنے آرہی ہیں ۔ لیکن یہ معمہ ہے کہ سلجھانے اور سمجھانے سے اور زیادہ الجھتا جارہا ہے ۔

اگر ہم کسی ویران صحرا میں ایک خوبصورت محل دیکھیں ۔ تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اِ س عالیشان محل کو بنایا کس نے ہے؟ اِس کا ڈیزائن کس اِنجینیر کے ذہن کی تخلیق ہے؟ اِسے اِس لق و دق صحرا میں بنانے کی غرض وغایت اور مقصد کیا ہے؟ کون خوش نصیب مکین یہاں رہتا ہے؟ اِس وسیع و عریض خشک بیابان میں آب و رزق کے وسائل اِسے کون پہنچاتاہے؟ آخر اِس کے یہاں بسیرا کرنے کی کوئ

خاص وجہ یا مجبوری اور توجیح کیا ہے؟ کتنے عرصے سے وہ یہاں آباد ہے؟ اور کب تک رہنے کا اِرادہ یا مجبوری ہے؟ اِس کے بعد اِسکا آئندہ کا پروگرام کیا ہے؟

نو وارد سیاح کے ذہن اِن سوالات کے علاؤہ دیگر کئ تجسُسات اور اِستفارات پیدا ہوسکتے ہیں ۔

مذہب کا جواب :

مذہب کا جواب یہ ہے کہ ایک قادرِ مُطلق کی ذات نے پہلے اِس مکان کو بنایا ۔ مکین کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر اِسے ضرورت کے اسباب سے اِسے مُزّین کیا ۔ پھر اپنی ایک نئِی مخلوق کو ایک پروگرام کے مُطابق اِس میں بسایا ۔ اِسے بتایا گیا کہ یہ ایک آزمائِشی دور ہے ۔ تم چند اخلاقی اقدار، قواعد و حدودِ بندگی کے اندر ایک مُتعینہ وقت تک ا س میں رہوگے ۔ تمہاری ہدایت کیلۓ یہ تمہارے اندر اور باہر کی دنیا (انفس و آفاق) کی نشانیاں ہیں ۔ عقل و آگاہی اور معرفت کے خزانے کی چابی تمہارے پاس ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ وقتاً فوقتاً ہر زمانے میں تم ہی سے چند چُنے ہوئے برگزیدہ افراد جو خود بھی اخلاق و تہذیب، نیک سیرت اور عبادت و ریاضت اور تقوی' و حیا میں درجہ کمال

پر ہونگے ۔ تمہاری راہنمائ اور تمہیں وعظ و تبلیغ کرکے سیدھے راستے کی نشان دہی کرتے رہینگے ۔ تمہیں عمل کرنے کیلئے چنداں وقت دیا گیا ہے ۔ موت کیساتھ ہی تمہارا ذاتی حساب کتاب بند ہوجا ئیگا۔ اور آخر اِس جہان کے فنا ہونے کیساتھ تمہیں احتساب کے عمل سے گزرنا ہوگا ۔ تمہیں یہ جزاء دائمی عیش و آرام اور سکون اور سزا جہنم کے عذاب کی صورت میں ملے گی ۔ (اللھم اجرنی من النار) ۔

عقل کی توجیح :

اِس کے بر خلاف **مادی دانشور دو اقسام میں مُنقسم ہیں** ۔ ایک مکمل دہریے ہیں ۔ جن کا کہنا ہے کہ یہ جہان اور اِنسان ایک حادثے کا نتیجہ ہیں ۔ جس کا کوئ واضح مقصد نہیں ہے ۔ بلکہ سراسر بے مقصد ہے ۔ وہ وجود کے جال میں پھنس گیا ہے ۔ اِ سے فضائے بسیط میں پھینک دیا گیا ہے ۔ حیاتی اور مادی اِرتقا کے نتیجے میں وہ اِس مقام پر پہنچا ہے ۔ اِسے اپنا مقصد وقت گذارنے کیلئے خود مُتعین کرنا ہوگا۔ آ، س کے بغیر چارہ نہیں ہے ۔ لیکن اِ س کے بعد بھی توقع نہیں ہے کہ وہ ایک کامیاب زندگی بسر کرے ۔ اور فلسفہ وجودیت کے مُبلغین میں سوان کریگیگار اور ژان پال سارترے

سر فہرست ہیں ۔ یہ دانشور خدا کو اِنسانی تاریخ کے واقعات کا حصہ سمجھتے ہیں ۔ اِسی فِکر میں مُذ بذب دانشوروں کا ایک طائفہ لا اَدری (اگناسٹک) کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جِن کا قول ہے کہ ہم خدا کے بارے میں نہ کچھ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں ۔ طبعی قوانین کے تحت اِس کائنات کا نظام چل رہا ہےَ اِس کے ساتھ ایک بعید اِمکان اِس بات کا ہے کہ اِن طبعی قوانین کا کوئ خالق بھی ہو لیکن اب اِ س ذات کا اِس کارخانہ حیات سے کوئ تعلق باقی نہیں رہاَ ۔ (نعوذُ باللہ) ۔ اِن کی سوچ طبعی قوانین سے آگے نہیں جارہی ۔ ہمارے مُلک کے ایک سائنسدان دانشور ڈاکٹر پرویز ھودا بھائ اِ س نظریہ فکر کو پیش کرنے میں آگے آگے ہیں ۔

دوسری قسم مکمل دہریوں کی جماعت ہے ۔ جس کے مشہور سرخیل ماضی قریب میں برٹرینڈ رسل اور رچرڈ ڈکنز تھے ۔ رسل خالقِ مطلق اللہ تعالی' کے وجود کو اِس لیے نہیں مانتا اور اُس کا کہنا ہے کہ اُس ذاتِ پاک کے حیاتیاتی کوائف (بایوڈیٹا) ہمیں معلوم نہیں ۔

روحانی دانشوروں کی رائے میں اُس ذات کو محض محسوس اورمتّصور کیا جاسکتا ہے۔ اس پر خیال، فکر اور ادراک کی کمند ڈالی جاسکتی ھے۔

یہ قولِ اقبال ‘‘یزداں بہ کمند آور یا ہمتِ مردانہ’’ کے مطابق ہے۔ اور آیاتِ اِلٰہی ارضی و سماوی اور انفس و آفاق میں اِس کا صرف مُشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ایمونل کانٹ، رابندر ناتھ ٹیگور اور محمد اِقبال نے اپنے اپنے رنگ میں یہ بات لکھی ہے ۔ فلسفی کانٹ کے نزد خدا ایک احساس کا نام ہے ۔ (خدا کا وجود ایک احساس کا نام ہے) ۔ ٹیگور اس کو ایک شاعرانہ سوچ و فکر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اقبال اِن دونوں افکار سے ہٹ کر اِسے اِنسان کا کُلی اِظہارِ بیان قرار دے کر وحدۃ الوجود کی طرف یوں اِشارہ کرتا ہے :

“It is neither mere feeling nor mere thought. It is the expression of the man as a whole”.

(یہ محض احساس یا انسانی سوچ و فکر نہیں ہے ۔ یہ تو اس خلیفۃ الارض کا مکمل بیانیہ ہے) ۔

جبکہ وہ اپنے فارسی کلام میں اس بات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

ما تُرا جوئیم تو از دیدہ دور

نے غلط ما کور و تو اندر حضور

یہاں "اندر حضور" اور"اندر وجود" میں فرق یاد رہے ۔ میرے خیال میں تو اِنسان صرف مادی شے کا حدودِ اربعہ مُتعین کرسکتا ہے اور اسکے حیاتیاتی کوائیف جان سکتا ہے لیکن خالق و بدیع (موجد) اِن حدود اور قیود سے بے نیاز ہے ۔ اگر اُس عظیم ذات کے حیاتیاتی کوائف اِنسانی مادی ذہن معلوم کرلے ' تب تو وہ خالق و مالک نہیں مخلوق بن جاتا ہے ۔ انسان ایک ایسا کمپوٹر ہے جو زمان و مکان کے قیود و حدود سے بالا ایک ایسی ہستی کی تخلیق اور ایجاد ہے جو **"لَیسَ کَمِثلِهِ شَیٔ"** ہے (یعنی اُس جیسی کوئ دوسری مثال نہیں) ۔

دو سال پہلے ایک میڈیکل جرنل میں ایک مضمون پڑھا ۔ عنوان تھا :"موت کی موت" ۔ ایک جدید تحقیق کی رو سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ کہ سائنسدانوں نے اِنسانی عمر کو قابو(کنٹرول) کرنے والا "جین" دریافت کر لیا ہے ۔ اب ۲۰۳٦ء تک دنیا میں موت کا خاتمہ ہوجائے گا ۔ لیکن دوسرے ہی دِن ٹی۔ وی اور اِخبار کی سُرخی تھی ۔ کہ کویڈ ۔ ۱۹ **(کرونا)** نامی ایک وائرس نے نوعِ اِنسان پر حملہ کردیا ہے اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اِس ننھے جرثومے سے ہلاک ہونا شروع ہوگئے ہیں ۔ غریب تو غریب، ترقی یافتہ ممالک کے

سائنسدان اور حکمران بوکھلا گئے ۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" ۔ عیسائ، یہودی اور دہریے سب مسلمانوں سے بھی زیادہ گھبرا گئے ۔ بھیانک موت کا ایک منظر ہر طرف نظر آنے لگا۔ ملحد اور حق کے وجود سے مُنکر مُتکبر حکمران اور دانشور مندروں اور کلیساؤں میں گھنٹیاں بجانے لگے' مساجد اور درگاہوں پر سجدہ ریز ہونے لگے اور قادر مُطلق کے حضور توبہ اور عجز کا اِظہار کرنے لگے۔ اُدھر نئےسائنسی اِنکشافات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ سمندر کی تہہ میں ایک مچھلی پائ جاتی ہے جِس کی ساخت جدید سبمرین سے ملتی ہے َ جو قدرت کے اِس شہکار مچھلی کی نقالی سمجھی جاسکتی ہے ۔

سقراط کا قول ہے کہ پرندوں کی طرح ترقی کے دو پَر ہوتے ہیں۔ ایک پَر تو ہمیں اپنی لیاقت کا عطا ہوتا ہے ۔ اور دوسرا پَر لوگ اپنی حماقت سے فراہم کرتے ہیں ۔ جِس کو یہ دو پَر مُیسر ہیں ۔ اُس کی ترقی ابدی اور لازمی ہوتی ہے ۔

ہم سے بس اِس حد تک سوال ہونگے جو اللہ تعالی' نے ہمیں عطا فرمائ ہے ۔ ایک اپاہچ اِنسان سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ اُس کے دوڑنے کی رفتار کیا تھی؟ صاحبانِ فکرسے فکر کی بابت سوال ہوگا۔

جس شخص کو قلم کی طاقت عطا کی گئ اُس سے پوطھا جائے گا کہ اس نے اپنی تحریریں کس سمت میں اِستعمال کیں؟ تحریر بھی گویائ کی طرح قدرت کا ایک عظیم تحفہ ہے ۔ اور یقیناً اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (واصف علی واصف)

خواجہ حسن بصری(رح) فرماتے ہیں ۔ ایک روز شام ڈھلے میں نے دیکھا کہ ایک بچہ شمع روشن کررہا ہے ۔ میں نےاس سے پوچھا "بیٹا کیا تم بتاسکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟ اُس بچے نے سوال سُنتے ہی ایک لمحے کیلئے سوچنا شروع کیا اور پھر شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا اور مجھ سے پوچھا آپ مجھے بتائیے کہ روشنی کہاں چلی جاتی ہے؟ تو میں آپکو بتاؤں گا کہ روشنی کہاں سے آرہی تھی ۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ سُن کر میں لاجواب ہوگیا ۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری اِبتدا کیا ہے؟

کہ میں اِس فکر میں رہتا ہوں کہ میری اِنتہا کیاہے؟

یہ کائنات حادث ہے یا قدیم؟ اِس میں پیش ہونے والے واقعات کاتبِ تقدیر کے ہاتھوں پہلے ہی سے لکھی ہوئ تحریریں ہیں یا اچانک پیش ہونے والے مادی حادثات؟ یہ فلسفے کے پُرانے سوالات ہیں ۔

مولانا اشرف سلیمانی رحمہ اللہ علیہ فرماتے تھے ‘‘جِسے تم حادثہ کہتے ہو وہ میرے مولیٰ' کی سوچھی سمجھی سکیم ہوتی ہے’’۔

مشئیت اور قضا: اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ کے شہر لِزبن میں ایک زبردست زلزلہ آیا ۔ جِس کے نتیجے میں بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا۔ پادریوں نے فتویٰ دیا کہ یہ ساری تباہی ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے ۔ اِس دوران فلسفی والٹیر کا یہ بیان سامنے آیا کہ خالقِ کائنات بدی کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتا ۔ یا اِسے ختم کر نہیں سکتا ۔ ایک دوسرے فلسفی اسپیونیزا نے اِس کا یہ منطقی جواب دیا ۔ کہ یہ سب کچھ حضرتِ اِنسان کا اپنا کیا دھرا ہے ۔ اگر وہ اپنے اصل فطرتی ماحول میں رہتا، رہنے کیلئے یہ پختہ مضبوط مکانات تعمیر نہ کرتا، غاروں میں بسیرا کرتا تو اسے بھیانک تباہی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ والٹئیر' اِسپیونیزا کے اِس عقلی جواز پر برآنگیختہ ہوا اور کہا کہ یہ منطق ذہنِ اِنسان کا تخلیق کردہ ابتک کا سب سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہے ۔

چینیوں نے پانی ذخیرہ کرنے کیلئے ایک بہت بڑا ڈیم بنا کر زمین کی محوری گردِش کی رفتار کو ٦٠ء٠سیکنڈ کم کردیا ۔ اور اس طرح دِن کا دورانیہ

۰۶ء۰سیکنڈ بڑھ گیا ۔ جنگلات کے لگانے سے یا کاٹنے سے یا پھر اِن میں آگ لگنے سے ماحول متاثر ہورہا ہے۔ زمین کی شکست و ریخت کا ذمہ دار حضرتِ اِنسان خود ہی ہےَ جو قدرت کے نظام کے توازن کو بِگاڑ رہا ہے ۔

خبر ہے کہ چینی سائنسدانوں نے مصنوعی سورج اِیجاد کرلیے ہیں۔ (عربوں کے عباسی دور میں ایک کیمیا دان حکیم مقنع نے اِسی طرح کا ایک چاند بنا لیا تھا جو روزانہ رات کو ایک کنوئیں سے نکل کر اِردگرد کے پندرہ میل کے رقبے میں روشنی پھیلاتا تھا۔ بعد میں اِس نے خدائ کا دعویٰ کردیا اور ریاستی فوج کے ہاتھوں قتل ہوکر اپنے انجام کو پہنچا)۔ انسان طبعی حکمتوں اور قوانین میں اِس طرح دخل اندازی کرکے خود ہی اپنی تباہی اور بربادی کا سامان مہیا کررہا ہے۔ خدا خود اِنسان پر ظلم نہیں کرتا ۔ اِنسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ۔

اِنسانی ضمیر: ضمیر کے لغوی معنی ہیں۔ باطن، اِیمان، عدل، شعور و آگہی ____ ضمیر اپنے اعمال اور احساسات کے نیک و بد یا غلط وصحیح ہونے کے علم کا پیمانہ ہے ۔ یہ بنی نوع انسان کی شرف و فضیلت کی وہ اِخلاقی حِس ہے ۔ جِس کے معیار

پر وہ اپنی کارگردگی کو جانچتا ہے ۔ ایمانداری، انصاف، باطن، ایمان، عدل، شعور اور آگہی۔ سب اِس کے تقریباً مترادف، متابادل اور ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں ۔ ایک دِن دِماغی اور نفسیاتی امراض کے ماہر اُستاد ڈاکٹر محمد شفیق صاحب(مرحوم) نے مجھ سے کسی غیر اخلاقی حرکت سے اِجتناب کرنے کی وجہ پوچھی ۔

میں نے جواب دیا کہ میرا ضمیر اسکی اِجازت نہیں دیتا۔ میرا جواب سُن کر اُنہوں نے مزید اِستفسار کیا کہ یہ ضمیر کِس بلا کا نام ہے؟ اِس کا میں نے ایک سادہ سا جواب دیاَ کہ یہ اِنسانی دماغ کے اندر ایک تیسری آنکھ ہے جو وقتاً فوقتاً بندے کو ایک بُرا کام کرنے پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ استاد محترم نے فرمایا " تُم ایک ڈاکٹر ہو۔ تُم نے سارے اِنسانی جسم کو چیر پھاڑا ہے۔ کیا اِس قسم کی کوئ تیسری آنکھ تمہاری نظر سے گذری ہے؟ اِس کے بعد اپنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا۔ کہ "میرے والد بزرگوار مشرقی پنچاب کے شہر لُدھیانہ میں عمارتی لکڑی(ٹِمبر) کا کاروبار کرتے تھے۔ سال ۱۹۴۵ء کا تھا ۔ اُس زمانے میں لدھیانہ میں خواتین سخت پردہ کرتی تھیں۔ اِس دوران ایک جوان لڑکے اور لڑکی کا سامنے سڑک پر گذر ہوا۔

لڑکی نے مکمل حجاب اوڑھا ہوا تھا۔ صرف اُس کے ہاتھ کے ناخُن نظر آرہے تھے۔ جِن پر نیلا پالش لگا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نو بیاہتا جوڑا ہے۔ والد صاحب جو اپنے دفتر میں مصروفِ کار تھے۔ اچانک اُن کی نظر اُس جوڑے پر پڑی۔ بیساختہ زور سے کہا ۔ "بے شرم" ۔ اور یہ لفظ اتنے زور سے کہا کہ سامنے سے گذرنے والے جوڑے نے بھی سُن لیے ہونگے۔

خیر وقت گزرتا گیا، سال ١٩٥٦ ء تھا۔ میرے والد بشمول میری والدہ ۔ جوان بھائی اور بہنوں کے کراچی کے ایک سنیما گھر میں بیٹھے تھے۔ ایک انگریزی فلم دیکھ رہے تھے اور تمہیں پتہ ہے کہ ایک انگریزی فلم میں کیا کچھ نہیں ہوتا ۔ لیکن فلم دیکھنے کے بعد میرے والد صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک اچھی فلم تھی۔ آج حال یہ ھے کہ میری بیوی ڈاکٹر ہے۔ میری دو بہنیں انگلینڈ اور امریکہ میں ملازمت کررہی ہیں۔ غیر محرموں کیساتھ گُزر بسرکر رہی ہیں ۔ کم از کم ہاتھ تو غیر مردوں سے ملاتی ہونگیں۔ جوان! اب بتاؤ کہ میرا باپ بدل گیا یا پھر تمہارا فرض کردہ ضمیر؟ ضمیر کا تعلق دراصل زمانے اور معاشرے کے ساتھ ہے جو بدلتا رہتا ہے۔

جو نا خوب تھا، بتدریج وہی خوب ہوا

نِت نئے سائنسی ایجادات ۔ اِختراعات اور افکار کی اِرتقا سے دنیا میں مادی رُحجان بڑھتا جارہا ہے مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار کو مسلسل پسِ پُشت ڈالا جارہا ہے۔ آزاد خیالی اور مذہبی اقدار سے بغاوت کا مادہ پروان چڑھتا جارہا ہے۔ ان کے خیال میں انسانی معاشرے میں اب ایک خالق اور رب کی کوئ ضرورت نہیں رہی۔ اِس مادی نظام میں خداوند پاک کی حکمرانی اور قاضی الحاجات ہونے کا منصب سرمایے اور دیگر مادی سہولیات کی کثرت نے سنبھال لیا ہے۔ فرشتوں اور غیبی مخلوق کی ضرورت کو نئ نئ سائنسی اختراعات اور ایجادات کو سمجھا جاتا ہے ۔ نیکی(خیر) اور بدی(شر) کا معیار یہ ہے کہ ہر وہ شے جو ساعتِ موجود میں نفع بخش ہے وہ آج کے مادہ پرست کی نظر میں خیر ہے اور جو اشیاء اور اعمال لمحہء حاضر میں یہ فریضہ سر انجام نہیں دے رہے وہ سب شر اور بدی کے زُمرے میں آتے ہیں۔ وہ بے کار اور فضول ہیں، اِن کو چھوڑ دینا چاہئیے۔ اور اِن سے اعلانِ براءت کر لینا چاہیے۔ خداوندِ مطلق کے وجود کا تصور اِنسانی ماضی کی تاریخ کا ایک حصہ اور ضرورت سمجھا جاتا ہے جِس کی

اب آج کی دُنیا میں کوئ خاص ضرورت نہیں رہی (نعوذ ُباللہ ۔ نقلِ کُفر کُفر نباشد)

یورپ میں اب کلیسائیں غیر آباد ہورہی ہیں۔ اِن کو فروخت کیا جارہا ہے۔ مسلمان انہیں خرید رہے ہیں۔ لیکن مغرب میں مذہبی آزادی ہونیکے باوجود اِن عبادت گاؤں کو مسجد نہیں کہا جاتا اور مسلمان بھی انہیں اِسلامی تعلیمات کا مرکز کہہ کر خرید رہے ہیں۔

زندگی کا مقصد: مشہور فلسفی اِبن طفیل کا کہنا ہے کہ کائنات کی ہر چیز دوسروں کیلیئے ہے۔ درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتا۔ دریا اپنا پانی خود نہیں پیتا۔ یہ سب بہاریں، یہ برساتیں، یہ نغمے، یہ سب کے سب دوسروں کیلئے ہیں۔ بس وہی زندگی کامیاب کہلاتی ہے جو دوسروں کیلیے ہو اور مافوق الفطرت اِنسان وہ ہے جو وسیع المطالعہ ہو۔ ایسا اِنسان ایک فن کے بارے میں اِتنا کچھ بتا سکتا ہے ۔ جو اِس فن کا ایک ماہر کئ سالوں کے تجربے سے بھی نہ سیکھ سکا ہو۔ اِنسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کیلیے پیدا کیا ہے اور سب سے بڑی عبادت بِلا کِسی غرض کے صرف خالق کی رضا اور خوشنودی کیلیےمخلوق کی خدمت کرنا ہے۔ سائنس صرف پہلے سے طے شدہ طبی

قوانین دریافت کرتا ہے۔ لیکن اِن قوانینِ فِطرت کے خالق اور موجد کے بارے میں خاموش ہے۔

‘‘ اِثبات’’ کے نام سے ایک اہم کتاب اِس وقت میرے پاس موجود ہے۔ جِس کا مرکزی موضوع الحاد کا سائنسی، تاریخی و نفسیاتی جائزہ ہے۔ اور یہ عصری ادب کی ایک مشہور و مقبول صِنف ناول کے قالب اور جامے میں لکھی گئ ہے۔ اِس کتاب کے مُصنف ایک جواں سال، جوان ہمت، تازہ دَم لیکن صحیح الفکر اور ایک صاحب نظرو عقیدہ ادیب **راجہ کاشف** ہیں۔ خود بنیادی طور پر اِنجینیرنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ راجپوت مروت قوم کے سپوت ہیں۔ اِن کے اباء و اجداد ساسانی دور سے قبل اِس علاقے کے حکمران رہ چُکے ہی۔

تمہیدی تعارف میں زیر بحث لا ینحل مسائل اور پیچیدہ سوالات کا فاضل مصنف نے مختلف کتابوں کے حوالے سے بھر پور مثبت جواب دینے کی کوشش کی ہے۔اِلحاد کا سائنسی، تاریخی اور نفسیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس نظریہ کا ایک منطقی رَد پیش کیا گیا ہے۔ اُردو زبان میں اِس دقیق مسٔلے پر پہلے ہی سے مختلف الخیال دانشوروں مثلاً مولانا مودودی(رح) مرحوم، علامہ غلام احمد پرویز، غلام جیلانی برق، جی۔ ایم۔ سید، علامہ نیاز فتح پوری، جو سٹین گاردر کی کتاب "صوفی کی دُنیا"(اُردو ترجمہ)۔ کیرن آرم سٹرانگ کی کتاب "ہسٹری آف گارڈ"(اُردو ترجمہ)۔ اِدارہ "انذار" کے بانی ابو یحی' کی تصانیف ۔ ڈاکٹر پرویز ہودا

بھائ ۔ "الورد" کے بانی جاوید احمد غامدی اور دیگر دانشوروں کی کتابوں اور مُباحث سے بھر پور اِستفادہ کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں کئ نامور شخصیات کیساتھ اِن کی طویل نِشستیں اور دُو بدو مُباحثے ہوچُکے ہیں۔ اِن علمی صحبتوں اور مجالس نے اِن کے ذوقِ، فہم اور علم و دانش کیلیے ایک مہمیز اور انگیخت کا کام سر انجام دیا۔ اِن حضرات نے اپنا مُدعا دِلچسپ انداز میں بیان کرنے کیلیے مختلف ادبی اصناف کا سہارا لیا ہے جیسے خطوط، مضامین، افسانے اور آخر ایک صاحبِ حال و نظر دنیاوی اور دینی علوم سے آراستہ، وجدانِ قلبی، اطمینان اور ذہنی سکون کے خزینے ایک جدید روشن ضمیر صوفی کے ہاں سے گوہرِ مراد پا لیتے ہیں ۔ دُنیا کے عظیم ناولوں کی طرح **"اِثبات"** بھی ایک المیہ ناول ہے ۔ مشرق کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہاں دُنیاوی لحاظ سے ایک ناکام عاشق ہی ایک لافانی ہیرو بن جاتا ہے۔ مُصنف نے ایک رومانی عمل کو ابدیت، تخلیقی تصور اور ایک نئ سچائ بخشی ہے۔ انگریزی شاعر کیٹس نے اِس نئ سچائ کو یوں بیان کیا ہے۔ "تصورِ آدم کا وہ خواب ہے۔ وہ بیدار ہوا اور حوا کی سچی مورت اِس کے پہلو میں تھی" ۔

ادب کی رومانوی دنیا اِس نوردِ شوق نو خیز ادبی توانائ سے بھرپور سچائ کے مُتلاشی شہزادے **راجہ کاشف** کو اپنے حلقے کی دہلیز پر خوش آمدید کہتی ہے اور اُن سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی میلانات اور روحانی خیالات و محسوسات کو جدید سائنسی تجربات کی روشنی میں ایسے ہی ایک رومانوی قبا پہنا کر اپنے قارئین کو ہدیہ کرتے رہیں گے۔ اور مطلق ابدی سچائ کی اِس حقیقت کو اِقبال کے اسِ شعر کی تشریح اور نئےجدید ناول کی ضروریات، تجربات اور رُحجانات مدِنظر رکھ کر اور وقتاً فوقتاً سمیٹ کر اُردو ادب کی جولی میں مقصدی، تعمیری اور جدید عصری علوم کے جواہر کے اِضافے کا باعث بنتے جائیں گے ۔

ما تُرا جوئیم تو از دیدہ دور

نے غلط ما کور و تو اندر حضور

(ہم تجھے ڈھونڈتے ہیں اور تو ہماری آنکھ سے دور ہے۔ نہیں یہ بات نہیں ۔ تو سامنے ہے۔ مگر ہم اندھے ہیں)

یاد رہے کہ یہاں اندر وجود کی بجائے اندر حضور کہا گیا ہے ۔ پیرزادہ قاسم کا ایک شعر ہے:

میں ایسے شخص کوزِندوں میں کیا شمار کروں

جو سوچتا بھی نہیں، خواب دیکھتا بھی نہیں

راجہ کاشف سوچتا بھی ہے اور خواب بھی دیکھتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالی ایک وجودِ مطلق، ابدی حُسن اور ازلی سچائ کا نام ہے۔ زمانہ گزرنے کیساتھ اور انسانی ذہن کی اِرتِقا کے پہلو بہ پہلو اِس اٹل حقیقت کی ذات کا تصوربدلتا رھا ہے۔ اس لئے غاروں میں رہنے والے انسان کا تصور اور آج کے ایٹمی دور کے انسان کے تصور میں لا محالہ بہت بڑا فرق ہوگا۔ آخر جب آخرت میں جب یہ سارے پردے اُٹھ جائیں گے تب کہیں اس ذاتِ پاک کے وجود کا اصل اور صحیح ادراک ہوسکے گا۔ لیکن تب تک تو ظن و تخمین اور اندازوں سے کام لیا جاتا رہیگا۔ کھبی انکار اور کھبی اثبات ۔ ایک الھامی راہنمائ اور ہدایت کی ضرورت باقی رہیگی۔ انسان کی مثال اِس وسیع و عریض کائِنات میں ایک چیونٹی سے بھی کم ہے۔ اور جس کی عمر اور عقل اس سے بھی محدود ہے۔ وہ تو اب تک صرف اس کائنات کی وسعتوں کو ہی نہ ناپ سکے گا۔ چہ جائیکہ وہ کائنات کے خالق و موجد کی کیفیت و ماہیت اور ساخت کے بارے میں جان سکے۔ جس کی نہ کوئ ابتداء ہے اور نہ انتہا۔

انسان اس سلسلے میں کوئین کا مینڈک ہے۔ اس ننّھی اور حقیر مخلوق کی یہ ناچیز کوشش قابلِ داد ضرور ہے کہ گاہ بگاہ پُکار اُٹھتا ہے :

گفت یزداں کہ چُنیں است و دِ گر ہیچ مگو

گفت آدم کہ چُنیں است و چُناں می بالست

(اے انسان! تم دنیا میں جا تو رہے ہو' مگر جیسا میں نے اس کو بنایا ہے وہ ویسا کا ویسا رہے گا۔ اس میں بگاڑ مت کرنا۔ انسان نے کہا بالکل نہیں! یہ کائنات تو نے جیسی بنائ ہے' میں اس کو ویسا نہیں رہنے دونگا' بلکہ جیسا چاہونگا ویسا کر دکھاؤں گا۔) (اِعملو ما شئتُم ۔ القرآن ۴۰۔ ۴۱)

وھاں تغیر و تبدل اور فنا و بقا کے بارے میں فطرت کی تعزیریں اور قوانین سخت اور یہ بدلتے ہیں اور نہ کھی ٹلتے ہیں ۔ شماریات کی رو سے بھی حادثاتی کامیابی ناممکنات میں سے ہے۔ ہاں یہ زندگی ایک حجاب کی سی ہے۔ فنا کے بعد ہی پردہ اُٹھے گا۔

فاضل مُصنف نے اپنے اس ناول میں کلوننگ کی جدید تکنیک کے تجربوں پر بحث نہیں کی۔ جو آج کی سائنس کا ایک انوکھا اور دلچسپ پہلو ہے۔ اور

اس کو حیاتیاتی مخلوق کو لافانی بنانے کی ایک کوشش قرار دیا جارہا ہے ۔

کلوننگ میں سائنس دان ایک غیر تناسلی خلیے سے ڈی۔ این ۔ اے کو ایک بیضے میں منتقل کرتے ہیں۔ جس کا مرکز(نیوکلیس) اور ڈی۔ این۔ اے نکال دیا گیا ہو۔ یعنی کلوننگ ایک جنسی عمل کے بغیر کسی خاص جین ٹشو یا ڈی۔ این۔ اے کے ٹکڑے کی نقل بنانے کا عمل ہے ۔ اِس سائنسی تجربے میں تین سائنس دانوں کی کوششیں زیادہ اہم سمجھی جاتی ہیں: 1. Ian Wilmut,

2. Shoukhrat Mitalipov and 3. Rudolph Jaenisch

یہ عمل پہلی بار ۲۵ جنوری ۲۰۱۸ء کو ڈولی نامی ایک بھیڑ کی کلوننگ میں بروئے کر لایا گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کلوننگ قدرت کے تخلیقی عمل میں مداخلت ہے؟ یہی سوال اِس عمل اور تجربے کے تین موجدوں میں سے ایک وِل ناٹ سے ایک ٹی وی اِنٹریو میں کیا گیا۔ تو اس نے ایک قہقہہ لگاکر جواب دیا کہ یہ تُم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے عدم یا معد ومیت سے وجود یا ہستی کو پیدا کرنے کا دعوی' تو نہیں کیا۔ اصل تخلیق کو نقل

کرنے کی کوشش کی ہے۔ اورنقال کو اصل خالق سے کیا نِسبت ہوسکتی ہے؟ میری یہ نقالی یا فوٹو کاپی میرے دماغ کی سوچ اور منصوبہ سازی کی پیداوار ہے۔ اور میرا دماغ عطائے ربِ جلیل ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک ناپید ہونے والے گدھے کی منجمد کردہ خلیئے سے ایک کلون پیدا کیا گیا ۔ بیس سال کی عمر پاۓ اور اس کے بعد متعدد بیماریوں کی وجہ سے یہ نسل ختم ہوگئ۔

انسانوں کی اِس قِسم کی کلوننگ کا خطرہ اِس وقت تک مول نہیں لیا گیا ہے۔ اسمیں خطرات یہ ہیں کہ یہ قدرتی تخلیقی عمل میں ایک مداخلت ہوگی اور ساتھ ہی ایک بے ہنگم انسانی آبادی کے بڑھنے کا سبب بنے گا۔ ایسا عمل معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی خرابیوں کا باعث بھی ثابت ہوگا۔ کتاب ہذا میں تو اس نازک مسئلے کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ لیکن بہر حال یہ ناممکن اور بعید از عقل عمل نہیں ہے۔ اور کوئ بھی بیمار ذہن سائنسدان کسی دور دراز گمنام جزیرے میں بیٹھ کر ایسا نا عاقبت اندیشانہ خطرناک تجربہ کرسکتا ہے ۔ اور پھر پتہ نہیں یہ مجنونانہ حرکت اس خوبصورت منظم و متوازن کائنات اور اشرف المخلوقات نسلِ انسانی کی آبادی یا بربادی کا باعث ثابت ہو۔

ے محوِحیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی؟

اس ناول کی نمایاں خصوصیات میں مُصنف کا مضبوط عقیدہ، عقلی اور منطقی سنجیدہ اِستدلال، جدید ترین علوم تک رسائ، پُر تاثیر سادہ اِنشا نگاری، دوستانہ غیر متعصب علمی مکالمہ بازی اور سائنسی فکری تجزیاتی اندازِ بیان، وہ عناصر ہیں جو اِس ناول کو اُردو ادب کی دُنیا میں غیر معمولی پذیرائ اورقابلِ توجہ حثیت بخشیں گے۔ مصنف نے اس جدید ناول کے فنی عناصر کا خاطر خواہ خیال رکھا ہے۔ ابہام کی حدود تک ایک تجسُس کی فضا قائم رکھنے کی کوشش آخر تک برقرار رکھی ہے۔ اس کو ہم ایک رومانوی مگر روحانی اور سائنسی ناول کہہ سکتے ہیں۔ کرداروں کے مکالمے جاندار اور بے تکلفانہ ہیں۔ مصنف کو ہم ابو یحییٰ کے مکتبِ فکر کا فعال اور مہذب اعتدال پسند فکر و خیال کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔

مذہب' فلسفہ اور سائنس : میرے خام خیال میں مذہب اور عقل (فلسفہ اور سائنس) میں مطابقت اور یگانگت پیدا کرنے کی کوشش صحیح بات نہیں ہے۔ سائنس ار فلسفے کے نظریات و مشاہدات وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب ایک راسخ عقیدے اور ایمان کا نام ہے' جو ابدی۔ ازلی حقیقت

ہے۔ اور پھر اسلام تو خدا کا آخری پیغام اور نمائندہ دین ہے ۔ یونانی دانش وروں سقر اط ۔ افلاطون اور ارسطو نے اِس مطلق سچائ کو عقل۔ گمان و قیاس کی کمندیں ڈال کر سُلجھانے کی کوششیں کیں۔ ہندوستان میں مہاتما بدھ اور اسکے بھکشوؤں نے چِلوں، فاقوں، نفس کشی اور تپیسا کی سخت مشقتیں برداشت کرکے اندرونِ نفس کے نہانخانے میں غوطہ لگا کر اسے ڈھونڈ نے کی سعی کی۔ چین کے کنفیوشس اور ایران کے زردشت نے اس مقصد کے لیے چند اخلاقی اصولوں کا سہارا لیا۔ چند سال پیشتر بیلجئم کے ایک پادری اور ماہر فلکیات جارج لیمیتیر نے بِگ بینگ تھیوری معلوم کرنے کے ساتھ کائنات کی وسعتوں کی تخلیق کو اربوں سال پہلے ایک کائناتی بیضے(کاسمک ایگ) کا فِشار فرض کیا۔ لیکن ان ظاہری مادی حواس سے اصل مسبب الاسباب موجد و خالق کے وجود کو ثابت نہ کرسکا۔ اور اس بارے میں خاموشی کو بہتر حکمت جانا۔ اس طرح انسانی علوم یعنی یونانی فلسفہ ۔ فلسفہء ہندی اور مغربی سائنسی دریافتیں اس عظیم بھید کی عُقدہ کشائ میں ناکام رہے۔ انسانی تاریخ میں انبیائےکرام کی وحی و الہام کی وجدانی ۔ روحانی اور ما فوق الحواس کیفیت ہی اس کے جلوے اور مشاہدے کا ادراک کرسکی۔ ادراک

اور مشاہدے کی یہ نعمت بِن مانگے۔ بے طلب اور بغیر کسی تلاش و خواہش کے' حضرت سیدنا موسی'(ع) کو کوہ طور پر اس وقت ملی جب آپ اپنی اہلیہ اور چند بھیڑوں کے ساتھ آگ لینے کوہ سینا پہنچے۔ رسول پاک حضرت محمدﷺ کو وادئ فاران کے غارِ حِرا کی تنہائ میں پیغام ِحق پہنچایا اور سُنایا گیا۔ ہمارا یہ نوردِ شوق ناول نگار بھی اس حیرت کدے کی بھول بھلیوں میں "افلا یتدبرون اور افلا یتفکرون" کے قُرآنی ٓاحکام پر عمل کرتے ہوئے کئ منازل اور مراحل سے گذرا۔ اب فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے ـکہ اس تگ و دو کے بعد اِن کے ہاتھوں کیا آتا ہے؟

ے کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیرکریں کوہِ طور کی

پاکستانی معاشرہ اور قومی تشخص کا بُحران

لِسانِ پاکستان جسٹس محمد رُستم کیانی(۱۹۰۲ تا ۱۹۶۲) کا ایک کافی با معنی قول ہے: " ۱۹۴۷ میں ہم ایسی قوم تھے جو ایک ملک تلاش کررہی تھی۔ آج ہم ایسا مُلک ہیں جو اپنے لیے ایک "قوم" ڈھونڈ رہا ھے۔"

معاشرے کے لغوی معنی ہیں ۔ سماج' فرقہ' شرکت' گروہ' مجلس' رفاہِ عام کی جماعت۔ اِس طرح سوشیالوجی (علمِ معاشرت ' علمِ تمدن ' سماجیات اور عِمرانیات) اس شعبہ سائنس کا نام ہے جو اِن قوانین کی تحقیق یا چھان بین کرتے ہیں جو انسانی معاشرے کے سارے مراحل کو منظم کرتے ہیں۔

علمِ سماجیات کی روح سے معاشرے کی تعریف یوں بیان کی گئ ہے۔ " معاشرہ افراد کے ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے کہ جس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی میں ایک دوسرے سے مشترکہ روابط موجود ہوں۔ اور معاشرے کی تعریف کیلئے یہ لازمی نہیں کہ اِن کا تعلق ایک ہی قوم یا ایک ہی مذہب سے ہو۔ اِسلام میں مشترکہ بنیادی ضروریات زندگی کے اِس تصور کو مزید بڑھاکر بھائ چارے اور فلاح و بہبود کے معاشرے کا قرآنی تصور ایسا ہے کہ جس کے مُقابل معاشرے کے تمام لغوی تعریفیں اپنی چمک کھو دیتی ہیں۔

معاشرے کی تشکیل میں مختلف الانواع تاریخی، سماجی، مذہبی، سیاسی، معاشی اور جغرافیائ عومل شامل ہوتے ہیں۔ اِمام غزالی(رح) کا نظریہ یہ تھا کہ ایک نئ ریاست تب وجود میں آتی ہے جب وہاں کے لوگ آپس میں اِختلاف کریں تو پھر ایک

علیحدہ مملکت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو کہ قانون، اِنصاف اور حکمران پر مشتمل ہو اور ایک نظام نافذ کرسکے۔

اپنے تشخص کی تلاش : ہر انسان شروع ہی سے اپنی تشخص(شناخت) کی تلاش میں سرگردان ہے ۔ یہ مذاہب، معاشرے، قومیں، تہذیبیں اور دیگر مختلف اِدارے سب ہی تشخص کے مناظر ہیں۔ تشخص انسانی کردار کا تعین کرتا ہے ۔ اور" انسانی سطح کا یہ تشخص اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے ۔ جبکہ دیگر تشخیصات مقصد کے حصول کے بعد ضائع ہوجاتے ہیں"۔ اس نظریہ کے حامی خودی کے حدود کو محدود سمجھتے ہیں۔ اور اس کی بجائے انسانی تشخص پر زور دیتے ہیں۔ اِنسان کی مانند ہر قوم بھی ہر وقت اپنے قومی بحران سے گذرتی ہے ۔ یہ بحران مثبت اور منفی دونوں قسم کا ہوسکتا ہے۔ جو انسان یا انسانوں کے ایک گروہ کو بحثیت ایک قوم کے عروج یا زوال کی سمت لے جاتا ہے۔ اِس فلسفے کے مغربی مبلغوں میں پرہفیسر آرکسن، ڈبلیو جیمز، ایف ڈبلیو شیلنگ اور ہندو جوگی راجنیش شامل ہیں۔ پاکستان میں ڈھیری زرداد خان (چارسدہ) کے پروفیسر اِنعام اللہ جان (مرحوم) نے بھی اِس موضوع پر کئ بین

الاقوامی شہرت کے رسالوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ پاکستانی قوم جو آج بھی اپنے تشخص پانے کی کوشش میں سرگرداں ہے، کو چاہیے کہ اِن کتابوں کو پڑھیں اور اپنا عقیدہ اور نظریہ صحیح کریں۔

اِس نظریہ کے تحت ایرانی قوم موجودہ بحران اور اِنقلاب کی بہترین توجیح اور تشریح کرسکتی ہے۔ ایک قوم کی ترقی کا پیمانہ وقتِ حاضر میں یہ تھا کہ اِس قوم کی فی کس آمدن زیادہ ہو اور اس آمدن کا فائدہ معاشرے کے ہر فرد تک بغیر کسی امتیاز کے پہنچے۔ لیکن ایران کے اِسلامی اِنقلاب نے اس نظریے کو غلط ثابت کردیا۔ شاہ ایران کے زمانے میں ایران کی فی کس آمدنی اکثر ممالک سے زیادہ تھی لیکن بدقسمتی سے ایرانی قوم اپنا اِسلامی تشخص کھو چُکی تھی۔ وہ شاہ کے زمانے کی نام نہاد ترقی سے مطمئن نہ تھی۔ یہ قوم کافی قربانییوں اور تکالیف سہنے کے بعد ایک اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئی۔ پاکستانی قوم بھی پچھلے پچھتر (۷۵) سالوں سے اپنی تشخص کو پانے میں مصروف ہے لیکن ابھی تک اصل اور سچے انقلاب کے اِس راستے سے کوسوں دور ہے۔

قوم کی تعریف: اُردو لُغت میں عام طور پر قوم سے مُراد کسی خاص افرادی گروہ کی لی جاتی ہے جس کی اقدار اور روایات آپس میں مشترک ہوں۔ یعنی یوں کہا جاسکتا ہے کہ لفظ "قوم" اصل میں انگریزی حرف "نیشن" کے متابادل اکثر استعمال ہوتا ہے۔ جس کو بعض اوقات اُمت یا اُمہ کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا ھے۔ علمِ معاشرت اور علمِ سیاست میں نسل، قوم، ذات، اُمت اور شہریت جدا جدا اصطلاحات ہیں جو یکسر الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ نسل اور زبان ایک دوسرے سے کوئی تعلق اور رشتہ نہیں رکھتے۔ البتہ ایک قوم کی شناخت میں زبان ایک اہم عنصر ہے۔ اور ایک اہم کردار اور مقام ادا کرتا ہے۔ زبان انسانی نسل یا نسل زبان کی بنیاد نہیں بن سکتی ۔ اسی طرح انسانی نسلیں ایک دوسرے پر کسی قسم کی فوقیت، فضیلت یا برتری نہیں رکھتیں۔ اور اس فضیلت یا برتری کا انسانی تاریخ میں خاص حالات اور زمانے میں ایک جذباتی کردار ہے اور بس۔

نسل اپنی بنیاد ایک شجرے پر قائم کرتی ہے۔ کہ کِس کے بیٹے ہو اور کِس کے پوتے اور پڑپوتے ہو، کون ہیں تیرے اجد اد، کس قبیلے سے ہے تو، تیرے اباء و اجداد کا سلسلہ کہاں سے چلا، کس اہم

شخصیت کے بعد تمہارا ایک جُدا تشخص شروع ہوا۔

قوم ایک وطن، زبان، ثقافت اور تہذیب کی حامل ہوتی ہے۔ذات ایک پیشے یا کسب کی نشان دہی کرتی ہے۔

اُمت عربی زبان میں ملت یا قوم کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے ۔ اور ایک مذہبی اصطلاع ہے ۔ جیسے ملتِ ابی ابراہیم ۔ ملت کے اُردو معنی دین، مذہب، شریعت، میل جول، ربط ضبط، راہ و رسم، ملاپ، مسلمانوں کی جماعت، گروۂ مسلمین، ملنے والوں کا جتھا، اپنے میل کے لوگ، سنگت، محبت، مشرب وغیرہ ہیں۔

اُمت وہ جماعت یا جمعیت جو اسلام کے نام پر ایک امام، پیشوا کی سربراہی میں اِکھٹی ہو۔

شہریت کسی ریاست کے حدود میں ایک شہری کے حقوق اور تشخص کا تعین ہے۔

مثلا" پشتو کے نامور شاعر اور ادیب ہوتی مردان کے ڈاکٹر اِسرار نسلاً سیّد ہیں۔ پشتون اِنکی قومیت ہے۔ شہریت پاکستان کی رکھتے ہیں۔ ذات، کسب یا پیشہ کے لحاظ سے وہ شعبہء طِب سے وابستہ رہے ہیں۔

ملتِ اِسلامیہ کے سپوت اور اُمتِ محمدیﷺ کے پیروکارہیں۔

ہندوستانی مہاجر پٹھان: ہندوستان سے مہاجر ہوکر پاکستان آنے والے پٹھان نسلاً افغان ہیں۔ البتہ قوم اور ذات کے لحاظ سے وہ پشتون نہیں ہیں لیکن اب اِنکی شہریت پاکستانی ہے اور عظیم ملتِ اِسلامیہ کا جُزِ لاینفک ہیں۔

کہاں گنگا جل اور کہاں کُرم کا پانی: ہندوستانی مہاجرین جب اِبتداء میں یہاں آئے ۔ تو مقامی آبادی نے اِن نئے مہمانوں کا اِستقبال انصارِمدینہ کی مثال سامنے رکھ کر انتہائ تپاک اور گرم جوشی اور اِسلامی برادری کے جذبے کیساتھ کیا۔ اِن کو زمینیں اور گھر اِلاٹ ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد مواخات اور مُؤدت کا یہ رشتہ اور جذبہ کمزور پڑتا گیا۔ جلد ہی نوالے کی جنگ اور ذاتی مفادات کا ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ گنگا جمنی اور کُرم و ابا سین کی تہذیبی اقدار کا اِختلاف سامنے آتا گیا۔ بدقسمتی سے کسی بھی سیاسی پارٹی یا فلاحی انجمن نے اِن متضاد المزاج اقوام کو ایک لڑی میں پرونے کی سعی نہیں کی۔ اس طرح ایک مُشترکہ پاکستانی قومیت تشکیل نہ پاسکی۔ تعصب، نفرت، حقارت اوراحساسِ برتری و کمتری کی

گھمبیر فِضا چھانے لگی۔ یہاں میں مِثالاً اپنے لڑکپن کے سکول کے زمانے کے دو تین چشم دید واقعات بطورِ درسِ عبرت و مقصد بیان کرنا چاہوں گا۔

۱)جہان خان وزیر اپنے گاؤں عظیم کلی (ڈومیل۔ بنوں) کے سکول میں اُستاد تھے۔ ڈائریکٹر تعلیمات دورے پر آئے۔ سکول کے معائنے کے دوران ماسٹر صاحب کی اعلیٰ کارکردگی سے متآثر ہوئے ۔ سوچا ایسے لائق فائق استاد کو شہر میں ہونا چاہیئے۔ فوراً اُن کی تبدیلی اِسلامیہ ھائ سکول بنوں کردی۔ اُستاد صاحب کو یہ شاباش اور اِنعام مہنگا پڑا۔ خرچہ بڑھ گیا۔ ساتھ ہی رہائش کی خاطر کرائے کا مکان بھی نہیں مل رہا تھا۔ ہندوستان سے مہاجرین نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ اُستاد صاحب جِس گھر کا دروازہ کھٹکٹاتے، وہاں پہلے ہی سے ایک مہاجر براجمان نظر آتا۔ اُستادِ محترم کے غصے کا نزلہ ہمارے ایک ہم جماعت رفیق پر گرتا۔ ا،س بیچارے کی تو گویا شامت ہی آگئ۔ ماسٹر صاحب کھلے عام فرماتے ۔ کہ صرف تمہاری وجہ سے آج میں تکلیف و آذیت میں ہوں۔ معمولی سی لغزش پر بیچارے رفیق کو بُری طرح کی مار پڑتی ۔

۲) چھٹی جماعت میں ماسٹر مقبول صاحب ہمیں اُردو کا مضمون پڑھاتے تھے۔ میانوالی (پنجاب) سے تعلق تھا یعنی پنجابی تھے۔ ایک روز سخت غصے کی حالت میں کمرہ جماعت میں داخِل ہوئے۔ آتے ہی کم سِن رفیق پر برس پڑے۔ باقی بچوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ کہ اللہ خیر، رفیق سے کیا جُرم سرزد ہوگیا۔ جِس کی یہ سزا ہے؟ آخر جب رفیق کی چیخیں آسمان تک پہنچنے لگیں اور اُستاد بھی مارتے مارتے تھک گئے ۔ تب انہوں نے اِس مارکُٹائ کی یہ وجہ بیان کی کہ کل شام بازار میں پیدل جارہا تھا۔ پیچھے سے یہ رفیق حرامزادہ سائیکل پر سوار انتہائ تیز رفتاری سے آیا۔ میں بڑی مشکل سے سائیکل کی ٹکر کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ یہ منحوس سائیکل سے اُترا۔ بڑی بے تکلفی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے کندھوں پر رکھا اور یوں بولا: '' آؤ یار تمہیں چائے پلاتے ہیں" ۔ اس بد تمیز اور بد اخلاق کو دیکھو کہ اُستاد کو یار کہا اور اِتنی جراءت اور آزادی کہ سرِبازار چاذے پِلانے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی مہاجر رفیق کو مشہورِجہان پشتون عزت افزائ اور مہمان نوازی کی ایک اعلیٰ صفت کے بد لے میں دوبارہ ایک لات جھاڑ دی۔ آ خر یہ نا آشنا از آدابِ پنجابی و افغانی رفیق مہاجر جو فارغ وقت شہر میں قلفی

ملائ فروخت کرتا تھا، اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ عازمِ کراچی ہوا اور وہاں مستقل آباد ہوگیا۔

۳) ہماری گلی میں اشرف علی نام کا ایک لڑکا اپنے والدین کیساتھ قیام پذیر تھا۔ اِس کا رنگ سیاہ مائِل تھا۔ لیکن اِس کے ننھے بھائ کا رنگ گورا تھا۔ ایک دِن وہ اپنے چھوٹے بھائ کو گود مین لیے گلی میں کھڑا تھا۔ دریں اثناء ہمارے پڑوس کے ایک معزز اور معتبر رھائشی ڈاکٹر شریف بمعہ اپنے دو محافظوں کے برابر سے گذر رہے تھے۔ اِن میں سے ایک محافظ بولا: ‘‘قدرت کی شان دیکھو۔ ایک بھائ کالا اور دوسرا سفید ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً گرہ لگائ : "کہاں گنگا جل اور کہاں دریائے کُرم کا پانی !" آج میں سوچتا ہوں کہ حیدر آباد، کراچی اور سکھر میں سارے مہاجر خاندانوں کے آباد اور یکجا ہونے اور پھر "مہاجر قومی اتحاد" کے نام سے ایک سیاسی تنظیم کے معرضِ وجود میں آنے کی سب سے اہم وجہ اِن معاشی نا اِنصافیوں اور گنگا و کُرم کی تہذیبوں میں سماجی، معاشرتی، تعلیمی اور اخلاقی اقدار کے فرق کا بہت بڑا ہاتھ ہے، جسے کسی نے بھی

سائنسی انداز میں اِس فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

پاکستان کی پانچ بڑی قومیتیں: پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے وقت اِس خطے میں پانچ بڑی قومیتیں آباد تھیں: پنجابی۔ پشتون۔ سندھی۔ بلوچ اور بنگالی۔ بعد میں کشمیر کا کچھ حصہ بھی بھارت و پاکستان کے درمیان ایک فوجی جنگ کے نتیجے میں آزاد کشمیر کے نام سے شامل ہوگیا ۔ آزادی سے قبل اِن قومیتوں کے بارے میں ایک نو آبادیاتی تصور کچھ یوں تھا:

Rule the Punjabi,

Buy the Pukhtoons,

Suppress the Sindhi,

Respect the Baloch,

Appease the Bengali and

Exploit the Kashmiri.

ترجمہ : پنجابیوں پر راج کرو

پشتونوں کو خرید لو

سندھیوں کو د باؤ

بلوچوں کو عزت دو

بنگالیوں کو راضی کرو

اور کشمیریوں کا اِستحصال کرو۔

بنگال کے جناب حُسین شہید سُہروردی پاکستان کے ایک سابق وزیرِاعظم گذرے ہیں۔ مغربی پریس اُنکی سیاسی بصیرت اور ذہانت کا اِنتہائیٔ معترف تھا۔ امریکہ نواز مشہور تھے۔ وَن یونٹ منصوبے کے سخت حامی تھے۔ جسمیں اُس وقت کے مغربی خِطے کے چاروں صوبوں پنجاب، صوبہ سرحد(پشتونخواہ)، سندھ اور بلوچستان کو ایک اِنتظامی یونٹ قرار دے کر مغربی پاکستان کا نام دیا گیا ۔ اور اُس وقت کے مشرقی حصے کو مشرقی پاکستان کے نام سے منسوب کیا گیا۔ لیکن یہ منصوبہ چند ہی سال میں ناکام ہوگیا۔ لیکن اِس ناکامی سے پہلے ہی سہروردی صاحب مرحوم نے اِسی وَن یونٹ کے تنازعے پر وزارتِ اعظمیٰ کے عُہدے سے اِستعفیٰ دیکر بنوں کے ایک عوامی جلسے میں یہ تاریخی الفاظ کہے تھے : "بھائیو! پنجاب پنجابی کو مَل جائیگا ۔ سرحد پٹھان کو، سندھ سندھی کو اور بلوچستان بلوچ کے حصے میں آجائے گا۔ بنگال پہلے ہی بنگالی کے قبضے میں ہے۔ بھائیو! آخر یہ پاکستانی کہاں جائے گا ۔ مہاجر کہاں جائیگا؟"

آج ماشا اللہ اِن پانچوں بڑی قومیتوں کو اپنا تشخص قومی دارے میں مِل گیا۔ لیکن وہ بے چارہ پاکستانی اپنا قومی تشخص تلاش کرنے کی کوشش میں تا حال سرگردان ہے ۔

پاکستانی قومیت: پچھتر سالوں کے بعد بھی پاکستان کی پانچ بڑی قومیتیں بد قسمتی سے ایک متحدہ قومیت نہ بن سکی۔ اِسی کشمکش میں بنگالی ہم سے الگ ہوگئے ۔ عہدِ جدید میں امریکہ ایسا مُلک ہے جہاں بر اعظم ایشیا اور افریقہ سے آ ئے ہوئےلوگوں کے علاؤہ یورپ کی متعد د اقوام (پُرتگیزی ۔ روسی ۔ ہسپانوی ۔ انگریز۔ فرانسیسی وغیرہ) سب ہی آباد ہیں۔ افریقہ سے تو بزورظلم و جبر کثیر تعداد میں غُلاموں کی صورت میں لایا گیا۔ امریکہ کے اصل باشندوں " ریڈ اِنڈ ینز" کو بھی جورو جفا کے ہتھکنڈوں سے بالآخر امریکی قومیت میں شامِل کیا گیا ۔ فرقہ پرستی کا شِکار "آمِش " قبیلہ بھی اپنے سارے حقوقِ رسوم و رواج کے ساتھ امریکہ میں عزت و مرضی کی زندگی گزار رہا ہے ۔ حقوقِ اِنسانی کی تحریکیں اپنے من پسند بنیادی نسوانی حقوق کو تسلیم کرواچکی ہیں۔ امریکی کانگرس کی لائبریری میں ملازم ایک سیاہ فام دوشیزہ سے جب ایک بار پوچھا گیا کہ اِس کے آباء و اجداد کو افریقہ کے کس مُلک سے لایا گیا ہے یا وہ خود اپنی مرضی سے بغرضِ روزگار اور بہتر مُستقبل کی تلاش میں آئے ہیں۔ تو اِس نے بلا توقف بڑے فخر سے جواب دیا کہ آج بس میں فقط امریکن ہوں۔

میں اِس برین واش اور یک قومی یکجہتی کے خیال اور نظریے کو محسوس کرکے حیران رہ گیا ۔ امریکی آخر میں کمزور اور اپنے ہاتھ سے زخمی ظکردہ حریف سے اِ س کہاوت کے تحت دوستی کا رشتہ اِستوار کر لیتے ہیں:

"Take a knife and cut open the Earth, and with time, the grass would heal it"

(ترجمہ: ایک چاقو لے کر زمین کے سینے کو چیرو۔ وقت گزرنے کے ساتھ گھاس اِس زخم کو بھر دے گا")

پاکستان میں بھی مختلف تقسیم قومیتوں کا ازالہ اِن کو آئین میں دئے گئے متناسب اور مساوی حقوق اور اپنا اپنا حصہ دے کر کیا جاسکتا ہے۔

قومی زبان کا مسئلہ: پاکستان میں چار بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ جہاں تک دیگر علاقائ زبانوں کا تعلق ہے تو یاد رہے کہ صرف شمالی علاقہ جات میں اڑتیس(۳۸) بولیاں سُننے کو ملتی ہیں۔ مگر صرف اُردو ہی پاکستان کے ہر صوبے اور علاقے میں بولی اور سمجعی جاتی ہے ۔ عدالتِ عالیہ کے ایک فیصلے اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے ۔

انجمنِ نفاذِ اُردو اِس سلسلے میں کافی زور لگارہی ہے ۔ اِس کا مطالبہ ہے کہ آئینِ پاکستان اور عدالتِ عالیہ کے فیصلے پر عمل کرکے اُردو کو سارے مُلک کی سرکاری زبان قرار دیا جائے ۔ لیکن اِس فیصلے کے عملی نفاذ کی راہ میں خاص کر سندھ ۔ پشتونخواہ اور بلوچستان کی قوم پرست جماعتیں حائِل ہیں ۔ اِن کا دعوی' ہے کہ صوبائ زبانوں کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے ۔ جبکہ اُرد و اِن کے مقابلے میں نوزائدہ ہے اور صرف یو۔ پی 'سی ۔ پی اور حیدر آباد کے مہاجر باسیوں کی مادری زبان ہے۔ اِن مقامی زبانوں کے علمبردار اِصرار کررہے ہیں کہ ہر صوبے کی الگ قومی سرکاری زبان ہونی چاہیے ۔ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش کی صورت میں ایک الگ ملک بن جانے کی اولین اہم وجہ بنگلہ زبان کو اُن کی آبادیاور ثقافتی ۔ تاریخی اور تمدنی برتری کے باوجود ا، کو قومی سرکاری زبان تسلیم نہ کرنا تھا ۔ اِس سلسلے میں سندھی تو کافی عرصہ سے صوبہ سندھ کی ایک تسلیم شُدہ سرکاری زبان ہے ۔ دفاتر ۔ کاروبار اور اشتہارات کی زبان سندھی ہے ۔ صوبہ پشتونخواہ میں بھی یہ مطالبہ بڑے زور شور سے ہورہا ہے۔ اگرچہ ایک اہم قوم پرست جماعت اپنی چند سیاسی مجبوریوں کے تحت اپنے دورِھکومت میں صوبائ اِسمبلی

سے اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کی قرارداد سالوں پہلے مجبور کراچکی ہے ۔ البتہ یہ قوم پرست حلقہ اُردو کو ایک بین الصوبائ رابطہ کی زبان تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن عملا" ابتک انگریزی مُلک کی سرکاری زبان ہے ۔ کئ ممالک میں ایک سے زیادہ قومی زبانیں رائج ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں ہر جگہ بیک وقت چار زبانوں میں سائین بورڈ نظر آتے ہیں کیونکہ وہاں آئینی طور پر چار قومی زبینیں تسلیم شدہ ہیں۔ ہندوستان میں تو ڈیڑھ ہزار زبانیں مستعمل ہیں ۔

اِس مسئلے کا حل:

کمپیوٹر کی ترقی سے اب یہ مسئلہ آسان ہوگیا ہے ۔ جدید کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں اب یہ سہولت موجود ہے کہ کسی زبان کو بھی دوسری زبان میں با محاورہ ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو ترقی دینے اور اِس سہولت کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے یہ مسٔلہ آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

مذ ہب : پاکستانی معاشرے میں مذہب کا کِردار نہایت اہم ہے ۔ پاکستان بنا ہی کلمہ طیبہ اور اسلامی اقدار کو ترقی دینے کے اساس پرہے ۔ بد قسمتی

سے سُنی ۔ شیعہ کی تفریق کے بعد اہلِ سُنت الجماعت بھی کئ فرقوں میں تقسیم ہے ۔ دیو بندی ۔ بریلوی اور اہلِ حد یث کی مختلف شاخیں ہیں ۔ احمدی یا مرزائ گروہ بھی ان ہی سے گمراہ ہوکر ایک نئے مذہب کی شکل اختیار کرگیا ۔ مغربی علوم ۔ ٹیکنالوجی اور اقدار سے متاثر مسلمان اکابر نے علی گڑھ کالج اور بعد میں یونیورسٹی کی بُنیاد رکھی ۔ ندوۃ العلموم اور جامعہ ِملی کے اساتذہ اور شاگردوں نے درمیانی راستہ جامد تقلید کی بجائے تحقیق اور تفتیش پر زیادہ کام کیا۔ اِس گروہ میں شبلی نعمانی ۔ ابوالحسن ندوی اور سید سُلیمان ندوی (رح) جیسے جید عالم اور محقیقین شامل تھے ۔

پاکستان کی شکل میں ایک جدید اسلامی مملکت کے مطالبے نے اس فرق کو اور زیادہ واضع کردیا۔ بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء اور گدی نشینوں نے کُھل کر پاکستان کی حمایت کی ۔ جبکہ دیو بند دو حِصوں میں بٹ گیا۔ شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (رح) اور مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ساتھی متحدہ ہندوستان کے حق میں تھے اور اِس مسئلے پر آل انڈیا کانگریس کے مطالبے کے حامی اور ہم نوا تھے ۔ جبکہ شیخ القرآن مولانا شبیر احمد عثمانی(رح) ' شیخ الاسلام

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی(رح) کے اِرشاد اور تاکید پر مسلم لیگی قیادت کی پُشت پناہ تھی ۔

قیامِ پاکستان کے بعد اِن چاروں صوبوں میں اِن دینی اور مذہبی جماعتوں کا افرادی اور سیاسی اثرو رسوخ کچھ یوں بن گیا:

سابقہ صوبہ سرحد(پشتونخواہ) میں قیامِ پاکستان کے فورا" بعد دارالعلوم دیوبند کی نمایٔندگی کا منصب اِس مکتبہ فکر کے ایک مدرس مولانا عبدالحق(رح) نے سنبھالا اور دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی بنیاد رکھی۔ اِس مدرسے سے فارغ التحصیل علماء نے پاکستان کے مختلف علاقوں خاص کر پشتونخواہ اور بلوچستان کے شہروں اور دیہات میں مدارس قایٔم کیے ۔ ساتھ ہی تبلیغی جماعت جو غیر سیاسی جماعت ہے لیکن دیوبندی افکار کی ترویج و تبلیغ کرتی ہے' نے پشتونخواہ کے کثیرتعداد میں عوام کو متآثر کیا۔ عرصہ دراز سے اِس علاقے میں کوئٔ کرشمہ ساز طلسماتی بزرگ شخصیت پیدا نہیں ہوئٔ جو بریلوی مکتبہ فکر کو آگے بڑھاسکے ۔ یہانتک کہ اب پشتونخواہ میں اِس مکتبہ فکر کے آستانے اور خانقاہی نظام اپنا اثر و رسوخ تیزی سے کھوتے جارہے ہیں۔

آج فرقہ ورانہ اور مذہبی محاذوں پر ملک کی سیاسی صورتِحال مختصرا' یوں بیان کی جاسکتی ہے: پشتونخوا کی سیاست پر تقریبا" مکمل طور پر دیوبندی علماء کی گرفت مضبوط ہے۔

بلوچستان میں عوام دیوبندی علماء اور سیکولر خیالات و مزاج عناصر اور رہنماؤں کے زیرِاثر بٹی ہوئی ہے۔ وقتا" فوقتا" پشتونخوا ۔ سندھ اور بلوچستان میں فضا سیکولر قوم پرست رہنماؤں کی آواز سے پورے زور سے گونجنے لگتی ہے ۔ مہاجر قومی محاذ کا زور و اثر ابتک صرف کراچی۔ حیدر آباد اور سکھر کے شہروں تک محدود ہے۔ جیسے کے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے ۔ یہ بنیادی طور پر ایک کٹڑ قوم پرست جماعت ہے۔ ساتھ ہی کافی حد تک سیکولر خیالات کی حامل ہے۔ جس نے ماضی کے مذہبی جماعتوں ' جماعتِ اِسلامی اور جمیعت العلماء پاکستان(نورانی گروپ) سے سیاسی قیادت چھین لی ہے۔ باوجود حالیہ ٹوٹ بوٹ کے ' مہاجر قومی محاذ ابتک سیاسی اور عوامی سطح پر اپنی برتری برقرار رکھے ہوئے ہے ۔

ہمارے سابقہ قبائلی علاقوں میں تحریکِ طالبان پاکستان(ٹی-ٹی- پی) کا اثرورسوخ بھی بڑھتا جارہا

ہے۔ ۲۰۱۸ء کے اِنتخابات میں دو ایک نشستیں بھی جیت چُکے ہیں۔ اِس جماعت کو دہشگرد تنظیموں سے منسلک سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ خود آئینِ پاکستان اور وجودِ پاکستان کا پابند بتاتے ہیں۔ اِن کے ظاہری مطالبات میں قبائیلی علاقوں کو صوبہ پشتونخوا سے جُدا الگ صوبہ تسلیم کرنا اور دہشت گردی کے اِلزام میں ملوث قیدیوں کی رہائ اور لاپتہ گم شدہ افراد کی باز یابی شامل ہیں ۔

معاشرے کی طبقاتی تقسیم:

ہمارا پاکسانی معاشرہ تین اہم طبقوں مین تقسیم ہے:

۱۔ اشرفیہ طبقہ

۲۔ درمیانہ طبقہ

۳۔ نچھلا طبقہ

مندرجہ بالا تقسیم فرد کی سالانہ آمدنی ۔ معاشی اور سماجی حثیت کی بِنا پر ہے ۔ ان ہی حثیتوں کے مطابق ہمارے معاشرے میں عزت و احترام اور برتری کے معیار ہیں ۔ جس کا اظہار درج ذ یل عنوانات کے تحت نظر آتا ہے:

۱۔ روحانی تکریم : ایسی قدر افزائ ہمارے معاشرے میں آستانہ داروں ۔ علمائے کرام۔ اولیائے عظام ، سیدوں اور پیروں کی اولاد کو حاصل ہے۔ نذرانوں، شکرانوں، صدقات، چندوں، قوم اور حکمرانوں کی جانب سے اِن کی قربانیوں، فتوؤں، خدمات اور دعاؤں کے حوض عطا کردہ عطیے اور تحا ئف، ان کی آمدن اور برتری کے ذرائع ہوتے ہیں ۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال اپنی ایک نظم "باغی مُرید" میں اس طبقے کی استحصالی ۔ سماجی برتری کی وجوہات کو اِن اشعار میں بہترین انداز میں اُجاگر کرتے ہیں:

نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا

ہر خرقہء سالوس کے اندر ہے مہاجن

میراث میں آ ئ ہے اِنہیں مسندِ اِرشاد

زاغوں کے تصرف میں ہے عقابوں کا نشیمن!

۲۔ سیاسی توقیر: اِس قسم کی عزت ہمارے معاشرے میں جاگیر داروں ۔ سرمایہ داروں اور بیوروکریٹس کو حاصل ہے جو زور ۔ جبر اور ظُلم کے اِسبتدادی حربوں پر قائم رکھی جاتی ہے۔

سیاسی حالات کے مطابق یہ طبقہ اپنا چُغہ بدلتا رہتا ہے ۔ مُغل، افغان، سکھ، انگریز ادوار ہوں، خواہ جمہوری نظام یا ڈکٹیٹرشِپ اِس طبقے کی حمایت یا مخالفت کسی نظریہ کی بجائے وقتی سیاسی مصلحت، سیاسی ضرورت اور زیادہ سے زیادہ ذاتی منفعت کے اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے تاریخ کے ہر دور میں یہ لوگ سرخرو رہتے ہیں ۔ تقسیمِ ہند کے بعد بھارت میں وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اِن نوابوں اور راجاؤں کی بڑی بڑی جاگیروں کو زرعی اِصلاحات کرکے ختم کردیا۔ ٹاٹا اور برلا کے کارخانوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان کی جمہوری پارلیمنٹ میں اشرافیہ کی اکثریت اور بالا دستی کی وجہ سے اِصلاحات کا ایجنڈا کامیاب نہیں ہوسکا۔ اگرچہ صدر ایوب خان اور وزیر اعظم ذولفقار علی بھٹو نے اپنے طور پر اور صوبائ سطح پر پنجاب میں وزیر اعلی'ممتاز دولتانہ اور سرحد میں عبدالقیوم خان نے کچھ معمولی نرم زرعی اِصلاحات بادِلِ ناخواستہ ضرور کیں۔ مگریہاں ایک عام آدمی کو ریاست کے معاملات میں شرکت کا احساس نہ ہوسکا۔ اِسی طرح پشتون قومیت کی علمبردار ایک سیاسی جماعت کے راہنما خان عبدلولی خان نے معاشرے میں نچھلے طبقے کو

اوپر لیجانے اور اشرفیہ طبقے کو نیچے لانے کا ایک اعتدال پسند تصور پیش کیا۔ لیکن اِس نظریے پر وہ اپنے صوبائ دورِ اِقتدار میں ایک انچ برابر بھی عمل نہ کرسکے کیونکہ وہ اپنے چچا ڈاکٹر خانصاحب کے عہدِ وزارت اعلیٰ' کے دوران غلہ ڈھیر کے کسانوں کی تحریک میں عملاً" خوانینِ علاقہ کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ اور اِسی اِختلاف کی وجہ سے اُن کی پارٹی کی ایک شاخ مزدور کسان پارٹی کے نام سے اِن سے جُدا ہوگئ تھی۔

۳۔ **فنی تعظیم:** اس نوعیت کی عزت معاشرے میں ہنرمند وں ۔ کاریگروں ۔محنت کشوں اور ہر قسم کے فنی ماہرین سے وابستہ ہے۔ یہ طبقات اگرچہ ایک معاشرے کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حثیت رکھتے ہیں اور کسی ملک کا مستقبل ان ہی ماہرین کے ہاتھوں میں ہے لیکن پاکستانی معاشرے اور خاص کر پشتون سماج میں ان کی حثیت انتہائ کم تر سمجھی جاتی ہے۔

۴۔ **زر خرید عزت:** اگرچہ اِن افراد کی معاشرے میں ذاتی ۔ سیاسی اور سماجی حثیت نہیں ہوتی لیکن ہر دم جب یہ طبقہ جائز اور ناجائز ذرائع اور طریقوں سے کمائ دولت کے انبار لگا دیتی ہے تو پھر مراعات یافتہ طبقے کے سارے عیش وآرام

اور زندگی کی آسانی کا سامان اسی گروہ کے دم قدم سے چلتا رہتا ہے۔ اس طبقے میں کاروباری شخصیات ۔ دُکاندار ۔ کارخانہ دار اور تاجر حضرات آتے ہیں۔ ملک میں اقتصادی عدم مساوات میں اس طبقے کا ہاتھ نمایاں ہوتا ہے ۔

۵۔ دوبئ اور ڈالر سینڈروم: آج کل ہمارے معاشرے میں ایک نیا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو مشرقِ وسطیٰ اور مغربی سرمایہ دار مُلکوں سے پیسے کما کر لاتا ہے۔ اور اپنے ملک میں فلک شگاف عمارتیں ۔ وسیع جائدادیں اور دیگر عیش و آرام کے سامان خرید تے ہیں ۔ اس طبقے نے ملک کی اقتصادی ۔ مالی۔ معاشی اور سماجی تبدیلی کا سارا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ شرافت ۔ عزت اور سماجی اقدار بدل گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نئے نظریات۔ سماجی مساوات ۔ اعلی' اقدار اور عوامی خدمات کے نعرے تو سب لگائے جاتے ہیں لیکن اصل میں دولت و سرمایہ کمانا اور اِکھٹا کرنا ہی ان سب طبقات کا دیوتا اور مقصدِ حیات بن گیا ہے۔ نچھلا اور درمیانہ طبقہ دونوں شرفاء کے اعلی' لیکن اقلیتی گروہ میں شامل ہوکر اپنی سماجی حثیت کو بڑھانے کی کوشش میں مصروف ہیں ۔ آخر میں دو

ہی طبقے رہ جا ئینگے یعنی اشرافیہ یا مراعات یافتہ طبقہ اور دوسرا غریب یا محروم طبقہ۔

معاشرے میں سماجی تعلقات اور رشتے ناطے اپنے ہی طبقے سے استوار کئےجایں گے۔ دیگر باقی امتیازات اور رشتے مثلا" نسل۔ قوم۔ قبیلہ ۔ ذات ۔رنگ وغیرہ کمزور پڑ جایں گے۔ یاد رہے کہ درمیانہ طبقے کا معدوم ہونا ہی معاشرے میں خونی بھونچال اور انقلاب کا باعث بنتا ہے۔

معاشرے میں تعلیم کا کردار:

کسی بھی معاشرے میں تعلیم کا کردار بہت اہم ہے ۔ تعلیم کے ساتھ ہنر اور تربیت بھی ضروری عناصر ہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیم کی شرح فی الوقت ۴۰ فیصد ہے ۔ ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو صرف اپنا نام لکھ سکتے ہیں یا دستخط کرسکتے ہیں۔ اس طرح ملک میں تین قسم کے ادارے قائم ہیں ۔ اشرافیہ یا مالدار طبقہ اکثر ملک میں قائم اعلی' تعلیمی اِداروں جیسے ایجیسن کالج۔ لارنس کالج ۔ کانونٹ۔ سینٹ میری ۔ بیکن ہاؤس اور سِٹی سکول وغیرہ سے مہنگی عالمی معیار کی تعلیم رحاصل کرتا ہے۔ ان سکولوں اور کالجوں میں زریعہ تعلیم مکمل طور پر انگریزی زبان ہے۔

اعلی' معیاری تعلیم کے ساتھ انمیں دیگر نصابی سرگرمیاں بھی اعلی' معیار کی ہوتی ہیں۔ ان تعلیمی اداروں کی سالانہ تقریبات میں اعلی' سیاسی اور سرکاری شخصیات بطور مہمانِ خصوصی مدعو کئے جاتے ہیں۔ اس طرح بچپن ہی سے ان تعلیمی اداروں میں احساسِ برتری اور دوسری دُنیا کی مخلوق ہونے کی سوچ کو فروغ ملتا ہے ۔

نچھلے اور درمیانے طبقے کےطالنب علموں کے لیے بھی مُلک میں سرکاری اور پرائیویٹ سکول قاذم ہیں۔ سرکاری سکولوں میں معیارِتعلیم اتنا گھٹیا اور پست ہے کہ اِن ہی سکولوں کے اساتذہ بھی اپنے بچے اِن درسگاّؤں میں نہیں بھیجتے ۔ اور انہیں حتی'الوسع پرائیویٹ سکولوں میں داخل کرتے ہیں۔ اِن پرائیویٹ سکولوں میں بھی اِنتہائ کم تنخواہ پر اساتذہ سے اعلی' معیار تعلیم کی توقع کی جاتی ہے ۔ لیکن ان کا خرچہ بھی ناقابلِ برداشت ہعتا جارہا ہے۔ اور یہ مدارس بھی خاصے منفعت بخش کاروباری اِدارے بنتے جارہے ہیں۔ بعض سکولوں کی لڑیاں تو اب سارے ملک میں پھیلتی جارہی ہیں۔

دینی اِدارے:

آج کل ملکِ عزیز میں ایسے دینی مدرسے بھی تیزی کے ساتھ پھیلتے جارہے ہیں جنمیں مذہبی علوم کے ساتھ مغربی معاشی اور سیاسی خیالات و نظریات و تصورات بمع تیکنالوجی یعنی کمپیوٹر سائنس کے مضامین بھی پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ کراچی کے مولانا یوسف بنوری(رح) کے نام سے قائم اِقراء کالج جیسے جدید مدارس سارے ملک میں قاذم کیے گئے ہیں۔ جہاں قرآنِ پاک کے حفظ کا بندوبست بھی موجود ہے ۔ ساتھ ہی پانچویں جماعت تک عام سکولوں میں مروج سلیبس بھی پڑھایا جاتا ہے ۔یہاں سے بچہ چھٹی جماعت میں کسی بھی عام سرکاری یا پرائیویٹ سکول میں داخلہ لے سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ابتک قدیم مذہبی مدارس میں قرآن و حدیث سے زیادہ ایک مخصوص مسلٰک کی فقہہ کی تعلیمات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اِس لیے ابتک ان مدارس سے فرقہ واریت کی بو آرہی ہوتی ہے۔ بچہ اِس اِبتدائ برین واشنگ کی وجہ سے مسلمان اور مومن بن جانے کی بجائے ایک خاص فرقے کا مقلد اور فِدائ کارکُن بن جاتا ہے ۔ پھر ایسے ہی ذہن دہشت گردی کے جراثیم پروان چڑہانے کی نرسریاں بن جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے اِن قدیم اور جدید دونوں مکاتب میں تحقیق و تنقید کا

معیار بھی غیر تسلی بخش ہے۔ اِن کے ہاں جدید ریسرچ میتھاڈالوجی سے بے خبری اور لکیر کا فقیر ہونا اور نقالی و تقلید کا عُنصر غالب ہے۔ افکارِنو اور نئ تخلیقات سے کوسوں دور ۔ انہوں نے آج تک کو ئ سائنسی ایجاد دریافت نہیں کی اور نہ ہی دُنیا کو کسی قابلِ عمل تصور۔ نظریہ ۔ فکر یا خیال سے آشنا کیا ہے۔

سماجی تعلقات:

معاشرے کے اِس اہم رُخ کو ملک کے ہردلعزیز حوصلہ افزائ اور ترغیب دینے والے خطیب و مقرر سید قاسم علیشاہ کس دلنشین انداز سے بیان فرماتے ہیں: "پُرانے لوگ سمجھدار تھے' تعلقات سنبھالتے تھے ۔ پھر پریکٹیکل ہوگئے تو تعلق سے فائدہ نکالتے ۔ اب لوگ پروفیشنل ہوگئے ۔ فائدہ ہو تو تعلق رکھتے ہیں "۔

آبادی میں بے تحاشہ اضافہ:

آزادی کے وقت متحدہ پاکستان کی آبادی سات کروڑ تھی ۔ اور آج ابتک کی آخری رائے شُماری کے مطابق باقی ماندہ پاکستان کی آبادی بائیس کروڑ کے لگ بھگ ہے ۔وقت کیساتھ اسمیں دِن دُگنی رات چوگنی اضافے نے ملکی معاشرے کے

ڈھانچے کو اِنتہائ غیر متوازن ۔ کمزور ۔ لرزیدہ ۔ بِکھرا ہوا اور مُنتشر کردیا ہے۔ ایک انار سو بیمار والا مسئلہ درپیش ہے ۔ جِس نے قابلیت ۔اہلیت اور اِستحقاق کی دھجیاں بکھیر دی ہیں ۔ آبادی کے مُقابلے میں وسائل بہت ہی کم ہیں۔ برآمدات درآمدات کی نسبت کم ہیں۔ آمدن کم اور خرچہ زیادہ ہے ۔ حکومت اور عوام دونوں کرپٹ ۔ نآہل ۔ کام چور اور متلون مزاج ہیں ۔ بے ھنگم آبادی میں اِضافے اور اِژدہام کی وجہ سے وقت کی پابندی مشکل ہوگئ ہے۔ ہر منصوبہ ۔ اصول اور قانون بے اثر ہوگیا ہے ۔ رشوت اور دیگر اخلاقی جرائم عام ہوگئے ہیں ۔ اِس سنگین سماجی مسئلے پر الگ سے مفصل بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن ملک میں مباحث ۔ فضول باتیں ۔ بے مقصد اعتراضات اور شکایات کی پہلے سے ہی بھر مار ہے ۔ عمل اور کام مفقود ہے ۔ عزیزی مصنف نے بھی اپنی کتاب میں اِس موضوع اور دیگر اہم مسائل کو نہیں چھیڑا ہے ۔ اِس راستے میں جو معاشرتی مجبوریاں ۔ رکاوٹیں اور مصلحتیں حائل ہیں ۔ اُنکی جانب آخر میں بس یوں اِشارہ کیا ہے:

افسوس بے شمار سخن ہائےگُفتنی

خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

ماخذ۔ اِستفادہ اور تحریک:

اِس موضوع پر بحث کرتے وقت ڈی ۔ آئ ۔ خان کے معروف ماہرِنفسیات اور ادیب و دانشور ڈاکٹر شاہد مسعود خٹک کی لکھی ہوئ کتاب " پاکستانی معاشرہ۔ اساس۔ قومیتیں ۔ مذہب اور طبقات" میرے زیرِ نظر رہی۔ میں اِس کتاب سے مُتاثر ہوا۔ اِس بارے میں کچھ لکھنے کی تحریک پیدا ہوئ۔ عنوانات اُن کی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ لیکن باقی تبصرہ اور جائزہ میرے اپنے دِلی جذبات ، ذہنی رُجحان ، مطالعہ ۔ مشاہدات اور زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔

ڈاکٹر شاہد مسعود خٹک ڈی ۔ آئ ۔ خان کے مرکزی سِول ہسپتال میں میرے دوست اور ہمکار رفیق رہے ہیں۔ وہ نسلا" پشتونوں کے ایک معروف قبیلے "خٹک" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈیرہ اِسماعیل خان میں برسوں سے اِن کا خاندان آباد ہے ۔ دریائے سندھ کے کنارے بود و باش رکھتے ہیں۔ نسلا" پشتون ہونے کے باوجود مقامی میٹھی سرائکی اِن کی مادری زبان ہے۔ البتہ اُردو ۔ پشتو اور انگریزی زبانوں پر اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں۔ اپنے پیشے سائیکاٹری میں وہ ایک مقبولِ خاص وعام معالج ہیں ۔ کتابیں پڑھنا ۔ لکھنا اور سفر کرنا اِن کے محبوب مشاغل ہیں ۔ دُنیا کے کئ ممالک کی سیاحت کرچُکے ہیں ۔ اور ان اسفار کے دوران پیش ہونیوالے واقعات ۔ مشاہدات اور تجربات کو اپنی ایک دوسری کتاب " جہانِ حیرت" میں سمو د یا ہے۔ اِس انداز و بیان میں پانچ ممالک ۔پانچ شہروں کی پانچ چاندنی راتوں کے پُرفسوں مناظر کو

قلمبند کیا ہے۔ اِس کتاب کو پڑھتے وقت قاری خود بھی ایک جہانِ حیرت میں کھو جاتا ہے۔ اِس پر تخیر و خُمار کی ایک عجب کیفیت طاری ہوجاتی ہے ۔ کتاب "پاکستانی معاشرہ" آرد وئے معلی' میں لکھی گئ ہے ۔ اندازِ بیان سادہ ۔شیرین ۔ سنجیدہ ۔ رواں ۔ نستعلیق ۔ شائستہ ۔ باہم مربوط اور مُد لل ہے ۔ شرکت پریس لاہور سے اِسے چھاپا ہے ۔ جبکہ کمپیوٹر پرنٹنگ سجاد کمپیوٹرز۔ عمر پلازہ ۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی ہے ۔ اِس کتاب کے ناشر ق پبلی کیشنز ڈی آئ ۔ خان ہیں ۔ قیمت صرف ۱۸۰ روپے ہے ۔ جو آج کے دور کی مہنگائ کے لحاظ سے انتہائ مناسب اور ارزاں ہے ۔ کتاب کے صفحات کی تعداد ۱۷۵ ہے ۔ کاغذ درمیانے درجے کا ہے ۔ البتہ دوسری کتاب " جہانِ حیرت" کو بہتر اورمعیاری کاغذ پر چھا پا گیا ہے۔ اہلِ علم و ذوق کے پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ایک نایاب کتابی تحفہ ہے ۔ چاہییے کہ ملک کی سب تعلیمی اِداروں کی لائبریریوں کی ز ینت ہو۔

افغان جنگ ایک فیصلہ کن لمحہ (ترجمہ)

11 ستمبر کو ٹی وی پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی اور حادثے کا شکار ہونے والے خاندانوں کا غم دیکھ کر صدر بُش کی اس بات سے متفق ہونا پڑتا تھا کہ آج ہماری قوم ایک بہت بڑی بُرائی سے دوچار ہوئی۔ اس دن صدر بُش نے اپنے مختصر خطاب میں چار دفعہ ’’بُرائی‘‘ کا لفظ استعمال

کیا۔ اور صدر بُش کے بار بار لفظ بُرائی کے استعمال نے دراصل آنے والے دنوں اور سالوں کے لیے اس کے اس لائحہ عمل کو ظاہر کردیا تھا۔ کہ امریکی صدر کے لیے اب یہ بات ناگزیر ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف عالمی کوششوں کی قیادت کرے اور اب یہ بُرائی یعنی دہشت گردی اُن کے حملوں کا ہدف بنے گی۔ صدر بُش جو کہ ایک مخلص صدر ہیں۔ انھوں نے یہ بیان دیا کہ امریکہ دہشتگردی کا شکار اس لیے ہوا کیونکہ وہ دنیا بھر میں آزادی کا روشن مینار ہے اور ایک ایسی دنیا ہے جہاں لوگوں کو زندگی کے تمام مواقع ملتے ہیں۔ مگر ان کو یہ بیان دیتے وقت امریکہ کا عالمی سیاست میں کردار اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ میں جو کردار ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیۓ تھا۔ صدر بُش کے اس بیان نے دنیا بھر کے لوگوں کو اس بات پر ششدر کردیا اور اس بات نے ان کو اس تکلیف دہ صورت حال سے دوچار کیا کہ امریکہ کو اپنی بڑائی کا کتنا زُعم ہے۔ صدر بُش کے لیے زیادہ بہتر تو یہ تھا کہ وہ ایسے اقدامات کرتے کہ جن سے مستقبل میں دہشتگردی کے ان حملوں سے بچا جا سکے۔ صدر بُش کے جنگ کرنے کے فیصلے نے نہ صرف ابھی دنیا کے امن اور تحفظ کو متاثر کیا بلکہ آئیندہ بھی ایک طویل عرصہ تک کرتا رہے گا۔ صدر بُش کے اس فیصلے کی وجہ سے بہت سے سوال اُٹھتے ہیں۔ اس چیز کو پہلے ہی محسوس کیا جا چکا ہے کہ صدر بُش کے عقائد اور عمل میں ایک گہرا تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ساری دنیا کے معصوم انسانوں کی زندگی بہت قیمتی ہے اور اس کا تحفظ کرنا چاہیے۔ مگر عمل اس کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ ایک

اور اہم سوال ہے جو کہ اس فیصلے سے اُٹھتا ہے۔ وہ یہ کہ صدر بُش کا یہ قدم صرف امریکی عوام کے تحفظ کے لیے ہے یا یہ تمام انسانوں کے لیے ہے جو کہ دہشت گردی سے متاثر ہوئے ہیں؟۔ یا اس کے علاوہ یہ کہ کیا اس سے اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ امریکی قوم اس سے محبت کرتی ہے جیسا کہ صدر بُش دعویٰ کرتے ہیں۔ اور کیا اس فیصلہ کا اطلاق دنیا میں جاری دہشت گردی کی مختلف اشکال پر ہوتا ہے؟ اور کیا یہ دنیا کو ایسی حالت کی طرف لے جائیگا جہاں امریکیوں کے لیے اور باقی لوگوں کے واسطے امن اور انصاف زیادہ محفوظ ہو جائیگا؟۔

پہلا اہم فیصلہ بہت جلد اس وقت لیا گیا جب صدر بُش نے 11 ستمبر کی شام کو قوم سے اپنے 7 منٹ کے خطاب میں یہ کہا کہ امریکہ ان حملوں کا جواب دے گا اور ان حملوں کا جواب دیتے وقت دہشت گردوں اور ان دہشت گردوں کو پروان چڑھانے والوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ صدر بُش نے یہ فیصلہ اپنی فوجی سلامتی کی مشیر کونڈا لیز رائس سے مشورہ لینے کے بعد کیا۔ صدر بُش نے یہ فیصلہ کرتے وقت نائب صدر ڈک چینی، وزیر داخلہ کولی پاول اور وزیر دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ سے کوئی مشورہ نہیں لیا۔ نو دن کے بعد جب صدر بُش نے کانگریس سے خطاب کیا تو اپنے انہی خیالات کو جو نظریہ بُش کے نام سے مشہور ہوا دہرایا۔ ‘‘کہ آج کے بعد ہر وۃ قوم جو دہشتگردی کو پروان چڑھائے یا اسکی مدد کرے امریکہ اسکو اپنا دشمن سمجھے گا۔’’

بُش کے اس نظریہ کو ہم ‘‘نظریہ بُش’’ کا پہلا حصہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد بُش نے اس بات کا اعادہ کیا

کہ یہ امریکہ کا حق ہے کہ وہ دہشتگردی کے خاتمے کے لیے حملے کرے۔ صدر بُش کے اس عہد کو ہم نظریہ بُش کا دوسرا حصہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ نے قوموں کی خودمختاری یا اقتدار اعلیٰ کے پرانے نقطہ نظر کو نہ صرف تبدیل کیا بلکہ اس سے پہلے امریکہ جو خود دہشتگردی کی حمایت کرتا رہا ہے۔ اس پر ایک سوالیہ نشان پیدا ہوگیا ہے۔اگر 11 ستمبر سے پہلے یہ نظریہ کسی دوسری قوم کی طرف سے آتا تو امریکہ یقینا" اس کی مخالفت کرتا۔ اس سلسلے میں ہم کیوبا کی مثال دے سکتے ہیں۔ امریکہ نے کیوبا سے نکالی جانے والی حکومت مخالف عناصر کو دہشت گردوں کے طور پر نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ میامی میں ان کو ایسی بیس بھی مہیا کی جہاں سے وہ کیوبا پر دہشت گردانہ حملے کرسکتے تھے۔ 1998ء میں ایک سینئر وفاقی عہدیدار نے بتایا کہ حکومت ان عناصر کو جو کیوبا کے خلاف دہشت گردی کے منصوبے بناتے رہے یا دہشت گردی کرتے رہے ان کے خلاف کاروائی کو نظر انداز کرتی رہی ہے۔ لہذا جب ایک کشتی جو آتشیں مواد سے بھری ہوئی تھی اور جو کہ ٹونی سپرنٹ کے نام سے رجسٹرڈ تھی (کاسٹرو مخالف گوریلا) اسکو ہوانا کی طرف موڑ لیا گیا اور ٹونی سپرنٹ کو صرف اتنا کہا گیا کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ اپرالڈ کے اس آرٹیکل نے بہت سے مثالوں سے یہ ثابت کیا۔

آسٹریا ہنگری کا 1914ء میں سربیا پر حملہ دنیا بھر میں کسی ملک کا دوسرے ملک پر حملہ کرنا یا دہشت گردی کو فروغ دینا اور اس کی مدد کرنے کے سلسلے میں آج تک

ایک بدنام مثال ہے۔ سربیا پر اس حملے نے پہلی جنگ عظیم کو شروع کروادیا جس نے 9 لاکھ انسانوں کی جان لے لی۔ آسٹریا ہنگری کے حملے کی وجہ ان کا سربیا پر یہ الزام تھا کہ سربیا آسٹریا ہنگری کے ولی عہد اور اس کی بیوی کے قتل، جو کہ سراجیو میں ہوا تھا،میں ملوث ہے۔ کیونکہ اس سازش میں ملوث افراد نے یہ تسلیم کیا تھا کہ سربیائی حکومتی عہدیداروں نے نہ صرف ان کی مدد کی۔ ان کو اسلحہ دیا بلکہ سرحد تک جانے کے لیے ان کو محفوظ راستہ بھی دیا۔ اس پر آسٹرو۔ ہنگری حکومت نے حکومت سربیا کو ایک الٹی میٹم جاری کیا جس میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ سربیا کی حکومت ان سازشی عناصر کو قانون کے حوالے کرے اور مقدمے کی نگرانی آسٹرو۔ ہنگری حکومت کے عہدیداران جرم کے ثابت ہونے تک خود کریں گے۔ اس الٹی میٹم کی ہر جگہ مذمت کی گئی کیونکہ یہ کسی بھی قوم کی حاکمیت اعلیٰ کے اصولوں کے خلاف تھا۔ برطانوی وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرے نے اس الٹی میٹم پر تبصرہ کرتے ہوے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں جتنی دستاویز دیکھی ہیں یہ ان میں سب سے زیادہ قابل مذمت ہے کیونکہ اس میں ایک ملک کے دوسرے ملک کی آزادی اور خودمختاری کو نشانہ بنایا ہے۔

ایک امریکی جریدے نے جنگ عظیم کی تاریخ بیان کرتے ہوے اس کے بارے میں کہا کہ یہ ایک ایسی ظالمانہ دستاویز ہے جس میں الزامات ثابت کیے بغیر ہی جبری مطالبہ کیا گیا ہے۔ بہت سے تاریخ دانوں نے پہلی جنگ عظیم کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوے اس دستاویز کی مذمت کی کیونکہ اس

سے سربیا کی آزادی اور خودمختاری خطرے میں پڑگئی۔ خاص کر اس وقت زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا جس وقت سربیا کی حکومت نے اس الٹی میٹم کے بہت سے مطالبات مان لیے تھے۔ مگر آسٹریا ہنگری نے بات چیت سے انکار کرتے ہوے جنگ کا اعلان کر دیا۔

امریکی انتظامیہ کے پاس آسٹریا ہنگری کی حکومت کی طرح افغان حکومت کے 11ستمبر کے واقعہ میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ لہذا صدر بُش کا افغان حکومت کو یہ دھمکی آمیز الٹی میٹم دینا اس کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف تھا۔ صدر بُش نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ افغان حکومت دہشت گردی کے تمام کیمپ نہ صرف بند کردے بلکہ امریکی عہدیدار افغانستان خود جاکر اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ یہ کیمپ بند ہوگئے ہیں۔ بلکہ یہاں پر صدر بش آسٹریا ہنگری سے ایک قدم آگے چلا گیا کیونکہ آسٹریا ہنگری نے تو صرف یہ کہا تھا کہ سربیا کی حکومت ان لوگوں پر مقدمہ چلاے جنھوں نے دہشت گردوں کی مدد کی۔ مگر صدر بش نے اس بات پر اصرار کیا کہ القاعدہ کے لیڈروں کو افغان حکومت امریکہ کے حوالے کردے جس میں خدشہ لاحق تھا کہ امریکہ میں ان پر منصفانہ مقدمہ نہیں چلایا جاسکے گا۔ (اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت بھی کردیا کہ یہ خدشہ کس قدر درست تھا)۔ 7 اکتوبر 2001ء کو جب افغانستان پر امریکہ نے بمباری شروع کردی تو امریکہ میں بلکہ باقی دنیا میں بھی اس کی بہت کم مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواوں نے اس کو دُرست قرار دیا اور اسکی حمایت کی۔

پرسٹن یونیورسٹی میں میں نے ایک فورم منعقد کروایا جسکا موضوع تھا ''کیا افغانستان پر امریکی حملہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے درست ہے؟ '' میں نے اس میں ممتاز مقررین جو کہ دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے کو بلوایا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان چاروں نے افغانستان پر امریکی حملے کو 11ستمبر کے واقعات کے تناظر میں درست قدم قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ ایک مقرر کہ جس نے نہ صرف ویت نام پر امریکی حملے کی مخالفت کی تھی بلکہ 1991کی اور 2003 کی خلیجی جنگ کی بھی مخالفت کی، اس نے بھی افغانستان پر حملے کو درست قرار دیا۔

افغانستان پر حملے کی حمایت شاید لوگوں نے اس لیے بھی کی کہ ابھی ان کے ذہنوں میں 11ستمبر کے تباہ کن حملوں کی یاد تازہ تھی۔ اور اس سے لوگوں کے جذبات اس حد تک متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس حملے سے کتنے بے گناہ اور معصوم لوگوں کی زندگیاں خطرے میں پڑجائیں گی۔

بشپ جوزفمیوریزا نے صدر بش کے لیے اپنے خط میں افغانستان پر حملے کو قابل افسوس مگر ضروری قرار دیا۔ اس خط کو مذہبی حلقوں سے باھر بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور اس خط نے افغانستان پر حملے کے لیے اخلاقی جواز بھی فراہم کردیا۔ ''امن کو لاحق خطرات'' نامی ایک دستاویز میں جس کو امریکی کیتھولک بِشِپس کی ایک کانفرنس نے مرتب کیا تھا جسمیں کسی ملک کے خلاف

جنگ کو مندرجہ ذیل سات وجوہات کی بنا پر درست قرار دیا گیا۔ یعنی جنگ کرنے کا جواز یوں مہیا کیا گیا؛

الف۔ جارحیت کو روکنے کے لیے اپنا دفاع کرنا یا تمام لوگوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کو روکنا۔

ب۔ جنگ صرف ایک قانونی حکومت ہی شروع کرسکتی ہے جو یہ ذمہ داری قبول کرے کہ امن قائم کرے گی۔

ج ۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنا۔ جنگ صرف ان اقدار کے خطرے میں ہونے کی وجہ سے شروع کی جاسکتی ہے کہ اس کے نتیجے میں انسانی جانوں کا ضیاع کم لگے۔

د۔ صحیح ارادہ۔ طاقت کا استعمال صرف امن اور مصالحت کے حصول کے لیے جائز ہے۔

ر ۔ کامیابی کے امکانات۔ اگر جنگ میں کامیابی کے امکانات نہ ہوں تو چاہے جنگ کی وجہ کتنی ہی جائز کیوں نہ ہو، جنگ کرنا صحیح نہیں۔

ڑ ۔ تناسب۔ جنگ صرف اس صورت میں جائز ہوگی اگر جنگ سے حاصل ہونے والے فوائد کا تناسب اس جنگ میں انسانی جانوں کے ضیاع اور تباہی سے زیادہ نہ ہو۔

ز ۔ آخری حربہ ۔ طاقت کا استعمال صرف اس صورت میں کیا جانا چاہیے جب تمام پُر امن ذرائع ناکام ہو جایں۔

جہاں تک افغانستان پر امریکی حملے کی بات ہے تو اگر امریکی حملے کی وجہ یہ ہو کہ 11 ستمبر میں ملوث افراد کو سزا دی جاے یا دہشت گردی کے مزید امکانات کو روکا جاے تو پہلی چار وجوہات کے تناظر میں یہ جنگ جائز ہے۔ کیونکہ یہ جنگ امریکی حکومت نے جو قانونی حکومت ہے، اس لیے شروع کی تاکہ امریکی شہریوں کا دفاع کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ جو تیسری وجہ جنگ کے لیے جائز قرار دی گئی کہ اقدار خطرے میں ہوں تو جنگ کی جا سکتی ہے تو وہ بھی یہ تھی کہ امریکی عوام کو آئندہ دہشت گردی کے حملوں سے بچایا جا سکے اور جہاں تک حکومت کے ارادوں کی بات ہے تو اس میں بھی ہم فرض کرسکتے ہیں کہ ابتدائی طور پر تو ان حملوں کو روکا جاےاور پھر افغانستان میں ایک پُر امن اور جمہوری حکومت قائم کی جاے۔ امریکی حکومت افغانستان پر قبضہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جہاں تک پانچویں وجہ یعنی کامیابی کے امکانات کس قدر ہیں، کا تعلق ہے تو اس کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جنگ کے مقاصد کو کس تناظر میں لیا گیا ہے۔ اگر جنگ کا مقصد یہ ہو کہ القاعدہ کے کیمپوں کو تباہ کیا جائے، پھر تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جہاں تک 11ستمبر کے حملوں میں ملوث افراد کو پکڑنے کی بات ہے تو اس میں القاعدہ کے صرف چند افراد پکڑے گئے ہیں جن

میں اُسامہ بن لادن شامل نہیں ہے۔ بہر حال اس بات کے کافی حد تک امکانات موجود ہیں کہ اُسامہ بن لادن کو پکڑا جائیگا۔ دہشت گردی کے تربیتی کیمپس کو ختم کرنا اور اسکے لیڈروں کو پکڑنا یا پھر جُزوقتی طور پر القاعدہ کے حملوں کو روکنا ہی صرف وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس جنگ کے جائز اہداف ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان پر حملہ ان تمام مقاصد کو حاصل کریگا یا کر سکاہے؟ اگر ہم ان کیمپوں کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ ابتدائی طور پر یہ کیمپ طالبان کی حکومت کو قائم کرنے اور افغانستان پر انکا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے قائم ہوے تھے نہ کہ امریکہ اور مغربی ملکوں پر حملہ کرنے کے لیے۔ اور ان کو تباہ کرنا دہشت گردی نہیں ہے۔ القاعدہ کے مغربی ملکوں میں کچھ اڈے تھے جن میں سے مزید حملے بھی متوقع ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ 11ستمبر کے حادثے پر ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس حادثے میں افغانستان میں واقع القاعدہ تربیتی کیمپوں سے زیادہ فلوریڈا کا ہوئی تربیتی سکول ملوث تھا۔ ایف۔ آئی۔ اے کے ایک سینئر عہدیدار نے یہ دعویٰ کیا کہ افغانستان پر حملے کے نتیجے میں القاعدہ کے خون ریز حملے کی صلاحیت 30فیصد تک تباہ کردی گئی ہے۔ مشرق بعید عرب ممالک اور ترکی پر 2002- 2003 تک جو متعدد حملے ہوے ان سے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ افغان جنگ سے مطلوبہ نتائج حاصلے نہیں کیے جا سکے۔ بہرحال افغان جنگ کے نتیجے میں ہم یہ بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس جنگ نے دہشت گردی کے حملوں کو 30 فیصد - 70 فیصد یا کسی حد تک ختم کیا ہے۔ اگر امریکی

حکومت بجائے افغانستان پر حملہ کرنے کے صرف طالبان حکومت کو ہی ہٹا دیتی تو یہ ان ریاستوں کے لیے بھی ایک وارننگ ہوتی کہ جو دہشتگردی کو فروغ دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک یہ بات بھی ہے کہ اکثر اوقات دہشت گرد تنظیموں کا ریاست سے تعلق نہیں ہوتا ۔ اور نہ ہی انہیں ریاستی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں امریکی حکومت سے یہ بات بھی پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ایک اسلامی قوم کے ساتھ جنگ کرنے سے کیا مسلمانوں کے دلوں میں امریکہ اور مغربی اقوام کے لیے نفرت مزید نہیں بڑھ جائیگی؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ نے دہشتگردی کو ختم کرنے یا کم کرنے کے بجائے بڑھا دیا ہے۔

امریکہ کی مذہبی کونسل کے نزدیک جو چھٹی وجہ جنگ کے لیے جائز ہے وہ یہ ہے کہ جنگ سے حاصل ہونے والے فوائد جنگ کے نقصانات کے تناسب سے زیادہ ہونے چاہیں۔ لہذا یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنگ کے فوائد اس کے نقصانات کے تناسب سے زیادہ ہیں؟۔ یہاں تک کہ اگر جنگ کی وجہ جائز بھی ہو مگر اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلتی ہو تو بھی جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ 1956 ء میں سویت یونین اور ہنگری کے درمیان جھگڑے میں ھنگری واضح طور پر مظلوم تھا اور اس کی مدد کے لیے جنگ کی جاسکتی تھی مگر اس جنگ کے نتیجے میں ایٹمی جنگ چھڑنے کا خدشہ تھا۔ اور اس کے نتیجے میں اتنی تباہی پھیلتی جو کہ ھنگری کے آزاد کرنے کی قیمت سے بہت زیادہ تھی۔ اگرچہ افغان جنگ کے نتیجے

میں اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کا خدشہ نہیں تھا لیکن اس کے نتیجے میں اچھی خاصی تعداد میں انسانی جانوں کے ضیاع کا اندیشہ تھا۔ اور عملی طور پر ایسا ہوا بھی۔ جہاں تک جہاں تک اس جنگ سے ہونے والے فوائد اور نقصانات کا تعلق ہے تو ان سے ہونے والے فوائد یا مقاصد کی نوعیت بھی غیر واضح ہے۔ اگر اس جنگ کے نتیجے میں القاعدہ کو 11 ستمبر جیسے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے حملوں سے روکا جا سکتا یا اس سے دہشتگردری کا مکمل خاتمہ ممکن ہوتا تو پھر اگر اس کے نتیجے میں کچھ مزید جانیں بھی ضائع ہوتیں تو تب بھی یہ جنگ جائز تھی۔

امریکی مذہ بی کونسل کے نزدیکجو جنگ شروع کرنے کی آخری جائز وجہ ہے وہ یہ کہ اگر تمام پُرامن ذرائع ناکام ہوجائیں تو جنگ شروع کی جاسکتی ہے۔ وہ اسی بات پر ہی بُش انتظامیہ سب سے زیادہ قابل تنقید ہے۔صدر بُش نے تھوڑے عرصے تک ظاہری طور پر توجنگ کے علاوہ دوسری راستہ تلاش کرنے کی کوشش کیمگر یہ کوشش بالکل غیر سنجیدہ تھی۔ باب وڈزورتھ نے اپنی کتاب ''بش ایٹ وار'' میں کولن پاور کے حوالے سے بتایا کہ صدر بش اس خوفناک حادثے سے بہت شکستہ ہو چکے تھےاور وہ کسی کو مارنا چاہتے تھے۔ اور اسی قوت سے بش نے جنگ کی تیاری شروع کردی حالانکہ اس وقت صبر سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ بش ہمیشہ یہ کہتے رہتے کہ وقت کا انتخاب بہت اہم ہے۔ بس جلدی کچھ کرنا ہوگا اور قوم کو نتائج دکھانے ہونگے۔

17 ستمبر کو بُش نے کولن پاور سے کہا کہ ایک بیان جاری کرے جس میں طالبان کو وارننگ دے کہ وہ جلد سے جلد اُسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کردیں اور اگر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا تو ان پر شدید حملہ کیا جائےٗ گا اور اس سے باقی ملکوں مثلاً شام اور ایران کوبھی سبق حاصل ہوجانا چاہیے اور وہ بھی اپنے حالات میں تبدیلی لے آئیں آخرکار صدر بُش نے خود بھی کانگریس سے اپنی تقریر، جس کو کروڑوں امریکی اپنے ٹی وی پر دیکھ رہے تھے، طالبان کو وارننگ دی۔ اپنی اس تقریر کے تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے برطانوی وزیراعظم ٹونی بلئیر کو ذاتی طور پر یہ بتایا کہ وہ امریکی فوجی قوت کے ساتھ افغانستان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔

وڈورڈز کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صدر بش نے طالبان کا ردِعمل اپنے کسی مشیر سے ڈسکس نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے وڈورڈز کی کتاب پڑھنے والے یہ سوچیں کہ طالبان نے کوئی ردِ عمل ظاہر ہی نہ کیا مگر ایسا نہیں۔ طالبان کے امیر مُلا عمر نے یہ کہا تھا کہ اگر امریکہ اُسامہ بن لادن کے ان حملوں میں ملوث ہونے کے ثبوت فراہم کردے تو اسکو کسی اور مسلمان ملک حوالے کردیگا جہاں اس پر مقدمہ چلایا جاے ۔ وہاں کی اسلامی عدالت میں۔ بعد میں اس شرط کو نرم کردیا گیا اور کہا گیا کہ ایسی عدالت ہو جہاں ایک جج مسلمان ہو۔ اسکے علاوہ یہ تجویز بھی دی گئی کہ اس معاملے میں اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی سے صلاح لی جاے اور آخرکار مُلا عمر کی جانب سے یہ تجویز بھی آئی کہ وۃ امریکی حکام سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس

معاملے میں مُلا عمر کی یہ درخواست بالکل درست تھی کہ امریکہ اُسامہ کے حملوں میں ملوث ہونے کے ثبوت فراہم کرےتاکہ اس کو امریکہ کے حوالے کیا جائے مگر ایسا کوئی ثبوت سامنے نہ لایا گیا۔ اگر طالبان کی جگہ امریکہ خود بھی ہوتا تو وہ کسی ملزم کو کسی دوسرے ملک کے حوالے کرنے سے پہلے ثبوت مانگتا۔ لیکن طالبان کی تمام درخواستوں کو رد کردیا گیا۔ جس طرح آسٹریا ہنگری نے سربیا کی درخواست کو نظر انداز کردیا تھا۔ ان دونوں معاملات میں وارننگ کے نتیجے میں آنے والے ردِعمل اور پھر اسے نظرانداز کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وارننگ کے پیچھے اس مسئلے کا حل نکالنا نہیں بلکہ جنگ کرنے کے لیے ہی بہانہ درکار تھا۔ لیکن جنگ اس مسئلے کا آخری حل نہیں تھا۔ اس وقت صدر بش کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کس قسم کا ایکشن لے۔ اس کا اصلی منصوبہ یہ تھا کہ امریکی فوجوں کو افغانستان بھیج کر اسکے ساتھ ہی بمباری شروع کی جاے ۔ لیکن افغانستان میں مناسب سہلویات نی ہونے کی وجہ سے امریکی فوجوں کو افغانستان نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس بات کا فیصلہ ہوگیا کہ پہلے بمباری کی جائیگی اور پھر امریکی فوجی جائیں گے۔ صدر بش بمباری میں بھی کسی قسم کی تاخیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ 27 ستمبر کو جب کونڈا لیزرانس نے یہ بتایا کہ فوج بمماری کے لیے تیار نہیں ہے تو صدر بش نے کہا کہ یہ ناقابل قبول ہے۔ صدر بش نے وڈورڈز کو خود یہ بتایا کہ کہ وہ خود وہاں جانے کے لیے تیار ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی حِسّیات پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ انھونے یہ کہا کہ میں جانتا ہوں امریکی قوم ہم سے سوال

کرے گی کہ بُش کہاں ہے؟ اور وہ کیا کر رہا تھا جب امریکی قوم مشکل کا شکار تھی۔

جب تک امریکی افواج افغانستان نہیں چلی جاتیں تب تک صدر بش مزائیلوں او بموں سے حملے کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس بمباری میں تیزی بھی لائی جاسکتی تھی مگر افغانستان میں القاعدہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ صدر بش کی جنگی کابینہ اچھی طرح جانتی تھی کہ القاعدہ والے پہلے ہی یہ تربیتی کیمپ چھوڑ چکے ہیں۔ مگر صدر بش یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور شاید وہ صدر کلنٹن کے اس عمل کو دہرا رہے تھے جب انھوں نے امریکی سفارت خانے پر اُسامہ کے ابتدائی حملوں کے جواب میں ایک خالیخیمے پر لاکھوں مالیت کا میزائل دے مارا تھا۔اور وڈرورڈز کے اس بیان کے مطابق 29 ستمبر کو ایلٹی میٹم کے نو دن بعد ہی طالبان حکومت کا خاتمہ اسی جنگ کا اہم مقصد بن گیا۔ اگر وڈرورڈز کا یہ بیان صحیح ہے جو کہ انھوں نے ان لوگوں سے جو اس موقع پر موجود تھے، بشمول صدر بش کے انٹرویوز لیے اور ان کی جنگی حکمت عملیوں سے اور لابینہ کی میٹینگ سے نوٹس لینے کے بعد دیا تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افغانستان کی جنگ جائز مقصد کے لیے لڑی جانے والی جنگ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جنگ کا اصلی مقصد جو کہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنا اور مجرموں کو سزا دینا تھا، سے تبدیل ہوکر طالبان حکومت کا خاتمہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے یہ جنگ سراسر ناجائز بن گئی۔مصالحت کی تمام کوششوں کو چھوڑ کر جنگ کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اور یہ راستہ ایک ایسے

لیڈر نے اختیار کیا جو بہت جلدی میں تھا۔ جو کہ امریکی قوم کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وۃ کتنا بڑا لیڈر ہے۔ اور افغانستان کو مثال بنا کر دوسری قوموں کو وارننگ دینا چاہتا تھا۔ لیکن دوسری قوموں کو یہ وارننگ بہت مہنگی پڑی۔ یہ وارننگ کسی دوسرے طریقے سے بھی دی جاسکتی تھی کہ جس سے اتنی جانوں کا نقصان نہ ہوتالہذا ان ساری وجوہات کا جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنگ کسی بھی صورت میں جائز نہیں تھی۔ صدر بش کو اس بات کا اتنا احساس نہیں تھا کہ کتنی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ رمز فیلڈ نے خود اس بات کو تسلیم کیا کہ اس جنگ سے بہت سی معصوم جانوں کا ضیاع ہوا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر صدر بش کی جگہ اور کوئی امن پسند صدر ہوتا تو وہ تمام پُر امن ذرائع استعمال کرتا۔ اگرچہ جذباتی اور سیاسی طور پر11 ستمبر کے دنوں میں یہ مشکل تھا لیکن صدر بُش کو یہی راستہ اختیار کرنا چائیے تھا۔

خلاصہ کلام ؛ مندرجہ بالا مضمون امریکی مصنف پیٹر سنگر کی کتاب ''نیکی اور بدی کا امریکی صدر'' سے ایک اقتباس ہے۔ یہ اس لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے کہ اس میں پہلی دفعہ ایک امریکی اسکالر نے صدر بُش کے دور صدارت کی خامیوں کا نہ صرف جائزہ لیا بلکہ یہ بھی تبایا کہ صدر بُش ریاستی اور عالمی معاملات میں دوہرا معیار رکھتے ہیں۔ صدر بُش وہ واحد صدر ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنی انتخابی مُہم کے دوران بلکہ اپنے دور صدارت میں بھی بار بار اخلاقی اقدار کے تحفظ کا پرچار کیا۔ مگر عملی طور پر انہوں نے ان اخلاقی اقدار کا کس قدر تحفظ

کیا۔ یہ چیز واضح طور پر افغانستان اور عراق کی جنگ میں دُنیا نے دیکھ لی۔ صدر بُش اپنے اپ کو ایک بہت بڑا لیڈر سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دُنیا کے اور امریکیوں کے اخلاقیات کو سنوارنا ان کی سب سے اہم ذمہ داری ہے اور اس مقصد کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کرسکتے ہیں چاہے یہ طاقت کا استعمال کیوں نہ ہو۔ تو وہ اس سے دریغ نہیں کریں گے۔

صدر بُش نے خود ہی اچھائی اور بُرائی کا معیار قائم کرکے اچھائینافذ کرنے اور برائی کے خاتمے کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کو وہ اچھائی سمجھتے ہیں کیا وہ واقعی اچھائی ہے یا جس برائی کو وہ جڑ سے اکھاڑنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ واقعی بُرائی ہے؟ اور اگر وہ واقعی بُرائی ہے تو جس بُرائی کو ختم کرنے کے لیے وہ جو راستہ اختیار کرتے ہیں کیا وہ خود ایک بُرائی نہیں ہے؟ عملاً دھشت گردی کے خاتمے کے لیے لاکھوں بے گناہوں کو مارنا، طاقت کے استعمال اور امریکہ کے عالمی سیاست میں کردار سے ہٹ کر اگر اندرونی طور پر صدر بُش کی پالیسیوں کو دیکھا جائے تو اس میں بھی صدر بُش کی واضح ناکامیاں نظر آئی ہیں۔ صدر بُش نے عوام کو خوش کرنے اور ان کی توجہ ہٹانے کے لیے ٹیکس میں کمی کی مگر اس نے بجٹ اور مالی معاملات کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ او آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بے پناہ مالی مسائل جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ صدر بُش کی مذہبی پالیسیوں نے ملک میں مذہبی منافرت کو ہوا دی۔

امریکہ جو ایک وفاقی ریاست ہے اور جس میں ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگ آباد ہیں اگر ایک دفعہ مذہبی یا نسلی تفاوت کی روش چل نکلی تو پھر تابناک امریکی مستقبل دنوں میں تاریک ہو جائیگا۔ اور امریکی وفاق کو بھی شدید خطرات لاحق ہوجائیں گے۔ کیونکہ امریکہ کی شاندار ترقی اور وفاق کی سلامتی وہاں کے کلچر پر منحصر ہے جو اس سے پہلے باھمی ھم آھنگی اور اعتماد کی فضاء سے معمور تھا۔ لہذا ان تمام باتوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیٹر سنگر نے اس کتاب میں صدر بُش کے دور صدارت کے مختلف حالات اور واقعات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح کی کہ صدر بُش اپنی تمام تر پالیسیوں اور حکمت عملیوں میں ناکام رہے ہیں۔ اور ان کے دورِ صدارت کے اثرات کو آئندہ آنے والی امریکی نسلیں مدتوں بھگتی رہیں گی۔

بے دھان خندیدن

(علم تواریخ کی روحانی اور وجدانی تعبیر)

یا رب چہ خوش است بے دہان خندیدن

بے واسطہ چشم جہاں را دیدن

بنشین و سفرکن کہ بہ غایت خوب است

بے منتِ پا گرد جہاں دیدن

علم تاریخ کی دو اہم شاخیں ہیں۔ مادی تاریخ اور روحانی تاریخ۔ مادی تاریخ میں حکمرانوں، امراء اور سپہ سالاروں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی نجی زندگی، اس دور کے سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کا ذکر شامل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس روحانی تاریخ انبیاء کرام، صوفیا با صفا، اولیائے عظام اور روحانی اقدار کے محافظوں کے ااعلیٰ اخلاق۔ عظیم افکار ۔ کشفی واردات ۔ نیک اعمال اور عالم انسانیت پر اسکے مبارک اور بختاور اثرات کا تذکرہ کرتا ہے ۔ اور ان دونوں علوم پر تنقید، جرح اور تعدیل کے بنیادی معیار اور پیمانے بھی الگ الگ ہیں۔

مادی توارخ میں واقعات کے ظہور کے اسباب بھی مادی ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حالات بھی ان واقعات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ وسائل کی کثرت یا قلت زمان و مکان کا تفاوت، سیاسی جوڑ توڑ کے واقعات، قبائلی عصبیت، مثبت جغرافیائی حالات، جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا بروقت استعمال اور جنگی وسائل کی مہارت اس نوعیت کے تواریخی واقعات کے آخری نتائج پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس روحانی تواریخ میں واقعات کے نتائج توجہ، دعا و روحانی رابطوں، بزرگوں کی صحبت کے فوضات اور آسمانی براکات کے ناقابل تغیر فیصلے ہوتے ہیں۔ اس طولانی تمہید کا خلاصہ لسان الغیب رحمان بابا اس شعر میں بیان کرتے ہیں۔ (ترجمہ) ‘‘باشاہی فقیروں کی دعا کا فیض ہوتا ہے۔ میں رحمان تب بادشاہ ہوا جب میں نے خوئے فقیری اختیار کی ’’ ۔

روحانی تاریخ مرتب کرنے والے انسانی نسل کی ابتداء حضرت آدم سے کرتے ہیں جو بائیبل اور تورات کی سند کے مطابق زیادہ سے زیادہ چھ ہزارسال پہلے گذرے ہیں۔ اس خصوصی تخلیق کے نظرئیے کے برعکس مادہ پرست نسل انسانی کی ابتداء کے بارے میں ڈارون اور لیمارک کے نظریوں کو فوقیت دیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ روحانی مفکرین اس کائنات کی ابتداء کی بجائے اس کی انتہا کے بارے میں زیادہ فکر مند ہیں۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں میری ابتداء کیا ہے؟

کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں کہ میری انتہا کیا ہے؟

الف ۔ قرآن پاک میں عاد اور ثمود کی قوموں کی تباہی کا ذکر ہوا ہے۔ وہ اپنے بُرے اعمال اور گمراہی کی وجہ سے خداوند پاک کے عذاب کا نشانہ بنے۔ قوم ثمود اپنے زمانے میں ایک عظیم تہذیب و تمدن اور مال و دولت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے کبر و غرور کی بنا پر خداوند پاک کے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی نصیحت اور وعظ پر کان نہ دھرے اور خداوند پاک کی نشانی ''اونٹنی'' کو مار ڈالا۔ جس کی سزا کے طور پرہیبت ناک چیخ اور اسمانی بجلی ان پر عذاب کی شکل میں نازل ہوئی آج مادی تاریخ اور جغرافیہ دان دونوں اس خبر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس وادی میں ایک آتش فشانی زلزلے کے آثار ملتے ہیں۔

ب ۔ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ میں ایک معجزے کا ذکر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے اپنا عصا سمندر کے پانی پر مارا اور سمندر دو حصوں میں بٹ گیا اور درمیان میں سڑک کی مثل ایک خشک راستہ پیدا ہوا۔ اب مادئین اس معجزے کی تشریح فطرت کے عام طبعی قوانین کے تحت کرتے ہیں۔ اور ہوائی طوفان مدوجزر یا جوار بھاٹے کو اس کا سبب گردانتے ہیں۔ لیکن روحانی دُنیا اس واقعے کو ایک صاف اور واضح معجزہ سمجھتی ہے۔

ج۔ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائیش کا واقعہ بنی نوع انسان کی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ بن باپ کے بچے کی پیدائیش فطرت کا عام قانون نہیں ہے۔ اب علمِ حیوانات کے ماہرین اسکو خود زائی (پارتھینو جینیسیس) کی ایک قسم سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن خودزائی تو صرف چھوٹے جانوروں میں ممکن ہے۔ مگر قدرت کے اس انوکھے کام کو کیا کہیں گے۔ یہ امرِ ربّی تھا۔ فرمایا ''یہ واقعہ آدم علیہ السلام کے واقعے کی مثل ہے۔ جو اس واقعے سے بھی عجیب ہے۔ جس کا نہ کوئی باپ ہے نہ کوئی ماں۔ اس مقام تک عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

ر۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت سے کچھ عرصہ پہلے واقعہ فیل پیش آیا ۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ ابرھا کے لشکر کی شکست کی وجہ ابابیلوں کی شکل میں ایک آسمانی چَاند ماری بتائی جاتی ہے۔ اس طرح اللہ پاک نے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی۔ مادی تاریخ کے شارحین اس کی کیا وجہات بیان کرتے

ہیں؟ ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ابرھا کے لشکر میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی ۔ لیکن حقیقت وہ ہے جو قرآن حکیم نے بیان فرمائی ہے۔

س۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دین اسلام کا ظہور نتائج کے لحاظ سے بذات خود روحانی اور مادی تاریخ کا سب سے عظیم واقعہ ہے۔ مادی تاریخ کے محققین اس مبارک واقعے کا ظہور تاریخی واقعات کے تسلسل منطقی نتیجہ گردانتے ہیں۔ اور ان وجوہات کو کئی کئی رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ۔ تجارتی راستے کی بندش۔ عربوں کی ایک تجارتی کشتی کی غرقابی، جزیرہ نمائ عرب کا جغرافیائی محل وقوع وغیرہ کے واقعات کو اس نئے تاریخ ساز انقلاب کا سبب گردانتے ہیں۔ لیکن روحانی تاریخ کے مفسرین قوم عرب میں ایک نبی کے ظہور کو اللہ پاک کے اس ارداے کو جو آدم علیہ السلام کی پیدائیش سے بھی بہت پہلے کیا گیا تھا، کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور بعد میں اس ارادے کے ظہور کو ابراہیم خلیل اللہ کی دُعا اور مسیح روح اللہ کی نوید کی برکت سمجھتے ہیں۔

ش۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح کی وجہ مادئین ایک پُرانی موٹر اور ایک نئی سائیکل کے درمیان مقابلہ گردانتے ہیں۔ لیکن روحانی مفکر اس جنگ میں ملائکہ کی مدد اور کمک کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسا ہی جنگ خندق میں مسلمانونکی فتح کی وجہ خندق کی شکل میں عربوں کے

لیے ایک نئی جنگی چال کا استعمال تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بڑی وجہ کفار پر طوفان اور بادوباران کی شکل میں ایک آفت کا نزول تھا۔

ص۔ اسلامی تاریخ میں واقعہ کربلا واقعات اور نتائج کے لحاظ سے ایک غیر معمولی حادثہ ہے۔ امام عالی مقام کی اس قربانی کو مادی نظریں اقتدار کی جنگ، خروج یا پھر خودکُشی کا نام دیتے ہیں اور بنی ہاشم و بنو اُمیہ کی جدی پُشتی دُشمنی کو ہی اس کا سبب سمجھتی ہیں۔ لیکن روحانی فکر و نظر رکھنے والوں کے لیے اس بے مثال قربانی میں ایک عظیم سبق پنہاں ہے۔ جسکی ابتداء حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمائی تھی اور امام حسین نے اسکی انتہا کی۔ خلافت اور ملوکیت کے فرق کو ظاہر کردیا۔ ایک کو روح کی بادشاہی اور دوسرے کو جسم اور فانی دنیا کی بادشاہی سپرد کی گئی۔ آسمانی بادشاہی کے چاہنے والے اور اخلاقی انوار کے پھیلانے والے تو ہمیشہ قیصر کے ہاتھوں دار پر چڑھتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ قربانی لازوال ہے۔ اور تا قیامت برائی اور ظُلم کی تاریکیوں میں نُور کی روشن مشعل ہوگی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: '' علم اگر اسمان میں بھی ہو تو ایران کا ایک بشر اایک زرین باب ہے۔ نشاط سے نیچے اُتار دے گا۔ '' یہ پیشن گوئی کیسے سچ ثابت ہوتی ہے۔ عباسی دور مسلمانوں کی علمی تاریخ کا ایک زرین باب ہے ۔ نشاطِ ثانی کے اس دور میں علم کی سب سے بڑی خدمت ایرانی باشندوں نے کی ہے۔ اسلامی دور کے عالموں، طبیبوں، حکیموں اور فلاسفروں کی ایک

کثیر تعداد ایرانیوں کی ہے۔ اس پاک پیشن گوئی کا اطلاق امام اعظم اور امام بخاری پر بھی ہوتا ہے۔ زمانہء بعد میں جس وقت مسلمانوں پر روحانی اور اخلاقی زوال طاری ہوا تو زبردست فوجی سامان، مادی قوت او لشکر جرارکے سرزمین فرانس پر ٹورس کی جنگ میں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کا لشکر بغیر لڑائی کے کیوں واپس ہوا؟ اس کی پوری وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یورپ کی سرزمین میں ان کی مزید پیش قدمی منظور نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ یورپ کے پادریوں نے رات کے سمے دریا میں چند تعویذ پھینکے اور علی' الصبح مسلمانوں کا لشکر اس جگہ موجود نہیں تھا۔ ان کی آپس میں بے اتفاقی پیدا ہوگئی تھی اور بغیر کسی جنگ کے سرزمین فرانس سے واپس ہوئے۔ یہ سرزمینِ یورپ پر مسلمانوں کی آخری پیش رفت تھی۔

ض۔ ہندوستان کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے کرتے ہماری نظر خلجی حکمران جلال الدین پر پڑتی ہے۔ اس کا بھتیجا علاوالدین دیونگری کا سارا خزانہ سمیٹنے کے بعد واپس آرہا ہے ۔ چچا اس کے استقبال کے لیے گنگا دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ امراء اور سپہ سالار اس کے ساتھ ہیں۔ اس شاہانہ انداز کا تماشا دیکھنے کے لیے ایک مجذوب کڑک شاہ بھی وارد ہوتا ہے۔ بوڑھا سلطان اپنے عصا کے سہارے کشتی سے ساحل کی طرف رواں ہے۔ کڑک شاہ بھی اس طرف اس کے دیکھنے پر اچانک بے اختیار یہ نعرہ بلند کرتا ہے۔ ''ہر کہ آرد بر تو جنگ ۔ تن در کشتی، سر در گنگ ''

علاوالدین آگے بڑھتا ہے اور اپنے چچا کے قدموں میں گرتا ہے۔ لیکن اسکا بھائی الماس بیگ پیچھے سے سلطان پر تلوار کا وار کرتا ہے اور سلطان کا سر دریائے گنگا میں گرتا ہے اور بے جان دھڑ کشتی میں رہ جاتا ہے۔ ہندوستان کی بادشاہی بدل جاتی ہے۔

ط۔ پشتونوں کی تاریخ میں سولہویں صدی کے آخر میں پشاور کی وادی میں ایک قوم اچانک نمودار ہوتی ہے۔ اس سے پہلے نہ اس قوم کا نام کسی کو معلوم تھا اور نہ ہی تاریخ۔ مغل اعظم شہنشاہ اٹک کے قلعے میں حیران و پریشان پڑا تھا۔ کابل سے دہلی جانے والی سڑک یوسف زئ، مہمند اور آفریدی قبائل کے ڈاکوں کے ڈر سے غیر محفوظ تھی۔ اس وقت اکبر کے حمایتی سردار ایک شخص کو ساتھ لاتے ہیں اور بادشاہ کو مخاطب کرتے ہیں ''جہاں پناہ یہ ملک اکو ہے۔ خٹک قوم سے ہے۔ اپنے رشتہ داروں کی زور زیادتی کی وجہ سے اپنا آبائی وطن کربوغہ (کوہاٹ) چھوڑنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ اگر مابدولت اس سڑک پر محصول کا ٹھیکہ اس کو دینے کا وعدہ کردیں۔ تو اُمید ہے کہ یہ شخص سرکار کے اعتماد پر پورا اترے گا۔'' یہ ''ملک اکو'' خوشحال خان خٹک کا جد امجد اور بعد میں آنے والے خٹکوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ لیکن اس کے برعکس تصوف کی کتابوں میں تحریر ہے ''ملک اکو ایک مصیبت زدہ اور ناچار پشتون تھا۔ ہمیشہ پیر سباک قدس سرہ کی خدمت کرتا تھا۔ ان کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا اور ان کی ہدایت پر سڑک کے کنارے ایک گاؤں اباد کیا۔ سرداری اور عظمت نصیب ہوئی۔ اب اس واقعے کی مادی

توجیح تو یہ ہے کہ ملک اکو اور اس کے قبیلے اکوڑخیل خٹکوں کے عروج کا سبب مغلوں کی سیاسی حکمت عملی تھی لیکن روحانی دنیا اس واقعہ کو ہمیشہ امرِ ربی کہتی ہے۔ جو ایک ولی اللہ کی دعا اور توجہ کی برکت تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

گفتہء او گفتہء اللہ بود

گرچہ زحلقومِ عبداللہ بود

ظ متشرع مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے بھائی شاہ شجاع کے خلاف بر سرِ پیکار تھا۔ شاہ شجاع اپنے سرکش جنگی ہاتھیوں اور زرہ پوش فوجی دستوں کے ساتھ اورنگ زیب کی افواج پر حملہ آور ہوا۔ اورنگ زیب کی فوج پسپا اور منتشر ھوگئی۔ عالمگیر کے ساتھ بس چند ساتھی رہ گئے۔ ان میں حضرت شاہ ولی اللہ کا دادا شیخ وجیہہ الدین بھی شامل تھا۔ وجیہہ الدین نے شجاعت اور دلیری سے کام لیا۔ اور ایک ہاتھی کی خرطوم کاٹ لی۔ زخمی ہاتھی اپنی ہی فوج پر چڑھ دوڑا۔ باقی ہاتھی بھی اس کے ساتھ ہولیے اور اپنی ہی فوج کو پاؤں تلے روندنا شروع کردیا۔ اس طرح شاہ شجاع نے شکست کھائی اور واپس بنگال چلاگیا۔ اورنگ زیب نے شیخ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انھیں ایک اعلیٰ منصب کی پیشکش کی۔ شیخ صاحب نے کافی قناعت اور استغناء سے بھرپور جواب دیا۔ ''میں خداوند پاک کی رضا اور مشئیت سے کیسے انحراف کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی تھی کہ میں

تمھاری حمایت کروں۔ ’’ اس طرح دہلی کے تخت کا فیصلہ مولیٰ کی رضا اور ایک فقیر کی تدبیر سے ہوا۔

ع۔ دُعا اور د دُعا کا اثر نسلوں پر محیط ہوتا ہے۔ ‘‘ ٹالسٹائی’’ روس کا ایک بہت بڑا ادیب اور بین الاقوامی شہرت کا حامل ناول نگار تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے خاندان کو زارِ روس کے خانوادے کے ایک شہزادے نے سو پشتوں (نسلوں) تک بددُعا دی تھی۔ تاریخ کے صفحات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ اس بد دُعا کے اثرات اس خاندان میں اب تک گاہ بگاہ ظاہر ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کی ساتویں پُشت چل رہی ہے۔ اس خاندان میں بڑے بڑے عالم، شاعر، جرنیل او سیاسی مدبر پیدا ہوئے۔ کوئی دماغی توازن کھو بیٹھا، ایک آدھ نے خودکشی کرلی اور ان کے ایک نزدیکی نسل کے ایک فرد نے تو جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کی۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن   اِجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

غ۔ پشتونوں کے مروت قبیلے میں بیگوخیل اور عیسک خیل گھرانے پشتو کے زمانے (مغلوں کا اختتامی عہد اور سکھا شاہی دور) سے مروتوں کے قائد اور سرغنے تھے۔ جو ھمیشہ ایک دوسرے سے مُشت بہ گریبان تھے۔ انگریز آئے تو سکھوں کے ساتھ ایک جنگ میں حکیم خان نامی ایک دلیر اور شجاع شخصیت نے ان کی مدد کی ۔ لکی قلعہ اس کی حمایت اور مدد سے فتح ہوا۔ انگریز نے سوچا کہ تور گُند اور سپین گُند (عیسک خیل

اور بیگوخیل) میں توازن قائم کرنے کے خاطر ایک تیسری سرداری یا خانی کی ضرورت ہے۔ اور اس طرح حکیم خان میناخیل کو خانی عطا کی ۔ (یہ بنوں گزیٹئیرکا بیان ہے)

لیکن روحانی آنکھیں اس اہم سیاسی واقعے کو ایک مختلف اور جدا نظر سے دیکھتی ہیں۔ اس قوم کی سفید ریش بزرگوں کی روایت ہے کہ یہ شنوا (کرک) گاؤں کے ایک بخاری سیّد کی دُعا اور فیضان ہے۔

روحانی تاریخ میں تبلیغی تصور، نیت اور اردائے کی فراوانی ہوتی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ انکساری اور سچ کی قوت کو تکبر اور جھوٹے مادی اسباب سے زیادہ مؤثر، طاقتور اور کامیاب ثابت کیا جائے۔ اس میں تقویمی لحاظ سے تضادات کا ایسا نقص آجاتا ہے جس کی وجہ سے ان روایات کو تاریخ کا درجہ دینا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور یہ گمان سر اُٹھاتا ہے کہ شاید یہ سارے واقعات محض جعلی اور قدیم واعظین کی وقتی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ تقویمی ھساب کی ان غلطیوں کی نشاندہی البیرونی اور بعض مستشرقین نے کی ہے۔ مثلاً مؤرخٰ ابن اسحاق اور واقدی متفق ہیں کہ جنگ بدر17 رمضان سن2 ہجری کو جمعہ کے دن وقوع پذیر ہوئی اور موسم سخت گرمی کا تھا۔ لیکن تقویمی حساب کے لحاظ سے17 رمضان سن2 ہجری کو دن جمعے کی بجائے بدھ اور موسم سردی کا تھا۔ اس طرح کبھی کبھی ایسے بزرگوں کا ذکر ھم عصر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جو زمانے کے لحاظ سے سالوں کیا صدیوں دور ہوتے ہیں۔ روایت ہے کہ لاہور کے داتا گنج

بخش رحمہ اللہ کو اپنے استاد نے لاہور جانے کا حکم دیا جہاں ان کے پیربھائی شیخ زنجانی رحمہ اللہ قطب ارشاد کے مسند تھے۔ لیکن تاریخی لحاظ سے شیخ زنجانی کافی بعد کے زمانے نغظبزرگ تھے۔ داتا گنج بخش اور حاجی بہادر کوہاٹی کے جائے مدفن کے بارے میں اور بعض اہل کشف (سفینتہ پرفائز الاولیاء مصنف دارا شکوہ اور قصتہ المشائخ از خواجہ محمد زائد اٹکی) کے اقوال اور تحریروں میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھی جائے کہ اہل کشف کے مکاشفے صرف انہی کے لیے حُجت ہیں اور عام لوگ اس کے ماننے کے مکلف نہیں ہیں۔

مادی تاریخ کے مفسر ایک واقعہ کو مادی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ نظر سطحی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کی آنکھ میں دو عدسے لگے ہوتے ہیں۔ ذہن کے پردے پر جو عکس آتا ہے۔ ان ہی خورد بینی عدسوں سے گزرنے اور منعکس ہونے کے بعد بنتا ہے۔ اس شے کی اصل حقیقت اور ماہئیت کیا ہے؟ مادی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتی۔ مثلاً ہم ایک دیوار کو دیکھتے ہیں۔ تو وہ ان ظاہری آنکھوں سے ہمیں صاف اور ہموار دکھائی دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دیوار واقعی ہموار ہے؟ یا پھر یہ مادی آنکھوں کا دھوکہ ہے؟۔ کیونکہ جب ہم اس ہموار دیوار کو ایک بڑے خوردبین سے ملاحظہ کرتے ہیں تو اس ہموار دیوار میں ہمیں بے شمار دراڑیں نظر آئیں گی۔ اب ہمیں اپنی آنکھوں کی خوردبینوں کے عکس کی جسامت اور ماہیت کو ماننا چاہئے یا پھر ایک بیرونی خوردبین کے عکس کو؟۔ اس طرح اگر ہم میز

پر پڑے ایک گلاس کو دیکھیں تو ہم کہتے ہیں کہ اس کے چار کنارے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اس گلاس کے صرف تین پہلو نظر آتے ہیں۔ چوتھا پہلو ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔ انسائیکلوپیڈیا میں جادو اور نظر بندی کے تماشوں اور مظاہروں کی کئی ایسی تصاویر دکھائی گئی ہیں کہ ایک عامل ایک دانہ زمین ر پھینکتا ہے ۔ لمحہ بھر میں وہ زمین سے سر نکالتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ایک سبز پودے کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور میوہ بھی پکڑ لیتا ہے۔ اب یہ سب واقعات نظر کا دھوکہ ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ عامل ہماری آنکھوں کو تو دھوکہ دے جاتا ہے۔ لیکن کیمرے کی آنکھ کیسے دھوکہ کھا جاتی ہے۔ غالب نے کچھ ایسی ہی صورت حال دیکھ کر کہا ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

اس روحانی نظام کو ملائک اور رجال الغیب خدائے عظیم و برتر کے حکم پر چلا رہے ہیں۔ اب ملائک اور رجال الغیب کے وجود کو ہمیں نیچری عالم ان مثالوں سے ثابت کرتے ہیں۔ کہ مادی اجسام میں 'پتھر' شہوت، غضب اور عقل کچھ بھی نہیں رکھتے۔ جبکہ جانوروں میں شہوت اور غضب کا مادہ تو موجود ہوتا ہے لیکن عقل ندارد ہے۔ انسان میں یہ تینوں عناصر موجود ہیں۔ اب ہم ایک ایسی مخلوق کیوں فرض نہیں کرسکتے جو عقل تو رکھتی ہیں لیکن شہوت سے مبرا ہے۔ مادی دنیاوی نظام کو چلانے کے لیے مختلف شعبہ جات پر بہ طور نگران علیحدہ

علیحدہ نگران افراد متعین ہیں۔ کوئی انجنئیر، کوئی ڈاکٹر اور کوئی جرنیل۔ اسی طرح اس کائنات کے تھوڑے مختلف جدا جدا شعبہ جات مثلاً بادل ، باد و باران وغیرہ کی نگرانی کے لیے بعض غیر مری نگران کیوں کر نہیں ہوسکتے؟ جن کو ویدوں کی زبان میں دیوتا اور قرآن کی اصطلاح میں ملائک کہتے ہیں۔ روحانی دنیا میں بھی ویسا ہی ایک منظم نظام قائم ہے۔ جس کے لیے ہر منصب دار کو علیحدہ علیحدہ فرض سپرد کیا گیا ہے۔ ولی، اوتار، قطب، غوث وغیرہ ہر ایک اس روحانی نظام میں الگ الگ منصبدار ہیں۔

شعر ۔ سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

چینی فلاسفر اور حکیم کنفیوشس کا ایک قول ہے۔ ‘‘وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے اور کانوں سے سُنے نہیں جاسکتے ان سے زیادہ یقینی اور واقعی حقائق کوئی اور نہیں ہیں۔’’ اسی طرح انگریز فلسفی بریڈلے نے لکھا ہےکہ ‘‘جو کچھ نظر آرہا ہے یہ حقیقت نہیں حقیقت اس کے پیچھے ہے۔’’ یا بقولِ غالب :

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں بازیگر دھوکا کھلا

مسجد نبوی میں ایک ستون تعمیر کی گئی ہے اور اسے ''حنّانہ'' کہتے ہیں۔ مولانا رومی علیہ رحمہ نے اس واقعہ اور معجزہ کی طرف اشارہ کرکے کیا معنی و حکمت کے موتی اس شعر میں پروئے ہیں۔

فلسفی گو منکرِ حنّانہ است
از حواسِ انبیاء بیگانہ است

مختصر یہ کہ مادی تاریخ میں سبب او علت کا ربط اور تسلسل عیاں ہوتا ہے اور محقق کی تھوڑی سی کاوش سے آشکارا ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی غیر مری اور عقل سے ماوراء کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ادراک کرنے کے لیے مغربی فلاسفروں کی زبان میں ذہانت کی ایک اعلیٰ قسم (سُپر انٹیلیکٹ) جبکہ مولانا روم کے الفاظ میں حواسِ انبیاء یعنی حواس کی ایک انتہائی حِساس حِس درکار ہے۔

انبیاء کرام، اولیاء عظام اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے معجزات، خوارق عادت اور کرامات کا ظہور مسلمانوں کے ہاں ایک مسَلم عقیدہ ہے۔ لیکن سب سے بڑی کرامت شریعت مقدسہ پر استقامت ہے۔ جس میں اسباب اور مروج سائینسی علوم کی ایک اپنی اہمیت ہے۔ آج زمانے کا مزاج ہی کچھ اور رنگ کا ہے۔ مادیت کے اس دور میں ان باتوں کو کون جانے۔

اکنون کرا دماغ کہ پُرسد زِ باغبان

بلبل چہ گفت و گل چہ شُنید و صبا چہ کرد

روشنائی تصوف

رقباتِ علم و عرفاں میں غلط فہمی سے مدبر کی

یہ ظالم حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

بھتر یہ ہوگا کہ پہلے میں اس تحریک کے بارے میں اپنے چند عمومی اور ذاتی خیالات ، معلومات اور معروضات مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرد وں۔

پشتون قوم کی مذہبی، قومی اور سیاسی نشاط ثانیہ کی تین تاریکیں مختلف ادوار میں اٹھیں اور اس قوم کی خاصی بڑی اکثریت کو متأثر کر گئیں۔ ان میں سب سے پہلی تحریک جنوبی وزیرستان کے مقام کانیگُرم سے شروع ہوئی اور روشنائی کے نام سے تاریخ کے صفحات پر اپنا ثبت کرگئی۔ مغلیہ سلطنت کی بنیادیں ہلا دینے والے اس تحریک کا بانی مبانی بایزید انصاری تھا۔ جس کو اس کے معتقدین ''پیر روشان'' کے نام سے پکارتے تھے۔مگر مغل دربار کے نورتن ابوالفضل نے اسے ''پیر تحریک'' کا نام دیا۔ پیر بابا (رح) کے خلیفہ اخوند درویزہ (رح) نے اس تحریک کی شدت سے مخالفت کی۔ دوسری تحریک عین اس وقت اٹھی جب روشنائی تحریک تقریباَ دم تھوڑ چکی تھی۔ بایزید کی اولاد کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں منصبدار اور جاگیر دار بنا دیا گیا تھا۔ اور تحریک کی بنیادی کتابیں ناپید ہوچکی تھیں۔ اس دوسری تحریک کے روحِ رواں ایمل خان ، دریاخان اور خوشحال خان تھے۔

پشتونوں کی تیسری بڑی تحریک انگریزی دور کے آخری سالوں میں حاجی صاحب ترنگزئ (رح) اور خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان نے چلا دی۔ ان تینوں میں اول الذکر اور آخر الذکر تحریکیں مذہبی اور سیاسی دونوں رنگ لیے ہوئیں تھیں۔

پیر روشان خدا داد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ انقلابی ذہنیت اور بلند خیال کی حامل شخصیت تھی۔ اس کا جدت پسند ذہن ارد گرد میں مرّوج علوم ، صوفیانہ خیالات اور فرسودہ رسومات کا متحمل نہ ہوسکا۔ جب اس کو ایک پیرکامل دستیاب نہ ہوسکا تو پھر ذاتی مجاهدوں اور سخت ریاضتوں کے بعد ایک نیا صوفیانہ مسلک ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسکی تحریک جو ابتداء میں مذہبی نوعیت کی تھی، نے رفتہ رفتہ ایک سیاسی رنگ اختیار کیا۔

روشنائی مکتب فکر اسلامی دنیا کا واحد اولین و آخرین سلسلہ طریقت ہے۔ جس نے پشتون خوا کی سرزمین میں جنم لیا۔ یہیں ارتقاء کی منزلیں طے کیں اور یہیں سے دوسرے علاقوں میں پھیلا۔ باقی سارے سلسلے بیرونی ممالک سے اس علاقے میں پہنچے۔ اگرچہ نسلا" اس سلسلے کا بانی خود پشتون نہ تھا۔ بلکہ انصاری عرب تھا۔ دورِ حاضر کے بعض محققین نے پشتونوں کی کسی نہ کسی شاخ سے اس کا تعلق جوڑا ہے۔ لیکن یہ سب مفروضے ہیں۔ وحدت الوجودی نظریہ کے قائل تو ماسوا نقشبندیہ مجددیہ کے باقی سب سلاسل جیسے سہروردیہ، چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ باقیہ سب ہیں۔ تو اخوند درویزہ بابا اور چند دیگر بزرگوں نے روشنائی مسلک کی اتنی

مخالفت کیوں کی؟ تو اس کی وجہ روشنائی مسلک کے نام پر سلاسل طریقت میں ایک نئے سلسلے کی ایجاد کی بنیاد رکھنی تھی۔ باپ دادا کے سلسلے سے بغاوت تھی۔ اس نئے سلسلے میں بعد میں انتہا پسندی اور شدت پسندی در آئی تھی۔ اس کا وحدت الوجودی نظریہ ہندو ؤں کے حلول اور ویدانیت کے قریب تھا۔ وہ خداوند پاک اور روح میں فرق نہیں کرتا۔ پیرِ تمام اور پیغمبر کو ہم مرتبہ سمجھتا ہے۔ (بحوالہ مضمون رسالہ ''الحق'' از مولانا مدرار اللہ صاحب) ۔

سُنی حضرات جیسے چار کتابوں کو الہامی مانتے ہیں۔ چار فرشتوں کو افضل کہتے ہیں۔ چار خلفائے راشدین کو برحق سمجھتے ہیں۔ فقہ کے چار مکاتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ویسے ہی اکثر تصوف کے چار سلسلوں میں بیعت ہوتے ہیں۔ اس میں کسی اور الہامی کتاب اور سلسلے کی گنجائش نہیں ہے۔ پیر روشان نے تو سلوک کی ابتداء ہی ان مروج طریقوں سے بغاوت سے کی اور ایک نئے سلسلے کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اکثر صاحبانِ اقتدار و اختیار ، صوفیائے کرام اور علمائے وقت اس کے سخت مخالف بن بیٹھے اور عام لوگ تو ہمیشہ ان ہی طبقات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور نئے آئین کا اعلان کبھی کبھار سنگین مضمرات پر منتج ہوتا ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اُڑنا

منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

پروفیسر ڈاکٹر پرویز مہجور پشتونخوا کے ایک نامور دانشور ، محنت کش تجزیہ نگار ، ادیب اور مصنف ہیں۔ 'روشنائی تصوف' ان کی لکھی ہوئی کتاب کا مسودہ ہے۔ محترم ذہین مصنف نےایک بہت ہی نازک لیکن تاریخی اہم موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ اول تو تصوف اور طریقت بذاتِ خود ہمارے بہت سے علمائے ظاہر کی نظر میں توحید اور رسالت کے خلاف ایک متوازی دین ہے۔ همارے ایک راسخ العقیدہ متشرع دوست کافی مدت سعودی عرب میں ڈاکٹر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بار میں نے مکہ معظمہ میں ایک بڑے عالم کے سامنے حضرت اشرف علی تھانوی (رح) کا ذکر ان الفاظ میں کیا کہ وہ ایک برگزیدہ عالم اور صوفی گذرے ہیں۔ تو اس وہابی عالم نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بڑے تعصب سے بولا۔ ''عالم اور صوفی۔ توبہ '' ۔

تصوف کی بہترین تعریفیں کی گئیں ہیں۔ لیکن ایک معتدل اور میری پسند کی رائے یہ ہے کہ اصل تصوف خداوند تعالیٰ کو عبادت کے ساتھ، رسولِ خدا ﷺ کو محبت کے ساتھ اور مخلوق کو خدمت کے ساتھ راضی کرنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر مہجور نے اس سے بھی بڑھ کر جرأت اور کمال کا کام سرانجام دیا ہے۔ کہ زمانوں سے علماء کے منّہ سے دھتکارے مسلک کے بانی کے صوفیانہ نظریات کا جائزہ اس تحریک کے مأخذ بنیادی کتابوں کی روشنی میں ایسے مثبت اور مناسب انداز میں لیا ہے کہ اس مسلک کا عالمانہ رنگ میں دفاع کیا ہے۔ اسکی ایک بہتر تشریح و توجیح کی ہے۔ اس کا ایک نمایاں خاکہ کھینچا ہے۔ ساتھ

ہی اس کو ایک خوبصورت، مؤثر ، منطقی اور ماہرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کہ یہ میرا پکا یقین ہے کہ اگر اخوند درویزہ بابا (رح) بھی تعصب کی عینک اُتار کر ٹھنڈے سینے کے ساتھ اس مضمون کو پڑھتے تو اپنے فتوؤں پر پشیمانی کے بعد ان سے رجوع فرما لیتے۔ اس طرح موجودہ دور کے نقاد بھی اپنے اختلافی بیانات پر بارِ دیگر غور کریں گے۔ مہجور صاحب کا کام اتنا آسان بھی نہ تھا۔ کیونکہ پیر روشان کے ایک دوسرے ہم عصر مصنف جس کا بعض روایات کے مطابق ان سے بالمشافہ ملاقات ہوئی تھی، نے اپنی کتاب ''دبستانِ مذاہب'' میں برملا روشنائی مسلک کو ایک جداگانہ مذہب قرار دیا تھا۔

اب آئیے پروفیسر ڈاکٹر مہجور کی تصنیف ''روشنائی تصوف'' کے مندرجات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ کتاب کے اولین ابواب میں فاضل تجزیہ نگار نے طریقت کے الگ الگ سلاسل کا تاریخ وار ذکر کیا ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں۔ تصوف کے تمام سلاسل کی کڑیاں آخر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتی ہیں۔ سوائے نقشبندیہ جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ یہ سارے سلاسل بشمول نقشبندیہ مسلک کے، امام الاولیاء شیرِ خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو تسلیم کرتی ہیں۔ فاضل مصنف نے حضرت علی (رض) کا ذکر کہیں بھی از راہِ تبرک بھی نہیں کیا ہے۔ البتہ پیر روشان ایک جگہ اپنے حلال اور حرام کے بارے میں اپنے مؤقف کو تقویت دینے کی خاطر حضرت علی (رض) کا ایک قول پیش کرتے ہیں۔ علی محمد مخلص روشنائی کے ایک شعر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

روشنائی مسلک میں بھی حضرت صدیقِ اکبر (رض) سے ولایت کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسے کہ سلسلہ نقشبندیہ کا مسلک ہے۔ مہدی معصوم اور پاک کا تصور تو سُنیوں اور شیعوں دونوں میں موجود ہے۔

ابتداء د ولایت شوہ لہ صدیقہ

خاتمت ئ پہ مہدی معصوم و پاک دے

ترجمہ ۔ ولایت کی ابتداء صدیق سے ہوئی ۔ جبکہ اس کا خاتمہ معصوم اور پاک مہدی پر ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی (رح) نقشبندی تین مراتب یا درجات کا ذکر کرتے ہیں۔

1 ۔ نبوت 2 ۔ امامت 3 ۔ ولایت

نبوت میں سارے انبیاء کرام شامل ہیں۔ امامت کے درجے پر شیخین عظام (حضرت ابوبکر صدیق (رض) اور عُمر فاروق (رض) فائز ہیں۔ مقام ولایت میں شیر خدا کو امام الاولیاء کا مرتبہ حاصل تھا۔ باقی باریکیوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔

مطلب یہ کہ روشنائی ایک جُدا صوفیانہ مسلک ہے ۔ جس میں سُنیوں کے دیگر مسالک میں مروج اصطلاحات کو جدّت کا رنگ دیا گیا ہے۔ ویسے باطنیت پر تو تصوف کی ساری بنیاد قائم ہے۔ جس کی عزیز مصنف نے بھی خوب وضاحت کی ہے۔

اس طــرح روشــنائی مســلک پــر اســماعیلیت اور شیعیت کے اثرات کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ فاضل مصنف نے ’’ حالنامے ‘‘ کی ایک عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پیر روشان کا مسلک اویسیہ تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ۔ اصل یہ ہے ’’پیر دستگیر فرمود کہ طریق ما چوں اویسیہ است ‘‘ اس جُملے کا حرف بہ حرف معنی' ہے۔ ’’ پیر دستگیر نے فرمایا کہ ہمارا طریقہ بہ مثلِ اویسیہ ہے۔ ‘‘ روشنائی تصوف میں ایک جدا طریقت کا راستہ ہے۔ جس کا ایک بانی مبانی ہے۔ بنیادی تعلیمات اور اسباق کی الگ ایک کتاب ہے۔ جسے وہ دیگر مسالک کے برخلاف الہامی گردانتے ہیں۔ اسی طرح اس کی اپنی صوفیانہ اصطلاحات ہیں۔
۱۔محترم تجزیہ نگار نے شیخ داتا گنج بخش (رح) کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ داتا گنج بخش کا تعلق طریقت کے کسی بھی سلسلے کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن وکی پیڈیا کا بیان ہے کہ داتا صاحب راہِ طریقت میں ابوالفضل محمد بن حسن ختلی (رح) کے مرید تھے۔ اور شیخ ابوالفضل ختلی طریقت میں سلسلہ جُنید یہ کے ایک صوفی بزرگ تھے۔
۲۔محدثین اور صوفیاء کے ہاں احادیث کی جرح اور تعدیل کے پیمانے مختلف ہیں۔ صوفیاء کی کتابوں میں ایسی ایسی عبارتوں کو بھی حدیثوں کا نام دیا گیا ہے جسے محدثین ضعیف موضوعی، مرفوع، مقطوع (منقطع) عربی مقولے، اسرائیلیات یا کسی بزرگ اور مشائخ کے اقوال قرار دیتے ہیں۔ جبکہ حال یہ ہے کہ ایسی احادیث صوفیاء کے سارے استدلال اور علم کی بنیاد ہیں۔ ایسے ہی علمائے

ظاہر اور علمائے باطن کے قرآنِ پاک کی آیتوں کی تاویل ، معنی اور تشریح میں بھی کبھی کبھی فرق ہوتا ہے جس کی طرف مصنف نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اور اقبال نے بھی اپنی اس رباعی میں یہ گِلہ کیا ہے۔

زمن ہر صوفی و ملا سلامے

کہ پیغامِ خدا گفتند ما را

ولے تاویلش آن در حیرت انداخت

خدا و جبرائیل و مصطفےٰ را

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں اول قرآنِ پاک کی آیتوں کو اکٹھا کیا گیا۔ پھر آحادیث کے مجموعوں کا نمبر آتا ہے۔ تیسرے نمبر پر فقہہ ہے ۔ اور آخر میں تصوف۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں اسلام صوفیاء کرام کی کوششوں کی برکت سے پھیلا۔ علماء کی اکثریت کا تعلق فقہ حنفیہ سے تھا۔ آحادیث کا علم کافی مدت کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ اور انکی اولاد کی برکت سے پھیلا۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء (رح) اور ان کے زمانے کے قاضی صاحب کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ کہ سماع کے بارے میں شیخ المشائخ انھیں صحاح ستّہ کے حوالے دے رہے تھےتو قاضی صاحب نے اُن سے امام ابو حنیفہ

(رح) کی سند مانگی۔ جنابِ سرتاجِ اولیاء (رح) جلال میں آگئے اور فرمایا کہ لعنت ہو اس قوم پر جسے میں احادیث کا حوالہ دے رہا ہوں اور وہ مجھ سے امام صاحب کا قول مانگتی ہے۔

ایسا ہی پیر روشان کا سخت مخالف اخوند درویزہ (رح) اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دف سُننے کے واقعے کو کفار کی افتراع اور بھتان کہتے ہیں۔ '' واقعہ افترا۔ ۔ ۔ ۔علی النبی علیہ الصلواۃ والسلام '' حالانکہ اس واقعہ کا ذکر حدیث پاک کی دو مشہور کتابوں بخاری شریف اور مشکواۃ شریف دونوں میں آیا ہے ۔ ایسے ہی اخوند صاحب وجد اور رقص کو بُرا کہتے ہیں۔ حالانکہ احادیث کی دو کتابوں بیہقی اور ابو داؤد میں لکھا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر طیار (رض) سے فرمایا کہ '' اشبھتُ خَلّقی و خُلقی '' (تم صورت اور سیرت میں مجھ سے مشابہ ہو۔) تو جعفر طیار (رض) 'حجل' (وجد، دور، رقص) کرنے لگے۔ ویسے تو ایک عام مثل ہے کہ '' ولی را ولی می شناسد'' لیکن کبھی کبھی احوال مقامات اور طبعی ذوق میں فرق کی بنا پر ان میں غلط فہمی اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۔پیر روشان نے نفس کی چار اقسام بیان کی ہیں۔ (الف) نفس امارہ (ب) نفس لوامہ (ج) نفس ملہمہ (د) نفس مطمئنہ ۔ ان میں نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ تو

قرآن پاک کی اصطلاحات ہیں۔ مگر نفس ملہمہ کا ذکر قران پاک میں نہیں ہے۔ جو بقول پیر روشان فرشتوں کی جگہ ہے یہ عالم ملکوت ہے۔ مصنف نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔ البتہ نفس ناطقہ کا ذکر بعض علماء اور مشائخ نے کیا ہے۔ جس کے بل ہوتے پر سالک اچھے اور بُرے کی تمیز عقل سلیم یا منطق کے ذریعے کرتا ہے۔ اور پھر ان سات خصائل رذیلہ کا بیان ایک حدیث پاک کے حوالے سے کرتا ہے۔ تکبر، حرص، حسد، شہوت، بُخل اور کینہ۔

حمزہ بابا (رح) چشتی نظامی ان میں دو اور اقسام کا اضافہ قرآن کی روشنی میں یوں کرتے ہیں۔ نفسِ راضیہ (بندہ خدا وند تعالیٰ سے راضی ہوجاتا ہے) اور نفسِ مرضیہ (خداوند پاک بندے سے راضی ہوجاتا ہے) ۔ حال یہ ہے کہ یہ دونوں نفسِ مطمئنہ کے جزو ہیں۔

۲۔علم ظاہر اور علم باطن میں کیا فرق ہے؟۔ یہ سوال ایک دفعہ استاد محترم میاں تقویم الحق کاکا خیل نے اپنے ایک خط میں پوچھا تھا۔ میں نے اپنے محدود علم کے مطابق ان کو لکھا کہ فقط علمِ ظاہری کے مالک عالم شرعی احکام کا اطلاق فرعون اور منصور حلاج دونوں پر یکساں کرتے ہیں ۔ انا الحق اور انا ربکم الاعلیٰ کے دعوؤں کے فرق کو نہیں سمجھتے ۔ احوال اور مقامات میں تفاوت روا نہیں رکھتے۔ اور دیگر مثالوں کے علاوہ ان کے جد امجد حضرت کاکا صاحب علیہ الرحمت کی ایک مثال بھی سپرد قلم کی۔ تاریخ مرصع میں تحریر ہے کہ کاکا صاحب نے ایک

دفعہ اپنی کتابیں علماء اور خُدام کو عنایت کردیں اور مسجد کو ویران کردیا۔ لکڑیاں اور اینٹیں فقراء میں تقسیم کردیں۔ شیخ شہاب الدین (رح) جو راقم الحروف کے ہم جد رشتوں سے تھے) اور جو راہِ حق کے راہرو تھے، نے حضرت کاکا صاحب کو پیغام بھیجا کہ کتابیں لوگوں میں تقسیم کردیں اس کا آپ کو حق تھا۔ لیکن مسجد تو کسی کی بھی ملکیت نہ تھی۔ آپ نے کس بنیاد پر اس کی لکڑیاں اور اینٹیں فقراء میں تقسیم کردیں؟۔ شیخ کاکا صاحب نے جواب میں انہیں کہا کہ میں اِن چند کتابوں اور مسجد کے سوا کسی شے کے ساتھ دلبستگی نہیں رکھتا تھا اور جس چیز کے ساتھ دلبستگی رکھتا ہوں۔ اسے اپنے راستے کا دشمن خیال کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے کتابیں تقسیم کردیں۔ ایسے ہی مسجد کے ساتھ میری دلبستگی تھی۔ میں اس میں نماز پڑھتا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ مسجد کے ساتھ میری یہ دل بستگی اس جگہ میری نماز کو بُت پرستی بنا دے۔ اس وجہ سے مجھ سے یہ عمل سرزد ہوا۔ اس سلسلے میں مجھے معذور سمجھیں۔ ' میاں صاحب ! یہاں میرے خاندانی بزرگ کا سوال ایک عالمِ ظاہر کا استفسار تھا اور آپ کے جد امجد کی معذرت ایک عالم باطن کا جواب تھا۔"

افسوس ہے کہ پیر روشان کے بارے میں اب تک دو قسم کے دانشوروں نے تحریریں رقم کی ہیں۔ پہلے گروہ میں کٹر قوم پرست اور ملکی اور غیر ملکی سیاسی اغراض کے تحت لکھنے والے مصنفین شامل ہیں۔ دوسرا گروہ بڑے بڑے علمائے

ظاہر کا گروپ ہے۔ کسی تصوف پر فنی عملی یا علمی مکمل تصرف رکھنے والے دانشور نے اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا۔ یا پھر ایسی تحریر میری نظر سے نہیں گذری ۔ یہ کمی فاضل مصنف محترم ڈاکٹر پرویز مہجور صاحب نے مکمل انصاف کے ساتھ پوری کردی۔ جو ولی تو نہیں لیکن خالی بھی نہیں۔ عملی صوفی نہ سہی لیکن ان کا تصوف کے بارے میں علم اور مطالعہ کافی اور عمیق ہے۔

عزیزی مصنف نے اس تحریک کے سیاسی رُخ کو سرے سے چھیڑا ہی نہیں۔ اگرچہ ہر مذہبی اور اصلاحی تحریک آخر سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہی ہماری تاریخ کا المیہ ہے۔ حیرت کی بات بھی یہی ہے کہ ’’خیرالبیان‘‘ میں کہیں بھی جہاد یا قتال کا ذکر نہیں۔ حالانکہ بعض علماء کے نزدیک یہ اسلام کا چھٹا رکن ہے۔ اس تحریک نے سیاسی رُخ اُس وقت اختیار کیا جب چند جنونی روشنائی ِچلہ کشوں نے ایک پُر امن قافلے کو لوٹا اور یہ تحریک پشتون قبائل میں نفاق اور فساد کا سبب قرار دی گئی۔ اور اس کے مریدوں کا کام رہزنی اور عنیدی ٹھہرا۔ لیکن یہ زیادہ تر اس کے سیاسی اثرات تھے جو مصنف کے دائرہ کار سے باہر موضوع ہے۔ اس لیے اسے نہیں چھیڑا۔

1 طریقہ اویسیہ میں سالک کی تربیت اور تکمیل جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بغیر پیر کے واسطے

کے خود فرماتے ہیں۔ مصنف نے تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے۔لیکن چشتیہ نظامی حمزوی کے بزرگ حضرت امیر حمزہ شنواری مرحوم اپنے مرید ملک عبدالرحمان صاحب کے نام اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں۔ کہ اویسی کے باوجود سالک کسی بزرگ سے خواہ مخواہ استفادہ کرے گا۔ کاکا صاحب کے طریقہ اویسیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کاکا صاحب نےبھی اپنی زندگی میں کسی بزرگ سے استفادہ کیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم کو معلوم ہو کہ کس سے استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ عدم علم سے عدم شے لازم نہیں ہوجاتا۔ کُتب مناقب میں لکھا ہے کہ کاکا صاحبؒ اپنی زندگی میں اخوند پنجو باباؒ ، پیر سباکؒ، شیخ آدم بنوریؒ اور حاجی بہادر ؒ سے فیض یاب ہوئے تھے۔ پیر روشان تو بلا واسطہ سیدھا اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور خود ایک مسلک اور مکتب بنا بیٹھا اور تصوف میں ایک نئے اجتہاد کا راستہ اپنایا۔ اور صاحبانِ دستار و جُبّہ اس کے کٹّر مخالف بن گئے۔

۲۔مہدی: مہدی کے لقب سے اسلامی دنیا میں کافی شخصیتیں گذری ہیں۔ مثلاً شیخ الائی سیّد محمد جونپوری ، مہدی سوڈانی

وغیرہ ۔ مہدی سوڈانی نے تو مہدیوں کے نام سے سوڈان میں ایک حکومت بھی قائم کی تھی۔ سیّد محمد جونپوری نے تو مہدویت کا دعویٰ مکہ معظمیٰ میں کیا تھا۔ لیکن مکہ کے علماء نے اسے خاص در خورِ اِعتناء نہ سمجھا۔ صرف مہدویت کا دعویٰ خود کوئی خاص تشویش کی بات نہیں ہے۔ بلکہ دین کی احیاء اور تجدید کا سبب بنتا ہے۔ اصل مہدی موعود ، مہدی مسیح یا مہدی آخر زماں ہوگا۔ جن کا نزول قیامت سے پہلے ہوگا۔ پیر روشان خود کو اپنے آپ کو مہدی کرنے کی تردید کرتا ہے۔ البتہ اس کے ایک خلیفہ ارزانی خویشکی نے اس کے لیے یہ لقب استعمال کیا ہے۔ اب یہ خاص لفظ ضرورتِ شعری کے تحت استعمال ہوا ہے یا یہ کہ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ''پیر نمی پَرَد ولی مریدان می پرانند '' والی مثال ہے۔

۳۔فاضل مصنف کا ایک اہم اور قابلِ بحث نکتہ صفحہ 112 کی یہ عبارت ہے۔ '' پس بایزید قدس سرہ غسل ---- اور نیچے حاشیہ میں لکھا ہے (مقامات منقوط در نسخہ اکیڈمی خالی اند) اور پھر اس عبارت کا ترجمہ پشتو میں یوں کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے۔ ''بایزید نے غُسل (ترک کردیا، چھوڑ دیا) خیرالبیان کے تنقیدی مطالعے میں بھی ایک دوسرے محقق قلندر مہمند نے اس عبارت کو یونہی رکھا ہے۔ اور پھر غُسل کو ترک کردینے کی تاویلات بھی لکھی ہیں۔ میں وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ قلندر صاحب کے اصل الفاظ کیا

تھے۔ کیونکہ سالوں پہلے فاضل مصنف کی یہ تحریر میری نظر سے گذری تھی (چراغ) سال 1364 ش میں کابل پشتو ٹولنے کے دو بڑے محققین دوست محمد شنواری اور نور اللہ اویسال نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد بایزید کے اس ''حالنامے'' کو شائع کیا ہے۔ اس نسخے کے صفحہ 73 پر اس عبارت کو یوں تحریر کیا گیا ہے۔ ''بس بایزید قدس سره غُسل جمع ساخت'' تعجب اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان سب فاضل محققین کا ماخذ علی گڑھ یونیورسٹی میں پایا جانے والا واحد نسخہ ہے۔ لیکن '' غُسل نمود'' کے مقابلے میں ''غُسل ساخت'' کی ترکیب فارسی محاورے کے مطابق ہے۔ اور ایک اہم بات یہ ہے کہ اب تک حالنامے کا یہ واحد نسخہ دستیاب ہے۔ ویسے ایسا لگتا ہے کہ مخزن کے مقدمہ نگار اور ان کے ساتھیوں کے ذہنوں میں پہلے سے ہی اخوند درویزه کی طرف سے لگائی ہوئی الزامی تحریر تھی۔ ایسا ہی معاملہ خیرالبیان کے واحد نُسخے کا بھی ہے۔ جس پر بعض تجزیہ نگاروں نے اعتراضات کیے ہیں۔ جیسا کہ وِکی پیڈیا کے مضمون نگار نے لکھا ہے۔

"However, this Pashto Book is -- not in author's words but a Pashto Academy translation of his original Persian manuscript"

ترجمہ۔ ''پھر بھی پشتو کی یہ کتاب مصنف کے اپنے الفاظ میں نہیں ہے بلکہ پشتو اکیڈیمی کی اصل فارسی نسخے کا ترجمہ کردہ ہے۔'' لیکن پشتو کے نامور افغان محقق

محترم ھیواد مل نے رامپور کی لائبریری میں خیرالبیان کے ایک دوسرے نُشخے کا انکشاف اپنی کتاب’’پشتو ادب کی نثر کے آٹھ سو سال‘‘ میں کیا ہے۔ چاہیے کہ محققین دونوں نُسخوں کا موازنہ کرنے کے بعد ایک نتیجہ اخذ کریں تاکہ شکوک رفع ہوں۔

محقق مہجور صاحب اولین محقق ہیں جنھوں نے پیر روشان کو شہودی ثابت کیا ہے۔ جبکہ اب تک سارے محقق اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا مسلک وحدت الوجودی نظریے کے قریب ہے۔ مہجور صاحب پیر روشان کے عرفانی عروج کے احوال کے آخری منزل سکونت کو یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ سالک اس حال میں دوبارہ مخلوق کی طرف رجوع کرتا ہے اور نور کے حلقے سے نکل کر اس پر ظاہر ھوتا ہے کہ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق۔ روشنائی مسلک کے اس پہلو کی طرف جس طرح فاضل تجزیہ نگار نے اپنے قارئین کی توجہ مبزول کی ہے۔ اور پھر اس کی کامیابی کے ساتھ وضاحت کردی ہے۔ یہ میرے خیال میں ایک لائقِ ستائش منفرد کمال اور مضمون تک ایک نئی رسائی، گہری دانائی اور مطالعہ کی وسعت کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم ان کے اس نئے مؤقف کو صحیح تسلیم کرلیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انھوں نے کسی شک کی گُنجائش بھی نہیں چھوڑی۔ تو

ان کے اس بیان سے ایک نیا ہینتیجہ نکلتا ہے۔

شیخ احمد سرھندی (رح) ھندوستان میں وہ اولین بزرگ سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے ابن عربی کی وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشھود کا نظریہ پیش کیا۔ اب پرویز مھجور صاحب کی اس نئی تحقیق کے بعد ھم بڑے وثوق سے یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ اس علاقے میں شھودی نظریہ کی بنیاد رکھنے والے پیر روشان تھے۔ کیونکہ مجدد الف ثانی (رح) کا زمانہ 1564ء تا 1624ء یا 974 ھ تا 1034 ھ ہے۔ اور عمر تقریباً 60 سال تھی۔ پیر روشان 1525 - 26 ء یا 931 - 32 ھ میں پیدا ہوئے اور سال 1572 - 73 ء بمطابق980 ھ میں وفات پائی۔ بلکہ مجدد صاحب کے مرشد اور ھندوستان میں صاحب سلسلہ اور خود بھی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے مؤسس خواجہ باقی اللہ وجودی تھے۔ وہ بھی پیر روشان سے کم عمر تھے۔ (971 ھ تا 1012ھ) یہ ایک نیا انکشاف ہےجس کا اعزاز مھجور صاحب کو پہنچتا ہے۔ اگرچہ پیر روشان نے اس مرحلے کے لیے شھود کی اصطلاح استعمال نہیں کی اور اسے سکونت کا نام دیا۔

۲۔ **پُر اسلوب** ؛ فاضل مصنف نے خیرالبیان کے اسلوب بھی مفصل تفصیلی بحث معہ علمی ثبوتوں کے کی ہے۔ یہ سب کچھ صحیح۔ لیکن میں خود شاید کم

فہمی کی بنا پر خیرالبیان کے اس اسلوب سے متأثر نہیں ہوں جو مخلص، ارزانی، مرزا خان انصاری اور ان جیسے دیگر صاحبانِ نظر علماء اور شعراء کو وجد میں لایا۔ میرے خیال خام میں اس میں الہامی لے، سرور اور آھنگ تو کجا رحمان بابا (رح) کے کلام کا اعجاز بھی نہیں پایا جاتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) ، ابن عربی (رح) اور مولانا روم (رح) کے کلام کی تاثیر، فن اور ترنم تو بڑی دور کی بات ہے صرف چند ہم وزن الفاظ اور چند صوتی قافیوں مثلاً ادمیان، اعلام ، کلام، حرام، اسلام کو استعمال اور یکجا کرکے جنات کی زبان میں بولنے کا ایک غیر موزوں طرزِ بیان ہے۔ پیر تمام کے اپنے کلام میں نہ تو الہامی کیف، روحانی حلاوت اور نغمگی ہےاور نہ ہی اس میں وجدان کی روشنی، معنویت کی تجلیات اور لہریں موجزن ہیں۔ روحانی سرور اور شیرینی مفقود ہے۔ الہامی کلام کے درمیان عام فقہی مسائل کا بیان کیا معنی؟ البتہ پیر روشان کی وسعتِ علم، صوفیانہ مشابہات، قلبی واردات ، توحیدی مقصد، اخلاص مجتہدانہ صلاحیتوں اور مسکنت کے بلند مقام تک پہنچنے کی سعی اور جدوجہد نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس کی یہ ذھنی صلاحیتیں وہبی، کسبی اور خاندانی نہیں۔ اس کا پیغام عالمگیر تھا۔ صرف افغان فارسی دان، عرب یا عجم کو مخاطب نہ تھا۔ بلکہ آدمیان (نوع انسان)

کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ اس لیے تو آج کل روسی آتے ہیں اور اسے جاگیرداری نظام کا مخالف ایک سوشلسٹ ثابت کرتے ہیں۔قوم پرست اس کو پشتون قوم پرستی کا اولین سرخیل اور مؤسس سمجھتے ہیں۔ اسماعیلی باطنی مبلغین اس کی تعلیمات میں اپنے مطالب تلاش کرتے ہیں۔ اور مغربی مفکرین اس کو انسانی برادری کا مخاطب۔ مغل استعمار کا دشمن۔ مرد و زن کو ایک جیسی تعلیم کا نقیب جانتی ہے۔ لیکن اگر کوئی اس جامع المعنی تحریک اور مسلک کی تعلیمات کی اصل جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہے تو پرویز مھجور کی اس کتاب کا بہ غور و فکر مطالعہ کرے۔

۳۔ فارسی کے ایک شاعر شاید شیخ علی حزین کا قول ہے؛ ’’تصوف برائے شعر گفتن خوب است‘‘ تصوفی خیالات اکثر رمز، کنائے اور تشبیہہ میں بیان ہوتے ہیں۔ ایک تصوراتی اور خیالی حُسن کی دنیا ذہن میں سجاتا ہے۔ صوفی کے قول کا ظاہری مطلب ایک ہوتا ہے۔ اسکے سطحی معنی اکثر معمولی اور ذومعنی اور کبھی کبھی شریعت مقدسہ کی گرفت میں آتے ہیں۔ لیکن باطن میں اس میں معنی کا ایک سمندر اور شریعت کی اصلی روح پنہاں ہوتی ہے۔ جیسے کہ مولانا روم کا یہ شعر ہے ۔

من زِ قرآن مغز را برداشتم

استخوان پیشِ سگاں گزاشتم

ایک قادری بزرگ کا شعر ہے؛

پنجہ خود را در پنجہء خدا دارم
من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

ولدت اُمی ابھا ز امن عجباتی
انا طفل صغیر فی حجور مرضعاتی

(ترجمہ ؛ میری ماں نے میرے باپ کو جنم دیا۔ یہ عجیب بات ہے کیونکہ اس وقت میں خود دائیوں کی گود میں کھیل رہا تھا اور چھوٹا بچہ تھا۔)

اب اگر میں ان اشعار کی تشریح، معنی اور مفہوم کی تفصیل میں جاؤں تو مضمون طوالت کا شکار ہوجائے گا۔ لیکن اس علم کے دانشوروں کے مُنّہ سے نکلے اس قول پر اکتفا کروں گا۔ کہ شریعت میں ٹھوکر کھانے سے بندہ کافر ہوجاتا ہے لیکن تصوف کے احوال اور مقامات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہونے سے سالک کافر نہیں ہوجاتا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کشفی الہام صرف صاحب کشف کے لیے حُجت ہوسکتا ہے۔ لیکن تمام مخلوق اس کے ماننے کی مکلف نہیں ہے۔ لیکن باوجود ان سطحی خطرات اور احتمالات کے صوفیانہ اور خاص کر وحدت الوجودی شاعری مشرقی شاعری کا حُسن ہے۔ جتنی رفعت اور مزہ وجودی صوفیانہ شاعری میں ہے۔ اسکے

مقابلے میں وحدت الشہودی شاعری بغیر نمک و خوشبو، بے رنگ اور خُشک لگتی ہے۔ فارسی، اردو اور پشتو کے اکثر شاعر وجودی ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ پشتو زبان میں روشنائی شاعروں نے جس پائے کی شاعری کی ہے اس کی مثال اور نظیر نہ پہلے پشتو شاعری میں ملتی ہے اور نہ اب ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نغمہ شہودی ہے تو لے وجودی ہے ۔ اس کی مثالیں مہجور صاحب کی اس تصنیف میں جا بجا موجود ہیں۔

۲۔ اگرچہ نامور شاعر اور صوفی امیر حمزہ شنواری نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ ستاریہ'' میں حضرت پیر بابا کے سلسلے کی ابتری کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس کا سبب اخوند بابا (رح) تھے۔ کیونکہ پیر بابا قدس سرہ نے ان کی تکمیل سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ اس طرح اخوند درویزہ تکمیل کے درجے تک نہیں پہنچے اور ان کے بعد سارا سلسلہ ختم ہوگیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات بڑی اہم ہے کہ اخوند درویزہ (رح) کا مزار ان کی بہت زیادہ شریعت کی پابندی اور دین برحق سے اخلاص کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ مرجع خلائق ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ سلوک اور معرفت کے جویان نے اس قبر سے فیض پایاہے۔ اس کے برعکس پیر روشان کی قبر کا پتہ نہیں لگتا۔ سب

مفروضے ہیں۔ اسکے باوجود تاریخ کے اوراق میں اور مہجور جیسے دانشور، مؤرخین اور عارفین کے دلوں اور محفلوں میں اس کا متنازع الصفات عقبرہ قہرمان کو ایک دائمی بقا حاصل ہے۔

بعد از وفات تربتِ من در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزارِ ما ست

اور

میں بعد مرگ بھی بام وفا میں زندہ ہوں

تلاش کر میری محفل میرا مزار نہ پوچھ

2 محترم پرویز مہجور نے تقریباً چار سو پچاس سال بعد اس تصوفی مسلک اور اس کے بانی کو کفر اور لعنت کے ان الزامات سے باعزت بری کر دیا ہے۔ جو اس وقت سے اب تک اخوند درویزہ بابا کے متعقدین اور متأثرین علماء اور صوفیاء نے ان پر تواتر سے لگائے۔ اپنے تحقیق میں نئے نئے نکتے منکشف کیے۔ مختصر یہ کہ آج سے یہ کتاب اس مسلک پر ایک حکم (سند) اور حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ اور پشتو کے تصوفی ادب میں ایک اہم اور منفرد اضافہ ہے۔ میرے خیال میں مہجور کے بعداس عبقری ذہن پر، جو وقت سے پہلے پیدا

ہــوا،کی شخصــیت، تعلیمـــات اور خیالات پر دیگر کئـی صـاحبانِ نظـر اور بصیرت نت نئـے زاویوں پر قلـم اٹھائیں گـے۔ انشاء اللہ !

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

3 آخــر مــیں ایــک وضاحت ضروری سمجھتا ہـوں کـہ میں علمائے حق ۔اولیائے برحق اور باصفا کی خاکِ پا ہوں۔ عالم ہوں نـہ صوفی ہوں اور نہ ہی محدث و فقیہہ ۔ اس وقـت کتـبِ حوالـہ جـات بھـی پـاس نہـیں اور جسـمانی ، اعصـابی اور ذهنی کمزوری مزید برآں۔ ۔۔ اب عناصر میں وہ اعتدال کہاں ؟

صرف بعض علمـاء صـاحبان اور صـوفیائے کـرام کـی ہـم نشـینی اور اپـنے ادھـورے مطـالعے اور پرانے خاندانی پس منظر اور نسبت کی برکـت اور بـل بـوتے پـر عزیـزان محتـرم مهجـور صــاحب خویشــکی اور نصــراللہ خــان وزیــر کــے پُــرزور اصـرار اور فرمـائش پـر یـہ چنـد بـے ربـط سـطور سـپردِ قلـم کـئے۔ سـہو، غلطـی اور لغـزش کـے لیےاپنے عظـیم رحـیم و کـریم رب سـے معـافی کـا خواست گار ہوں۔ باقی من آنم کہ من دانم۔

فریدا کالے مینڈے کپڑے کالا مینڈا ویز

گناہاں بھریا میں پھراں لوگی کہندے درویش

ترجمہ: اے فرید! سیاہ میرے کپڑے ہیں اور کالا میرا خرقہ ہے۔ گناہوں کی پیٹی سر پر اُٹھائے پھرتا ہوں ۔ لیکن لوگ پھر بھی مجھے درویش کہتے ہیں۔

تصوف اور جنس

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوہ ء اہلِ نظر گئی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ‘‘مجھے اور لوگوں پر چار چیزوں میں فضیلت عطا کی گئی ہے۔ سخاوت، شجاعت،مردانہ قوت اور مد مقابل پرغلبہ۔’’ (اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ۔ ڈاکٹر عبدالحئ بحوالہ کتاب ‘اسلامی تعلیمات’ ۔ مصنف پروفیسر عبدالحمید تگہ)

صحیح بخاری335 اور صحیح مسلم 1163 میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں پانچ چیزوں کا ذکر ہے جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں چھ باتوں کا ذکر ہے۔ (صحیح مسلم 1167)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے‘‘مجھے تین چیزیں پسند ہیں-1۔ نماز، 2-خوشبو اور3۔ عورت۔ (مجھے دنیا میں عورتوں اور خوشبو کی محبت دی گئی ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ (مسند امام احمد13623، نسائی2391 ، حاکم 2723)

جدید یا آزاد شاعری کے علمبرداروں کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کی شاعری میں جنس کو وہی مقام اور اہمیت حاصل ہے جو روایتی شاعری میں تصوف کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنس جیسے حیوانی اور سفلی جذبے کاتصوف جیسے پاک اور علوی واردات سے کیا تعلق ہے۔

عالم لوگ کہتے ہیں کہ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے بندے کی عقل بھی فزوں تر ہوتی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوانی میں عقلی قویٰ اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ لیکن جنسی جذبے ان سے فائدہ اُٹھانے نہیں دیتے۔ عالمِ پیری میں جب انسانی جنس کمزور پڑ جاتی ہے۔ تب اس کا ذہن بغیر کسی رکاوٹ کے اس عالمِ حیرت میں اس قسم کے مابعد الطبیعاتی مسائل کا فہم و ادراک آسانی کے ساتھ کرنے لگتا ہے۔ ایک بندہ عشقِ مجازی سے تب عشق حقیقی میں قدم رکھتا ہے جب جنسی جذبہ عمر بڑھنے کے باعث کمزور پڑ جاتا ہے اور یا پھر ریاضت اور مجاہدوں کے زور پر اس کا رُخ بدل جاتا ہے۔ صوفیاء لکھتے ہیں کہ اچھا کھانا پینا، دولت اور لباس فاخرہ اور ظاہری حُسن صوفی سالک کی روحانی راہ کی ترقی میں بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اور یہ ایسے محرکات ہیں جو انسانی جنس کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ سہروردیہ کے سوا باقی تین سلاسل کے صوفیاء کا یہ مسلک اور نظریہ ہے اور اہلِ بیت اطہار نے بھی اپنی زندگی اس رنگ میں گذاری کہ کم خوردن، کم گفتن اور کم خفتن ان کا شِعار تھا۔ اور فکر و فاقہ اس راہ میں ان کے سب سے بڑے ہتھیار تھے۔ تب تو اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

جنس تصوفی واردات کا دشمن ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جنس ہمیشہ اُس انسان کی زیادہ ہوتی ہے جو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے قوی ہو۔ برگسان کا ایک قول ہے کہ الہام ذہانت کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ اقبال نے بھی اپنے رنگ میں یہ بات کی ہے۔ ایسے ذہانت اور جنس کا ایسا تعلق بن جاتا ہے جو متوازی رواں ہیں اور اسی طرح تصوف اور جنس کا بھی ایک گہرا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔

بطور ایک طبعی ڈاکٹر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جنسی انگیخت یا اشتعال میں جسمانی سے زیادہ نفسیاتی محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ اور علم تصوف کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے یہ سُنا ہے کہ سالک کے حالات میں ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جب اس پر جنسی جذبہ غالب ہوتا ہے اور یہ جذبہ اس کے روحانی کمالات میں بھی اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ آیا اس قسم کے روحانی جنسی جذبے اور جسمانی جنسی جذبے میں کوئی فرق ہے کہ نہیں ؟۔

عظیم شاعر اور عارف مولانا روم رحمہ اللہ علیہ جنھوں نے عقل کی ہوس پرستی کے خلاف اپنے کلام میں بڑا جہاد کیا ہے۔ ان کا ایک قول اور مسئلک ہے کہ محبت کا سبب جنسیت ہے۔ مولانا اپنے بیٹے کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔ ‘‘میں جنسی مناسبت کی وجہ سے انھیں (شیخ صلاح الدین اور احسام الدین چلپنی رحمہم اللہ) کو اپنے خاص دوست گردانتا ہوں۔ سچی محبت اور مناسبت کا نتیجہ دنیا اور آخرت میں بھی پشیمانی کی صورت میں نہیں نکلتا۔ چنانچہ اھلِ غرض دوستوں کی آخرت میں تمنا

ہوگی کہ ‘‘ یا لَیتنی لمِاتَّخذا فُلانا خلیلاَ ’’ (اے کاش! میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ الفرقان 28) اور محبانِ حقیقی کی صفت یہ ہوگی: ‘‘ الاجلاء یومئیذِ بعضہُم لِبعض عُدواِلا المتقین ’’ (تمام دُنیاوی دوست اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے بجز خدا سے ڈرنے والوں کے ۔ الاعراف 67) اور جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

موجبِ ایمان نہ باشد معجزات

لیک جنسیت بود جلب صفات

اسی طرح ہم سرمد شہید اور ہری چند۔۔ شاہ حسین اور مدھو لال و نظام الدین اولیاء اور خسرو کے عشق ۔ سچی محبت اور جنسی مناسبت کی باتیں سنتے ہیں۔ خسرو کی پیر پرستی تو عقیدت و احترام کے نازک حدود تک بہنچ چکی تھی۔ فرماتے ہی۔ ---- ‘‘من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے ’’ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

‘‘ خلق می گوید خسرو بُت پرستی می کند

آرے آرے می کُنم با خلق ما را کارِ نیست ’’

آج ہم اس مقالے میں جنس اور تصوف کے تعلق، عشق اور ہوس میں فرق اور فنا فی الذات اور فنا فی الشیخ کے احوال و مقامات پر بحث کریں گے۔ اس بحث میں سب سے ضروری وضاحت یہ نکتہ ہے کہ جنس کی موجودہ اصطلاح نئی ہے جو انگریزی لفظ ‘‘سیکس’’ سے لی گئی ہے۔کیونکہ اس زمانے میں لفظ جنس ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔بلکہ یہ نوع جنس یعنی ------ ,kind)

(species, sort, manner, mode وغیرہ کے معنوں میں بولا جاتا تھا۔

دانشور اور عالم اس حقیقت کے قائل ہیں۔ کہ جس شخصیت کی جنس جتنی غالب ہوتی ہےاتنا ہی تصوف میں اس کا مقام بلند ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جنس کا غلبہ عملی انسان کی نشانی ہے۔ لیکن سالک اس جذبے سے تب ہی استفادہ حاصل کرتا ہے جب وہ اسے پابندِ ضابطہ کرلے ۔ گویا یہ ایک سرکش گھوڑے کی سواری ہے جو اگر بے قابو ہو جائے تو اپنے سوار کو اپنی پیٹھ سے نیچے پھینک دیتا ہے اور اگر ضابطے میں رہے تو اپنے سوار کو منزل پر پہنچا دیتا ہے۔

ابتداء میں ہوس اور محبت میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن جب سالک اس راستے پر آگے بڑھتا ہے تو ایک واضح فرق اس معلوم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ محبت روحانی اور پاکیزہ شے ہے اور وہ ہر حُسن سے استفادہ کرنا چاہتا ہے اور اپنی کمی کو پورا کرتا ہے۔ مہبت انسانی عنصر کا جوہر ہے اور ہوس حیوانی عنصر کا۔ کیونکہ انسان تین عناصر سے عبارت ہے:

1۔ حیوانیت   2۔ انسانیت   3۔ ملکیّت

حیوانیت اور ملکیت انسانیت کے محافظ ہیں۔ حیوانیت کے ذریعے مادی کائنات سے اور ملکیت کے ذریعے حق تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر حیوانیت غلبہ پالے تو انسان سر تا پیر حیوان بن جاتا ہے۔ دنیا سے امن رخصت ہوجاتا ہے ۔ چھوٹی مچھلیاں بڑی مچھلیوں کی

خوراک بن جاتی ہیں۔ جو طاقتور ہوتا ہے وہ کمزوروں کا استحصال کرتا ہے۔ اور اگر ملکیت کی خُو لگ جائے تو انسان اللہ تعالیٰ کے عشق کی وجہ سے مجذوب بن جاتا ہے۔ اور مادی دنیا سے تعلق باقی نہیں رہتا۔ اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ نہیں ہے کہ ایک انسان حیوان یا فرشتہ بن جائے ۔ بلکہ منشاء یہ ہے کہ وہ انسان رہے۔ بس جب حیوانیت اور ملکیت انسان کے تابع ہو جائیں تو شخصیت کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ فرائنڈ کی غلطی یہ ہے کہ وہ انسان کی روحانی عنصر کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسان کو ہوبہو ایک جانور سمجھتا ہے اور ہر چیز کو جنس سے جوڑتا ہے۔

امیر حمزہ شنواری قدس سرہ اپنے شیخ سیّد عبدالستار شاہ باچا کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ جو شخصیت جنسی لحاظ سے جتنی قوی ہوگی اتنی ہی اس کی منزل بھی ارفع ہوگی اور ذہنیت بھی فوق الحادہ ہوگی۔ محبت کیا ہے؟ حُسن کا اصول، حُسن کا تماشا۔ جس کے ذریعے انسان اپنے ذاتی فی القوہ حُسن کی تکمیل کرتا ہے۔ حمزہ بابا کا ایک شعر ہے۔ جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ ‘‘ میں عاشق جو بار بار اس ایک واحد حُسن پر عاشق ہوتا ہوں تو یہ در حقیقت اپنے ہی وجود کے بکھرے اجزا کو سمیٹتا ہوں ۔ ’’ حسن فطری مناظر میں ہوتا ہے اور موسیقی میں بھی۔ لیکن حُسن کا اصلی مرکز دنیا میں انسان ہی ہے۔ اور ‘‘ صُورَکمُ فاحسن صُورِکُم (تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ بنایا۔المومن 64) ’’ کی آیتِ مبارکہ قرآن حکیم کی شہادت ہے۔

فکر کے لائق یہ بات ہے کہ فطری مناظر کت تماشے سے جنسن کبھی بھی حرکت میں نہیں آتا اور کیف

اور موسیقی کی شنید کے وقت جس کسی دوشیزہ کا تصور ذہن میں آجائے تو دل جنس کی شدید مخالفت کرتا ہے اور یہی جذبہ روحانی محبت ہے۔ لیکن ہوس؟ وہ تو جانور سے بھی حاصل ہوتا ہے لیکن جانوروں سے کون محبت کرتا ہے؟ کلام پاک نے تو زوجیت کے رشتے کوخدائے عظیم کے وجود کی نشانی بنایا ۔ قرآن پاک میں ربّ العزت فرماتا ہے۔ ‘‘اور اسی کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس کی بیبیاں بنائیں۔ تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی ۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔ (سورۃ الروم 21)

اسلام میں بیوی اور خاوند کی محبت کو خداوند پاک کے وجود کی ایک روشن علامت کہا گیا ہے۔ نکاح کو سُنت اور تجرد کو وبال کا درجہ دیا گیا ہے۔ برخلاف بعض معاشروں کے، جنکے قوانین میں جنسی خواہش رکھنا ہی ایک فحش جذبہ اور جنسی ملاپ چاہے وہ اپنی شرعی اور جائز حدود میں میاں بیوی کے درمیان کیوں نہ ہو، پستی اور تباہی کا سبب گردانا گیا ہے۔

حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ پرانے زمانے میں بھی عام لوگ بھی اس قسم کے توہمات میں گرفتار تھے۔ برٹنڈ رسل نے لکھا ہے۔ ‘‘کافی قدیم زمانوں میں بھی جنسیات مخالف نظریات اور اسباب کا سُراغ ملتا ہے۔ خصوصاً ان علاقوں میں جہاں عیسائیت اور بدھ مت کا راج تھا۔ ایسے ممالک میں اس قسم کے نظریات کو تقویت ملی۔ دُنیا کے روزگار دھندے سے فرار کی وجہ بھی فکر کا ایسا ہی انداز

تھا جو جنسی تعلقات میں بھی کچھ نہ کچھ تباہی اور فحاشی کے عناصر کی موجودگی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ''

وہ علاقے جو عیسائیت اور بدھ مت کے اثرات سے دور واقع تھے۔ وہاں بھی ایسے مذاہب اور روحانی پیشوا موجود تھے جو تجرد کے حمایتی تھے۔ مثلاً یہودیوں میں ''اسنیت'' فرقہ۔ ایسے میں پرانے زمانے میں ریاضت کی ایک عام تحریک شروع ہوئی ۔ یونان اور مہذب روم نے بھی ''اپیکور'' کے طور طریقوں کو خیرباد کہنے کے بعد ''کلبیوں'' کے طریقے اپنائے۔ نئے افلاطونی بھی کلبیوں کی طرح ریاضت پسند نکلے۔

ایران سے یہ نظریہ مشرقی علاقوں میں پہنچا۔ جو مکمل تباہی کا نظریہ تھا۔ اس نظریہ کے مطابق ہر قسم کا جنسی تعلق فحاشی گردانا گیا۔ بعد میں جزوی ترمیم کے ساتھ یہ عقیدہ عیسائی کلیسا کے عقائد میں داخل ہوا۔ ڈر اور نفرت پھیلانے کا یہ نظریہ صدیوں سے انسانی ضمیر پر سوار رہا۔ ادھر نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ جتنا نفسیاتی انتشار اور ذہنی خلفشار جو اس نظریئے کے اثرات سے پیدا ہوا۔ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ عیسائیوں کے اس نظریئے کہ جنسی ملاپ اور تعلق ایک فحش کام ہے، کا ظاہری سبب یہ ہے کہ چونکہ حضرت عسییٰ علیہ السلام نے ساری عمر شادی نہیں کی اس کی وجہ سے اس سُنت کی خلاف ورزی بذاتِ خود فحاشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کے روحانی اور مذہبی پیسوا روحانی مدارج اور مقامات تک رسائی کے لیے ساری عمر عورت سے تعلق سے گریز کی شرط لگاتے ہیں۔

اور ان کے پادری کا انتخاب بھی مجرد افراد میں سے ہوتا ہے۔

کلیسا انسانی نسل کی افزائش کے لیے تو شادی کو جائز قرار دیتا ہے۔ لیکن کلیسا کا یہ نظریہ ضرورت بھی اس فعل کی ذاتی پلیتی کو دھو نہٰ سکتا۔ شادی کے لیے وہ دوسرا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ یہ ایک بڑے بُرے کام کے اثرات کو ایک دوسرے نسبتًا چھوٹے بُرے عمل سے کم کرتا ہے۔ یعنی ایسے مرد اور عورت کے درمیان ظاہری اختلاط کے راستے بند ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نکتۂ نظر سے جنسی تعلق نہ صرف معنویت اور روحانیت کے برخلاف عمل نہیں ہے بلکہ اسے انبیاء کرام کا خلق اور عبادت گردانا جاتا ہے۔ حدیث نبوی ہے: ‘‘من اخلاق الانبیاء حُبُ النساء’’ (عورتوں سے محبت انبیاء کے اخلاق میں سے ہے) ایسے شواہد اور روایات موجود ہیں جن میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اطہار کا عورتوں کے ساتھ محبت اور دلچسپی کا اظہار واضح انداز میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن میں رہبانیت پسند افراد کی مذمت کی گئی ہے۔

عشق اور شہوت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عشق کیفیت اور مقصد کے لحاظ سے بھی حیوانی اور جنسی شہوت سے ایک مختلف جذبہ ہے۔ اس میں بعد میں چند ایسے نفسیاتی مسئلے آگے چل کر آتے ہیں۔ جو مادہ پرستوں کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ لیکن وہ لوگ بھی مانتے ہیں جو نفسیاتی مسائل پر بھی مادی نکتہ نظر سے سوچتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل ایک جگہ یہ تسلیم کرتے ہیں ‘‘عشق جنسی

تعلقات کی خواہش سے ایک بالا شے ہے۔ عشق اپنے لیے مقصد، اصول اور مخصوص اخلاق خود ہی وضع کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک طرف مسیحی تعلیمات اور دوسری طرف آج کے زمانے کے نوجوان نسل کے دل پسند جنسی اخلاق اور اصولوں کے خلاف عناد نے عشق کے مقاصد اور اخلاقیات کو مسخ اور خراب کردیا ہے۔ (اور عناد کی یہ آگ رسل نے خود ہی لگا دی ہے۔)

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ روحانی کیفیت جو جنسی شہوت سے جدا ہے۔ کم از کم کیفیت اور مقصد کے لحاظ سے دو اقسام پر مشتمل ہے اور دو جدا جدا صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کی ایک شکل تو جوش و خروش اور سوز و گداز ہے جو ایک طرف محبوب سے دوری اور غیر معمولی ذہنی ہیجان اور تمام فکری قوتوں کی یک جائی اور دوسری طرف عاشق کی روح پرور عصمت اور طہارت کی حکمرانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں واضح ذہنی انقلاب ظہور پذیر ہوتے ہیں بلکہ ذہانت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے ۔ تاہم اس قسمکی حالت پر پاکرنے کے لیے ہجر و فراق اولین شرط ہے ۔ وصل اس حالت کے لیے مرگ کا درجہ رکھتا ہے یا کم از کم جوش و خروش میں ضرور مانع ہوتا ہے اور وہ انقلابات برپا ہونے نہیں پاتے جو فلاسفروں کے نزدیک متوقع ہوتے ہیں ۔

اس قسم کا عشق داخل یا اندرون میں پیدا ہوتا ہے۔ خارجی رُخ تو اک بہانہ ہوتا ہے۔ جب روح باطن سے نکل

کر اپنے لیے ایک دل پسند معشوق اس کے ذہنی سانچے میں تیار کردہ پیکر سے مناسبت نہیں رکھتا لیکن وہی ‘‘جہاں پسند کہ دل پسند’’ والی بات ہوتی ہے ۔ اہستہ اہستہ وہ اپنی اس ذہنی تصویر کت ساتھ مانوس ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ اور اس کو سچے بیرونی محبوب پر ترجیح دیتا ہے ۔

اس روحانی کیفیت کی دوسری قسم محبت، رقت، پاکیزگی اور خلوص ہے۔ جو خاوند اور بیوی کے درمیان وقت گزرنے کے ساتھ دائمی رفاقت، تکلیف اور راحت کے موواقع پر یک جا رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھشہوت ختم ہوجاتی ہے اور زوجین میں جنسی ملاپ کی قدرت بھی باقی نہیں رہتی۔ یہ شروع سے موجود غیر معمولی اخلاص ان کو آپس مین پیوستہ رکھتا ہے۔

اول قسم کا تعلق هجر اور فعاق کے ساتھ ہے۔ فراق روح کو اور بھی حساس اور شعلہ بار کردیتا ہے ۔ اس کے برعکس وہ عشق جس کو ہم خلوص اور محبت کا نام دیتے ہیں۔ صرف زوجین سے متعلق ہے۔ اور وصل اور قرب سے تکمیل کو پہنطچتا ہے۔ اگر قسم اول حقیقت میں اجنبی روحوں کے عمل پرواز، جذب اور انجزاب کا نام ہے تو قسم دوئم ان دو دوست روحوں کی یکجائی کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ اول قسم کے بارے میں کسی کو شک اور شُبے کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کریم میں زوجیت کے رشتے کو خدائے عظیم و برتر کے وجود کی نشانی کہا گیا ہے۔ مؤنث اور رحمت فطری شہوت اور میلان سے جدا جدا جذبوں کا نام ہے۔

مہر و رقت وصفِ انسانی بود

خشم و شہوت وصفِ حیوانی بود

فنا فی الذات کے بارے مین صوفیاء کا خیال یہ ہے کہ یہ مرحلہ ابتداء میں آتا ہے اور سالک کی مکمل توجہ اپبی طرف ہوتی ہے۔ جس میں نفس کا احتساب، خوف، پریشانی، وسوسے اور ہر قسم کی واردات شامل ہیں۔ پھر آخر میں اس پر اپنے مرشد کے تصور کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اور فنا فی الشیخ کا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اور جتنا ممکن ہو وہ شیخ کے اخلاق حاصل کرلیتا۔ اور اب وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ فنا فی الرسول کے مرحلے کی ابتداء کر لے۔ لیکن فنا فی الشیخ کا مرتبہ بھی معمولی مرتبہ نہیں ہے۔ اسی مرتبے میں سالک ناسوت سے ملکوت تک پہنچ جاتا ہے۔ اور عارف باللہ ہوجاتا ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فنا فی الشیخ کے مرحلے میں عرفان کی راہیں طے کی تھیں۔ اور پھر فنا فی الرسول کے مرتبے میں سالک اس قابل ہوجاتا ہے کہ فنا فی اللہ کی منزل کے لیے تیار ہوجائے۔ آنحضرت ﷺ کی شخصیت مبارک پر زخ کُبریٰ ہے۔ اور اسی برزخ کبریٰ سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ساری معرفت ہر سالک کے اپنے ''عین'' کے مطابق ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر انسان اپنے رب کے ایک اسم سے مربوب ہے) اور اسی اسم کے تحت اس کی شخصیت متعین ہے اور اسی کو ''عین'' کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی ذات کا کوئی بھی احاطہ نہیں کرسکتا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں 'ما عرفناک حق معرفتک'' اور سالک جب فنا فی اللہ ہوجاتا ہے۔ پھر اسی اسم اللہ میں فنا ہوتا ہے۔ جو اس کا ''رب'' ہے۔ اور چونکہ

اسم مسمیٰ سے جدا نہیں ہے۔ اس لیے اسم اور صفت ہی عین ذات ہے۔ تب سالک خیال کرتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات میں فنا ہے۔

میری نوائے شوق سے شورِ حریم ذات میں

غلغلہ ہائے الامان بُتکدہ صفات میں

(نوٹ؛ اس مضمون کے چند خیالات۔ حیاتِ مولانا روم کے اقتباسات۔ امیر حمزہ شنواری چشتی نظامی کے خطوطو اور افکار۔ اور استاد مرتضیٰ مطہری شہید کی لکھی کتاب ‘‘جنسی اخلاق کا اسلام اور مغرب میں تصور’’ ترجمہ سیّد عارف نوشاہی سے ماخوذ ۔ ترجمہ تلخیص ہیں)

قانون کی حکمرانی

فاروق لغاری صاحب۔ دراز قد، متوازن وجود اور گندمی رنگ شخصیت کے مالک ہیں۔ عینک استعمال کرتے ہیں۔ شرافت، نجابت، برداشت اور حیا جیسے اقدار ان کے چہرے سے ہویدا ہیں۔ ان کے ماتھے پر محراب کا نشان بنا ہوا ہے۔ ذاتی زندگی میں ان کے دامن پر کوئی اخلاقی دھبہ موجود نہیں ہے۔ نمازی، روزہ دار اور تہجد گذار شخصیت ہیں۔ جدید اور قدیم علوم کا کافی مطالعہ رکھتے ہیں۔ صاف اور ستھری زندگی گذارنے کی شہرت کے حامل لیڈر ہیں۔

ان کا باتیں کرنے کا لہجہ میٹھا، پیارا، نرم اور متاثرکن ہے۔ لیکن خوبو، نشست و برخاست اور ملنے جُلنے کے سلیقے اور طریقے میں ایک بلوچ سردار کی تمکنت اور شان بے نیازی کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ امیرمحمد خان مرحوم، نواب آف کالاباغ کے علاوہ آفتاب احمد خان شیرپاو کے ساتھ ان کی رشتہ داری ہے۔ ماں ان کی پشتون ہے۔ اس لیے پشتو زبان سمجھتے ہیں اور صاف پشتو بول لیتے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سینیٹر فرید وزیر کی فاتحہ خوانی کے لیے سابق صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری صاحب سراونڈ (ایف۔ آر بنوں) جا رہے تھے۔ راستے میں میرے ہم زُلف طارق ہمایون مرحوم جو لغاری صاحب کی ملت پارٹی کی تاسیس کے وقت سے اُن کے سیاسی رفیق تھے، نے ڈی۔ آئی۔ خان میں اپنے برادرِ خورد ایوب خان جو اُس وقت وہاں انسداد دہشت گردی کی عدالت کے جج تھے۔ (آج کل ماشاء اللہ پشاور ہائی کورٹ کے جج ہیں) کے گھر پر اُن کے لیے رات کی ضیافت کا بندوبست کیا تھا۔اس دعوت میں چند دیگر مہمانان گرامی کے ساتھ میں بھی مدعو تھا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق لغاری صاحب سے درخواست کی کہ وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم مقام کے مالک ہیں اور بنیادی طور پر ایک جاگیردار گھرانے کے سردار ہیں۔ پاکستان کی سول سروس کے

علاوہ کافی اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ حتی کہ آخر میں پاکستان کی صدارت کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہوا۔ ان حالات میں ان کے ہاں پاکستان کے اندرونی اور بیرونی معاملات کے بارے میں کافی معلومات اور راز ہونگے۔ ان کو چاہیے کہ اپنی سوانح عمری لکھیں، جو آنے والی نسل کے لیے راہنمائی اور معلومات کا مستند معاصرانہ اور ماہرانہ خزانہ ثابت ہوگا۔

لغاری صاحب نے بڑے غور سے میری گذارش کو سُنا۔ آرام دہ صوفے میں دراز ہوے اور فرمایا کہ جب میں نے صدارت کی کُرسی کو خیرباد کہا تو آکسفورڈ پریس کا نمائندہ میرے پاس آیا اور مجھ سے یہ بات کی کہ اگر میں نے اپنی سوانح عمری تحریر کی تو وہ اسے بڑے اعزاز کے ساتھ چھاپ دیں گے۔ تو میں نے انہیں بتایا کہ سوانح عمری تو نہیں البتہ پاکستان کے اہم مسائل کے بارے میں ضرور کچھ لکھوں گا۔میرا اشتیاق مزید بڑا اور اُن سے پوچھا کہ اُن کے خیال میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کونسا ہے۔ اُنہوں نے فورا فرمایا " رول آف لاء " یعنی "قانون کی حاکمیت"۔

قانون کی حاکمیت سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟ میں نے پوچھا۔ حقیقت یہی ہے کہ ان کے اس جواب نے مجھے چونکا دیا۔ انہوں نے اپنی بات کی تفصیل سے یوں وضاحت کی۔ "میرے ساتھ دو وزراء اعظم نے کام کیا۔ ایک بے نظیر بھٹو اور دوسرا نواز شریف۔

دونوں کا خاندانی اور تعلیمی پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک کا تعلق ایک بڑے جاگیردار گھرانے سے ہے۔ اور برطانیہ اور امریکہ کی نامور یونیورسٹیوں (آکسفورڈ او ہارورڈ۹ سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے برعکس نواز شریف ایک کارخانے دار خاندان کا فرد ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دونوں کی ذہنیت ایک ہے۔ لغاری صاحب نے پہلی مثال بے نظیر کی دی اور فرمایا کہ پاکستان کے چیف جسٹس نے مجھے لکھا کہ آپ کی وزیراعظم قانون کی خلاف ورزیاں کر رہی ہیں۔ اپ اس پر متعلقہ کاروائی کریں۔ بصورت دیگر ہم خود اس پر براہِ راست (سوموٹو) کاروائی کریں گے۔ چیف جسٹس کے علاوہ اس خط پر سپریم کورٹ کے دیگر جج صاحبان کے دستخط موجود تھے۔ میں نے جوابی رائے (کمنٹس) کی خاطر اسے وزیراعظم صاحبہ کے پاس بھیجا۔ لیکن وزیر اعظم نے اس پر چُپ سادھ لی۔ چند روز کے بعد میں نے وزیر قانون سے کہا کہ وہ اپنی وزیر اعظم سے کہیے کہ میں خط کے جواب کا منتظر ہوں۔ وزیر قانون نے بتایا کہ وہ تو اس قسم کے سوال کرنے کی جراءت بھی نہیں کر سکتا۔ خیر میں نے ان کے لیے معاملہ آسان کر دیا۔ کہ تُم یہ تو کر سکتے ہو کہ میرا یہ پیغام ان تک پہنچا دو کہ صدر صاحب خط کا جواب مانگ رہے ہیں۔ وزیر قانون نے اس قسم کی التماس کرنے ک لیے کمر کس لی۔ خیر چند دنوں کے بعد محترمہ وزیراعظم کا جواب آیا، لکھا تھا؛

“How the Chief Justice of Pakistan has dared to directly approach you? He is subordinate to me.”

ترجمہ؛ پاکستان کے چیف جسٹس نے یہ جراءت کیسے کی ہے کہ آپ کو بلا واسطہ خط لکھے۔ وہ تو میرا ماتحت ہے۔

لغاری صاحب نے مزید کہا کہ ناگہاں ان دنوں ان کے بھائی میر مرتضی بھٹو کو ہلاک کر دیا گیا۔ چند روز کے بعد حزب اختلاف کے ایک وفد نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کی درخواست ہلاکت کے واقعہ اور سانحہ سے کئی روز پہلے مجھے بھیجی گئی تھی۔ ملاقات ہوگئی ۔ چند دنوں کے بعد بے نظیر نے ایک جلسے کو خطاب کرتے وقت قصرِ صدر کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرکے کہا "ظالمو! اتنا تو انتظار کیا ہوتا کہ میرے بھائی کا چالیسواں گزر جاتا۔" لغاری صاحب نے یاد دہانی کرائی کہ یہ بے نظیر کی حکومت کو سبکدوش کرنے سے ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ خیر درمیان میں شیرپاؤ در آیا اور کہا کہ اب بس ہر قسم رنجش ختم۔ ہمیں راضی نامہ اور صلح کرنا چاہیے۔ اور وہ خود بے نظیر کو قصر صدارت ساتھ لے کر آیا۔ اس حال میں اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا اور آواز بھر آئی ہوئی تھی۔ آنکھیں سُرخ تھیں جیسے بہت روئی ہو۔ آتے ہی مجھ سے پوچھا کہ مسٹر پریزیڈینٹ میں نے سُنا ہے کہ آپ میری حکومت کو معزول کر رہے ہیں۔ یہ پہلی بار

ہوا کہ اس نے مجھے مسٹر پریزیڈینٹ کہہ کر پکارا۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ مجھے فاروق بھائی کہہ کر پکارتی تھی۔ خیر میں نے اسے کہا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بے نظیر نے اس پر سکون اور اِطمینان کا سانس لیا اور اللہ پاک کا شُکر ادا کیا۔ اس کے بعد اس نے معمول کے مطابق خندہ روئی اور شگفتہ مزاج میں روزمرہ کی باتیں شروع کردیں۔ میں نے اسے اچھے موڈ میں دیکھا تو خط کے جواب کی بات چھیڑ دی اور اس سے کہا کہ ہوسکتا ہے اُس وقت آپ جذبات کی رو میں بہہ گئی ہوں۔ اب جب آپ ایک بہتر حال میں ہیں میں آپ سے ایک بار پھر چیف جسٹس کے خط کے جواب کے بارے میں پوچھتا ہوں ۔ کیا آپ کی اب بھی وہی رائے ہے؟ بے نظیر پھر اکڑ گئی، سینہ تھان کر کہا کہ میری اب بھی وہی رائے ہے کہ وہ آپ کو براہ راست خط لکھنے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ میرا ماتحت ہے۔

لغاری صاحب بولے کہ میں نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا کہ آپ برطانیہ اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ ہیں ۔ جنکو جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے اور بھر بھی ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں کر رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ لغاری صاحب اپنی بات کو مزید بڑھاتے اور نواز شریف کی حکومت کو برطرف کرنے کا قصہ سناتے میں صبر نہ کرسکا اور درمیان میں کُود پڑا۔ کیوں جناب پاکستان کے معروضی حالات میں اس کی بات صحیح

نہ تھی۔ اور زمینی حقائق ایسے ہی نہیں ہیں؟ مثلا" ایک وقت صوبے کا گورنر اپنے دائیں اور بائیں مونچھوں کو تاؤ دے کر بڑے فخر سے کہتا ہے کہ یہ ضابطہ ہے اور یہ قانون۔ ایسا ہی ایک بار ہمارے ایک متقی صدر نے اس سے بھی بڑا دعوی کیا "آئین چند صفحات کا ایک کتابچہ ہی تو ہے اگر میں اسے پھاڑ دوں تو کونسی قیامت آ جائے گی؟ " پاکستان میں نام کا تو پارلیمانی نظام رائج ہے لیکن اصل طاقت صدر کے ہاتھ میں ہے۔لغاری صاحب بولے کہ یہ مونچھوں کو تاؤ دینا تو بس ایک اخباری لطیفہ ہے اور مجھے بھی خیال آیا کہ یہ گورنر تو لغاری صاحب کے رشتے دار تھے۔میں نے ان کو ایک دوسری مثال پیش کی کہ آپ اس ملک کی ایک اور بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں ایک ایسی شخصیت ایک وقت اس ملک کے سب سے بلند اور مقتدر عہدے پر فائز رہی ہے جس کے وجود کا آدھا حصہ بے حِس او شل تھا۔ لیکن حقیقت سے واقف حکومتی عہدیداروں کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ طاقتور حاکم اعلی تھا۔ جس کے ہاں حاضری کے وقت وزیر اعظم اور کمانڈر ان چیف کے پاوں بھی کانپتے رہتے۔لغاری صاحب نے اپنے ساتھی ککی طرف دیکھا اور فرمایا کہ اس کا اشارہ گورنر جنرل ملک غلام محمد کی طرف ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ لغاری صاحب میں آپ سے ایک سوال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ سے ایک ہزار بار اس گستاخی پر معذرت

کا طلب گار ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آپ ایک بڑے جاگیردار ہیں۔ قوم کے سردار ہیں۔ حکومت اور اقتدار میں اہم عہدوں پر فائز رہےہیں۔ اور یہاں تک کہ ملک کے سب سے بڑے منصب پر متمکن ہوے۔ لیکن آپ ابھی تک میدان سیاست میں سرگرم ہیں۔ آخر کیوں؟ آپ کا سادہ سا جواب یہ ہوگا کہ میں ملک اور قوم کی مزید خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ جواب میں تو کیا قوم کا ایک فرد بھی دل نہیں مانے گا۔ اس کی سچی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ موروثی اور بنیادی طور پر بڑے جاگیردار ہیں۔ سیاست اور اقتدار میں رہنا آپ کی مجبوری اور ضرورت ہے۔ اگر اقتدار اور حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ پٹواری اور تھانیدار آپ کی بات نہ مانے۔ تو یہی مزارعین اُٹھ کھڑے ہونگے اور آپ کی جاگیر پر قابض ہو جاءیں۔ لغاری صاحب مسکراے اور فرمایا کہ ہمارے علاقے میں تھانیدار کو ایسا سلام کیا جاتا ہے۔ اور اپنا دایاں ہاتھ ایک خاص انداز پہ ماتھے پر رکھا۔

(نوٹ؛ تاسفا" ہمارے ملک میں سکہ رائج الوقت قانون کی حکمرانی نہیں بلکہ یہاں پر عام طور پر قدیم قبائیلی رسم و رواج کے مطابق باہمی گفتگو سے "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول کو مدنظر رکھ کر تصفیہ طلب امور کو رفع دفع کرنے کو ترجیحا" قبول کیا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں تو باقاعدہ جرگے منعقد ہوتے ہیں اور اب تو قومی اور سیاسی

سطح پر جرائم کو قانوني تحفظ دے کر عام معافي دینے کا خطرناک رجحان بھی شروع ھوچکا ھے۔)

عزت

اللہ تعالی کے نزدیک عزت دار اور شان والا وہ ہے جو متقی ہو۔ عزت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور ذلت بھی۔ (القرآن)

خالق کے نزدیک تو عزت کا معیار یہ ہے۔ لیکن مخلوق نے آپس میں ایک دوسرے کے لیے عزت کے کچھ اور ہی باطل معیار مقرر کر دیے ہیں۔ آج ہم اس مضمون میں انسان کے ہاتھوں عزت کے اس خود ساختہ تقسیم کا جائزہ لینگے۔

"بات عزت کی ہے" دولت کے پجاری مت بنو۔ عزت کے طلبگار بنو۔ مجھے اپنی عزت عزیز ہے۔ مجھے عزت کی موت چاہیے۔ اپنی عزت کی ناو ڈبونا نہیں چاہتا۔اور ایسی ہی بہت سی باتیں ہم اپنی روزمرہ زندگی میں سُنتے ہیں۔ غیرت، ننگ، ناموس، حمیت اور عزت کم و بیش مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ہر انسان اپنی زندگی میں تین اشیاء پاجانے کی دُعا مانگتا ہے۔ دولت، عزت اور اچھی صحت۔ سُنا ہے ہمارے بزرگ اچھے اخلاق اور نیک اعمال کی دُعائیں مانگتے تھے۔لیکن اب معیار بدل گیا ہے۔اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بار کوئی شخص عزت

کے تخت پر بیٹھ جاتا ہے تو پھر وہ اہل زبان کا کہنا ہے ؛

خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

عزت دار لوگوں میں زمانے کی ٹھوکریں کھانے اور سہنے کے بعد حسد، تعصب، بغض اور کینہ کی طرح رذیل خصائل جنم لے لیتے ہیں۔ اس کے برعکس عزت نصیب افراد کے اخلاق خواہ مخواہ بہتر ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے خصائل بد دولت کے پردوں کے پیچھے چُھپ جاتے ہیں۔ رہ گئے اچھے اعمال تو یہ خوشآمدی، خودغرض یار دوست، ہم نشین اور تالی چٹ ماتحت خود بخود ان سے منسوب کر لیتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں "خزانی" نام کا ایک نابغہ مسخرہ گزرا ہے۔ ایک دفعہ بھری محفل میں کہنے لگا "خدایا ایک بار مجھے مال دولت کثیر عطا فرما۔ چاہے میری سو گز لمبی دُم کیوں نہ ہو۔" ایک بے تکلف دوست نے اس سے پوچھا کہ اس سو گز لمبی دُم کا بار تُم اُٹھاو گے کیسے؟ خزانی مسکرایا کہا: "یہ کونسی مشکل بات ہے تم جیسے بہت سے دلے اسے میرے پیچھے اُٹھائے پھرتے رہیں گے۔"

لیکن انسان میں دولت کی چاہت کیوں کر ہے؟ چونکہ فی زمانہ عزت اسی میں ہے ۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ معاشرے میں اسے کچھ نہ کچھ عزت کا مقام حاصل ہو۔ خلق خدا اس کے سامنے دست بستہ برائے

سلام و تعظیم ایستادہ ہو۔ اور وہ بیٹھے بیٹھے منوں کے حساب سے مزے لوٹے۔ اب کوئی اپنی جان اور جہاں سے روٹھا شخص خود کو اس بات پر تسلی دیگا کہ عزت کے پیچھے دوڑنا اور اس کی شدید چاہت احساسِ کمتری کی نشانی ہے۔ دولت کے ذریعے سے ہم خوش آمد تو خرید سکتے ہیں۔ لیکن دلی محبت کا سودا نہیں کرسکتے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کالج کے پروفیسروں اور خالی جیب دانشوروں کا خود کو تسلی دینے کا ایک پروپیگنڈا ہے۔ عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عزت دار لوگ احساسِ کم تری اور برتری جیسے نفسیاتی مسائل سے مُبرا مخلوق ہے۔ محبت کا سودا اور وہ بھی جانے ۔ کیونکہ آج کل لوگ بڑے بد نیت ہیں اور کسی سے دلی محبت نہیں کرتے۔ خوشآمد تو کم از کم ایک خوشگوار نفسیاتی تاثر تو قائم کرلیتی ہے۔ اور بہت سارے نیک اور اچھے اخلاق کی شہرت رکھنے والے افراد بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ "ہم چوں دیگرے نیست" ۔ یہ بذات خود ایک موثر نفسیاتی علاج ہے جو فقط عزتدار لوگوں کو نصیب ہے۔

عزت کی مسند کے حصول کے لیے علیحدہ علیحدہ راستے ہیں ۔ بعض خوش قسمت پیدائشی عزت دار ہوتے ہیں۔ بعض خاندانی لحاظ سے اس دنیاوی جنت کے وارث ہوتے ہیں۔ بعض افراد کو یہ عزت معاشرہ بخش دیتا ہے۔ قسمت ساتھ دے جاتی ہے۔ ہُما پرندے

کا ان کے سروں پر گزر ہو جاتا ہے۔ اپنے یاروں کے زور پر یا کوشش اور تگ و دو کے بل بوتے معاشرے میں ایک مقام حاصل کر پاتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے سفید چشم بھی یہاں موجود ہیں جو زور زبردستی، حیلہ و فریب اور ظاہری دکھلاوٹ سے خود کو عزت کے غبار سے آلودہ کر دیتے ہیں۔

یہ تو ہوئے عزت کے حصول کے مختلف طریقے۔ البتہ عزت کے اقسام اور بھی ہیں۔ جن کی تقسیم اس طرز پر کی جاسکتی ہے۔

روحانی عزت؛ اس قسم کی عزت نیک اخلاق، اعلی سیرت اور پاک اعمال کی دین ہے۔ اور اس کا راستہ تکلیف، مجاہدوں، ریاضتوں اور نفس امارہ کو مارنے کی کوششوں کے صبر ازما صحرا میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ پیغمبروں، اولیاء اللہ، علماء، صالحین اور انکی صالح اولاد یا ورثاء کی میراث ہے۔ ماں باپ اور استاد کی عزت بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ نفسیات کے ماہرین کی رائے ہے کہ جو کوئی خدائے ذوالجلال کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ اُسے نہیں ملتا ہے۔ دراصل وہ اپنے ماں باپ سے بیزار ہوتا ہے۔ فی زمانہ بین الاقوامی برادری میں پوپ، آغاخان، دلائی لامہ، ہندو پنڈتوں اور ہمارے ارد گرد کے معاشرے میں ایسی عزت سیّد، پیر اور مُلا کو حاصل ہے۔ لوگ ان شخصیات کی عزت و تکریم ایک اندیکھے انجانے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ اصل عزت ہے۔ انسانیت، شرافت اور نیک

اخلاق کی قدردانی ہے۔ لیکن جب اس مطلبی دنیا میں کوئی سخت مرحلہ آتا ہے تو پھر ان روحانی عزدار بزرگوں کو خلق کہتی ہے۔

"صاحب آپ ہمارے ہیرطریقت و شریعت تو ہیں لیکن پیر سیات تو نہیں ہیں۔" کیونکہ اس قسم کی عزت میں دنیاوی مال و ابرو اور منصب کی طمع نہیں کی جاسکتی جب تک ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے اور زور، ظلم، زیادتي اور استحصالي و استبدادي حربوں کا طوفان دلوں سے نیکي او بھلائی کی چنگاری کو ساتھ نہ لے جاے۔یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہر بد شے درست ہو جاے یا بالکل نیست و نابود کردی جاے۔ اس میں تیسرا راستہ نہیں ہے۔ مصلحت دروغ و فریب کی سیاست پر یقین نہیں رکھتے۔ گمنامی کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ چونکہ اسی میں ناموری کے مقابلے میں امن ہے۔ لیکن دنیا کے حریص حکمران ان کی اس گمنامی کی زندگی کی ناموری سے بھی خوفزدہ ہوتے ہیں اور ان کو آرام سے رہنے نہیں دیتے۔

یہاں مجھے امام مظلوم کے فرزند امام زین العابدین (رح) کا واقعہ یاد آتا ہے۔ کہ جب مسرف بن عقبہ نے مدینہ پر حملہ کیا۔ تب امام صاحب کو پناہ دینے والے شخص کو سخت سزا دینے اور انہیں گرفتار کرنے والے کو بڑا انعام دینے کا اعلان کیا۔ امام صاحب (رح) زنجیروں میں جکڑا اور مدینے کے حاکم کی طرف روانہ کیا۔ لیکن راستے میں بار بار ان کے ہاتھ پیر چومتا اور ساتھ ہی روتا بھی۔ مطلب

یہ کہ جس وقت دنیاوی مفاد، خوف، طمع، لالچ اور سر کے سودے کا معاملہ پیش آئے تو عقیدت و احترام جو صرف ایک اخلاقی قیمت اور حجت رکھتے ہیں، کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ افسوس آج کل ہر طرف روحانی زوال طاری ہے۔ "جیسے حکمران ویسے رعایا۔" کچھ تو مرشد بے عمل ہوتا ہے اور صرف "پدرم سلطان بود" پر فخر کرتا ہے اور کچھ اس کے معتقدین عام لوگ روحانی فیوضات سے زیادہ مادی مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش میں مگن رہتے ہیں۔مختصر یہ کہ آج ان عزت دار کُنبوں کا یہ حال ہے؛

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں ہے عقابوں کے نشیمن

اور

بیٹھے ہیں میر خوار کوئی پوشھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

سیاسی عزت؛ اس قسم کی عزت بادشاہوں، امراء، خوانین، نوابین، حکومتی مقتدر افراد اور سیاست کی جدید اصطلاح میں بیوروکریٹس کے حصے میں آتی ہے۔اکثر زور، ظلم، جبر اور زیادتی کی بنا پر قائم ہوتی ہے اور ان جیسے ناپاک حربوں کو جاری رکھنا ہی اس اقتدار کو دوام بخشتا ہے۔ جو اس طبقے کے مفاد میں سمجھا جاتا ہے۔ یہ عزت اگر

چی وقتی ہوتی ہے اور کبھی نہ کبھی اس کا انجام بھی اچھا نہیں ہوتا اور بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ عبرت و نصیحت بن کر سامنے آتا ہے۔ لیکن اپنے عملی دنیا میں اس قسم کی عزت دیگر اقسام کی عزت سے قوی تر اور موثر ہوتہ ہے۔ وَ پشتو کا ایک محاورہ ہے۔ "زور ئ بې پيونده ماتوي" (طاقت جوڑ والی جگہ سے ہٹ کر بھی توڑ دیتا ہے) ۔

کہتے ہیں کہ جس وقت ایرانی بادشاہ نادر شاہ افشار نے تخت دہلی پر قبضہ کیا تو مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کی بیٹی کا نکاح اپنے بہٹے عبدالصمد قلی خان سے کیا۔ دوران نکاح قاضی نے دستور کے مطابق پہلے لڑکی کا نام لیا کہ فلانی بنت شہنشاہ ہند روشن اختر محمد شاہ عالم عالمگیر ثانی اور یوں ظہیرالدین بابر تک ہر ایک مغل بادشاہ کا نام بمعہ القابات و اعزازات لیتا گیا۔ لیکن جب لڑکے کی باری آئی تب باپ تک تو معاملہ صحیح تھا۔ لیکن جب دادا کا ذکر آیا تو قاضی اس لمحہ چُپ ہو گیا اور اس کے پسینے چھٹ گئے۔ دیگر درباری بھی لرزہ بر اندام نظر آے۔ نادر شاہ یک دم اُٹھا۔ شمشیر بدست ہوا۔ اسے لہرا کر بڑے فخر سے گڈریے کے بیٹے نے یہ تاریخی جُملہ تاریخ کے صفحات پر ثبت کیا۔ "شہزادہ قلی خان عبدالصمد ابن فاتح ہند و فارس نادرشاہ افشار ابن شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر"

یہ تلوار کے زور پر تخت نشینی شمشیر ابن شمشیر عطیات اور انعامات کی بارش برسانے کے بعد ہر

انسانی ضمیر کا سودا کر سکتا ہے۔انسانی ضمیر کی خرید و فروخت کس زمانے میں نہیں ہوئی ۔ یہ ایک ایسی بڑی انسانی کمزوری ہے جس سے مغرب اور نہ ہی مشرق کے لوگ مبرا ہیں۔ بڑے بڑے شرفأ اور اعلی نسب شخصیتوں کے مُنّہ اس سے بند ہوجاتے ہیں۔ ہر دور کے بادشاہوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے اس حربے سے کام لیا ہے۔ اور اب تک لے رہے ہیں۔ چانکیہ میکاولی اور نظام الملک طوسی کے پایہ کے مفکرین نے اس قسم کے عزت داروں کے لیے حکمرانی کے اصول تشکیل دیئے اور قوانین کی کتابیں تصنیف اور مرتب کیں۔

اسلامی تاریخ میں ایک فاطمی خلیفہ کا قصہ کافی مشہور ہے۔ جس وقت اس قسمت آزما نے تلوار کے زور پر اقتدار کے تخت پر قبضہ کیا۔ تو سیدھا مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے بیعت لینے کا حکم دیا۔ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ وہ پہلے اپنا حسب نسب بیان کرے۔ خلیفہ کے دائیں ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی اور بائیں ہاتھ میں اشرفیوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا ۔ تلوار کی طرف اشارہ کیا اور بولا "یہ میرا حسب ہے" اور اشرفیوں کا تھیلا عوام کی طرف یہ کہہ کر پھینک دیا کہ "یہ میرا نسب ہے" ۔ ہجوم نعرہ زن ہوا "خلیفہ کا اقبال سدا بُلند ہو۔ آپ ہی ہر ایک سے زیادہ خلافت کے مسند کے مستحق ہیں۔"

تخت اور بخت کا یہ نازک رشتہ ایک باریک تار سے پیوستہ ہے۔ "جب بخت کھو جاتا ہے تو شہزادے

ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ " ایک بادشاہ رات کے وقت رعایا کا حال جاننے کے لیے کوچہ بہ کوچہ پھرتا ہے۔ ایک شب ایک حجرے میں ایک غریب آدمی کی یہ بات سُنی۔ "یار مزے تو بادشاہ نے کر لیے۔ عیش کر رہا ہے۔ اور اسے کوئی غم لاحق نہیں ہے۔" صبح کے وقت بادشاہ نے اس شخص کو دربار میں طلب کیا۔ اور اپنی جگہ تخت پر بٹھایا ۔ خدام کو حکم دیا کہ اس کا ہر حکم مانیں۔ یہ ایک دن کا بادشاہ بڑے رعب سے احکام جاری کر رہا تھا۔ کسی کو جیل سے رہا کروایا۔ تو کسی کو تختہ دار پر چڑھایا۔ کسی کو بخش دیا تو دوسرے کا مال ضبط کردیا۔ غرض بے غم تخت پر بیٹھا تھا۔ کہ اچانک اوپر نظر گئی ۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک تیزدار تلوار ایک باریک تار سے بندھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہی ہے۔ یک دم تخت سے چھلانگ لگائی اور ہمیشہ کے لیے بادشاہت کی خواہش سے توبہ گار ہوا۔

روحانی عزت اس وقت تک کسی مادی قوت کی حامل نہیں ہوتی اور اس سے کسی قسم کی خیر، نیکی اور اچھائی کے انقلاب کی توقع وابستہ نہیں کی جاسکتی۔ جب تک سیاسی عزت یا عصا اس کی مددگار نہ ہو۔ حتی کہ وہ حضرت سیدنا موسی جیسے اولوالعزم اور متعدد معجزات رکھنے والا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم

لیکن اس طبقے کو عباسی دور کے ایک عظیم سیاسی مدبر یحیی' برآمکی کا یہ قول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ " جو لوگ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ ہمارے لیے قابل اقتداء ہیں ۔ اور جو ہستیاں ہمارے بعد آنے والی ہیں ان کے لیے ہم درس عبرت ہیں۔ "

عزتِ فن :

لقمان حکیم کا قول ہے۔ "کسب نہ کرنا محتاجی کا سبب بنتا ہے۔ اور محتاجی دین کو تنگ عقل کو ضعیف اور مرّوت کو زائل کر دیتا ہے۔" اسی طرح ایک فارسی شاعر فرماتا ہے ۔

آں کہ شیراں را کُند روباہ مزاج

احتیاج و احتیاج و احتیاج

(وہ چیز جو شیروں کو لومڑ بنا لیتی ہے۔ وہ ہے محتاجی اور صرف محتاجی)

کُچھ اسی سے ملتے جُلتے مفہوم کا ایک پشتو کا ضرب المثل بھی ہے۔ "جو انسان اپنے کسب (پیشے) کی محنت کی کمائی نہیں کھاتا۔ وَ اگر چہ ولی ہی کیوں نہ ہو اسے بہتر روزی نصیب نہ ہوگی ۔ "

اس قسم کی عزت مزدوروں، کاریگروں اور ہر قسم کے پیشے سے وابستہ فنی ماہرین اور متعلقہ افراد کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک معاشرے کے قیام

و استحکام کے لیے بڑے اہم ستون ہوتے ہیں۔ معاشرے کی فارغ البالی اور ترقی کے لیے ان کا وجود بہت ضروری ہوتا ہے۔ ان کی محنت او مشقت کی بدولت معاشرہ خوشحالی اور ترقی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اگرچہ ہمارے معاشرے میں ان کاریگر افراد کو پست، تذلیل اور کمینہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن آج کل تو تکنیکی اور فنی دور ہے۔ صرف اس انسان کو آج کے معاشرے میں عزت اور وقار کا مقام حاصل ہوگا جو کسی نہ کسی کسب، ہُنر یا فن کا مالک ہو۔ اس طرح اس طبقے کا مستقبل بڑا روشن اور تابناک ہے۔

جیسے پہلے ہی اس کا ذکر ہوا ہے کہ پہلے زمانے میں اس طبقے کو ارفع نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اگرچہ ہر نبی کوئی نہ کوئی کسب یا روزگار فرماتے تھے۔ اسلام نے اس طبقے کو معاشرے میں ایک بلند مقام دلانے کے لیے ایک انقلابی پیغام دیا ہے۔ حضور نبی رحمت عالم کا ارشاد مبارک ہے۔ "ایک انسان بھی اپنے ہاتھوں اور بازووں کے زور پر کمائی رزق سے بہتر رزق نہیں کھاتا۔ ایسے ہی دیگر مقتدر طبقات کو اس ٹولے کے حقوق پورے کرنے کی تاکید کی ہے۔ "مزدور کا پسینہ خُشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری اسے دو۔" مختصر یہ کہ کوئی پیشہ بھی انسان کو ذلیل نہیں کرتا بلکہ انسان کے اپنے ہاتھ سے اس کا پیشہ ذلیل ہوتا ہے۔

زر خرید عزت؛

اس گروہ کی اگرچہ اپنی کوئی سیاسی پوزیشن نہیں ہوتی لیکن جب کبھی بنیئے کی طرح جائز ناجائز طریقے سے دولت کما لیتے ہیں۔ تو پھر مراعات یافتہ طبقے کی مدد سے معاشرے میں اپنے لیے ایک مقام اور اہمیت حاصل کرلیتے ہیں۔ مراعات یافتہ طبقے کے لنگر اور باورچی خانے کا کاروبار اور دیگر آسانیاں اور عیاشیاں ان ہی کے پیسوں کے بل بوتے پر چلتی ہیں۔ دولت کے زور پر خرید کردہ ان عزداروں میں تاجر، دکاندار اور کارخانہ دار آتے ہیں۔ آج کل یہی گروہ افراطِ زر کی لعنتوں کا بوجھ بڑی آسانی اور خوشی سے اُٹھا سکتے ہیں۔ اور شاید ہمارے معاشرے میں عام مساوات اور اقتصادی ناہمواری کا ذمہ دار بھی یہی طبقہ ہے۔ ان کے لیے بد نیت عزت خوار حلقوں میں ایک نئی معاشی اصطلاح اقتصادی شعبدہ باز (اکنامک وزرڈ) رائج ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس طبقے میں مخئیر اور انسان دوست افراد بھی ملتے ہیں۔ جو ہسپتال، خیراتی ادارےمساجد، تعلیمی ادارےتفریح گاہیں اور ایسے دیگر بھلائی اور بھبود کے کام کسی دنیاوی غرض کی خاطر اور بعض صورتوں میں بے غرض ثواب کمانے کی نیت سےتعمیر کرتے ہیں۔تب اس قسم کے فیض کے اسباب مہیا کرنے کے لیے بعد دین اور دنیا کی عزت کما لیتے ہیں۔ بعد میں ان کی اولاد کو اس صدقہ جاریہ سے وافر حصّہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آج کل ہمارے معاشرے میں ایک چوتھا طبقہ بھی پیدا ہوا ہے جو قطر، ابو ظہبی، دوبئ، کویت،

سعودی عرب اور اس طرح مشرق وسطی کے دیگر ممالکسے دولت اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اور اس بیرونی دولت کے زور پر اپنے ملک میں ارفع و اعلی عمارتیں، پلازے، جائدادیں اور دیگر عیش و عشرت کے سامان بناتے ہیں۔ اس طبقے نے ملک کی اقتصادی، مالی، معاشی اور معاشرتی حالت عظیم انقلابی تبدیلی برپا کی ہے۔ شرافت اور عزت کے اقدار بدلنے میں بھی انا افراد کا بڑا ہاتھ ہے۔اور آج ساری قوم کا کا زیادہ تر حصّہ ایک بیماری میں گرفتار ہے۔ جسے ایک پاکستانی ماہر نفسیات نے " دُبئ سینڈ روم" کا نام دیا ہے۔ فی زمانہ اس گروہ کا رجحان امریکہ، برطانیہ سکینڈے نیوین ممالک کے ساتھ ساتھ اسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا جیسے دیسوں کی جانب ہو گیا ہے۔

عزت کی جو تقسیم اوپر بیان کی گئی ہے وہ کوئی مستقل واضح اور صاف تفریق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ایک آدھ خوش قسمت کو جس کا اللہ تبارک و تعالی کو زیادہ امتحان لینا مقصود ہو یہ چاروں مراتب حاصل ہوں۔ایسے ہی کسی کو ایک ، کسی کو دو اور کسی کو تین ۔ لیکن انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اس کا صبر محض ایک قسم کی عزت پر نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے ہر قسم کی عزت حاصل ہو۔ وَ کسی در کا محتاج نہ ہو بلکہ ہر انسان کا دست سوال اس کے سامنے دراز ہو۔ لیکن خدا عظیم و برتر سے یہ دُعا مانگنی چاہیے کہ "اے بے نیاز

بادشاہ اپنے در کے سوا کسی اور کے دروازے کی چوکھٹ پر میرا سر نہ جُھکے۔" یا بقول شاعر؛

تیرا در ہو میرا سر ہو میرا دل ہو تیرا گھر ہو

تمنا مختصر سی مگر تمہید طولانی

ہر انسان کا کام میرے ساتھ پیش تو ہو لیکن میری غرض یہ نہ ہو کہ میں کسی پر ظلم اور زیادتی کروں یا کسی کا حق غصب کروں۔ بلکہ اس لیے کہ شرپسند لوگوں کے شر اور فساد سے مامون رہوں اور وہ عزت مجھے نصیب نہ کر جس کی مذمت آپ کے حبیب (ص) نے ان الفاظ میں کی ہے۔ " مخلوق میں سب سے بڑا شخص وہ ہے جس کی تعظیم اس کے شر کے ڈر کی وجہ سے کی جاۓ۔"

پشتو کے مشہور صوفی شاعر ڑحمان بابا کا کہنا ہے؛

یو یو داغ پهٔ تتر ابنے د هر چا دے

که بادشاه د ولایت دے که ګدا دے

سیرابي پهٔ سرچشمه د دُنیا نیشته

تشنه لب ئ ګوشي ګوشي پهٔ غوغا دے

چې مولا ورسره مل نهٔ وي رحمانه!

که لښکرې   ورسره وي يک تنها دے

(ترجمہ: ہر کسی نے اپنے سینے پر ایک نہ ایک داغ چھوڑ رکھا ہے۔ وَ چاہے کسی مملکت کا بادشاہ ہے یا گدا ہے۔ دنیا کے چشمہ پر سیرابی ممکن نہیں ہے اور ہر تشنہ لب علیحدہ علیحدہ شور و غوغا میں مصروف ہیں۔ اگر مولا کریم کی مدد ساتھ نہ ہوچاہے آپ کے ساتھ افواج کے لشکر موجود ہوں تب بھی آپ تنہا ہیں۔)

پشاور یونیورسٹی میں رشد و ھدایت کے تین مراکز

دیدہ دلِ بینا (تعارف کتاب)

(سیّد الطاف حسین شاہ)

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں

یہ عاشق کون سی بستی کے یا رب رہنے والے ہیں؟

اب تو پشاور یونیورسٹی کیمپس پر مختلف علوم کی تیاری کے لیے کئی ادارے اور دارالعلوم معرض وجود میں آچکے ہیں۔ لیکن 1952ء میں یونیورسٹی کے قیام سے دو ڈھائی عشروں تک ان سب شعبوں یعنی انجنئیرنگ، میڈیکل، زراعت، آرٹس، اسلامیات اور سائنسی علوم کی ترویج اسی ایک مادر علمی کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہی تھیں ۔ طلباء

اوو طالبات کی راہنمائی کے لیے بہترین اور منتخب کردہ اساتذہ پر مشتمل فیکلٹی موجود تھی۔ یونیورسٹی ہر سال مختلف شعبہ علم کی اسناد تقسیم کر رہی تھی اور سند یافتہ طلباء اور طالبات ملک و ملت کی خدمت میں مصروف ہوجاتے یا مزید تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک چلے جاتے ۔ ان ہی لائق و فائق ماہرین فن اساتذہ میں سے کچھ حضرات تصوف کی دُنیا سے بھی وابستہ تھےاور تن کی دنیا کے ساتھ ساتھ من کی دُنیا کو بھی سنوارے تھے۔ ان کی نظر میں تو یہ حقیقت واضح تھی کہ :

خرد واقف نہیں ہے خیر و بد سے بڑھی جاتی ہے ظلم اپنی حد سے (اقبال)

ڈاکٹر چراغ حسین شاہ صاحب ان دنوں خیبر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے مگر اپنی پیدائشی جوشِ جنون کے ہاتھوں مجبور ماہرین علم و دانش کے ہر چوکھٹ پر دستک دینے کا شوق پالے ہوئے تھے۔ انھوں نے خدمت خلق کی ان تربیت گاہوں کا اپنی تحریر میں ایک عمومی نقشہ پیش کیا ہے۔ جن سے ہزاروں خلقت نے استفادہ کیا۔ اور اپنے تن اور من کی دنیا کو سکون کی لذت سے اشنا کیا۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟۔ اس کے لیے صوفیاء کے انداز تربیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک جھلک ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر میں صاف نظر آتی ہے۔

انسان اور طلب علم : باب العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا جاتا ہے کہ ‘‘انسان کا عز و شرف علم سے وابسطہ ہے۔ اصحاب علم ہی روشنی کے وہ چراغ ہیں جو راہِ حق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ علم ہی

انسان کو وہ مواقع فراہم کرتا ہے جو اسے لافانی اور لازوال بنا دیتا ہے۔ انسان نے تو بہرحال موت سے ہم آغوش ہونا ہی ہے لیکن اس کی حکمت و دانش امر ہوجاتی ہے۔ اور رہتی دنیا تک باقی رہ جاتی ہے۔ ”

کچھ اسی انداز میں حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) سے منقول ہے کہ “اشجار کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان سب پر پھل نہیں آتے۔ پھلوں کی بھی کئی اقسام ہیں لیکن سب ہی پھل کھائے نہیں جاتے ۔ اسی طرح علم کی بھی بسیار قسمیں ہیں لیکن پھر یہ سب علوم انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ ” (ادریس شاہ کی کتاب“د ویز آف صوفی” سے ماخوذ)

تصوف اور دانشِ مغرب : ڈوربس لیزنگ اپنی تحریر“اے کی بک” میں لکھتے ہیں کہ “تصوف دین اسلام کا ایک ایسا پُر اسرار پہلو ہے، جس نے ایک توانا اور دائمی اثر اس کی تعلیمات کو بخشا ہے۔ جو اپنے اندر ایک لطیف مگر نکتہ رس انداز رکھتا ہے اور انسانی ذہن کو تکمیل کی راہ دکھاتا ہے۔ کچھ دیگر عقائد اور فلسفہ ہائے حیات کے مقابلے میں تصوف مستقلاً ارتقائی عمل سے دوچار ہے اور یوں ہر دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہتا ہے۔ ” بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ایسے (صوفی) دوستوں کی محفل میں چند لمحوں کی رفاقت سینکڑوں سالوں کی مخلص اور بے ریا عبادت سے بہتر ہے، تو بے جواز نہیں ہوگا۔

تصوف کی جو بھی تشریح کی جاۓ یہ بات تو واضح ہے کہ دینِ محمدی ﷺ کے بے بہا پھیلاؤ میں صوفیاء کرام کے رول کو قطعًا نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، دینِ حق کا جھنڈا گاڑنے کے لیے اولین دستہ ان بے تیغ اور تہی دست بزرگوں نے فراہم کیا۔ اس حقیقت کو اُجاگر کرنے کے لیے ہمارے اپنے ہی برصغیر میں آنے والے اولین داعیان حق حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ، حضرت سخی شہباز قلندرؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت گنج بخش ہجویریؒ، حضرت بھاؤالدین ذکریاؒ، حضرت سید علی ترمذیؒ(پیربابا) ۔ حضرت پیر سباکؒ، حضرت کاکا صاحبؒ، حضرت خواجہ عبداللہ باباؒ اور دیگر اوللعزم اصحاب جو اس دور میں تشریف لائے جب کُفر و الحاد کے اندھیروں میں کہیں بھی روشنی کا چراغ جلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر کچھ دنوں میں ان کی سیرت و کردار کا ڈھنکا یوں بجا کہ ہزاروں لاکھوں گُم کردہ راہ بندہ گانِ خدا دیوانہ وار ان ک استانوں کے گرد پروانوں کی مانند گھومنے لگے اور گرد و نواح کے بر خود غلط مالدار، طاقتور اور خودسر راجے مہاراجے حیرت زدہ رہ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ ان صوفی منش اساتذہ کرام کا بھی حال کچھ ایسا ہی تھا اور ہم نے تو ان حضرات با صفا کا جادو بچشم خود دیکھا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ان کی مقبولیت کا راز ان کے ذکر نیم شبی، مراقبوں اور لذت تقریر میں پنہاں نہیں پایا۔ بلکہ ان تینوں میں نقدر مشترک ان کا خلوص، مہمان نوازی، بندہ پروری اور حق

گوئی کی ابدی صفت کو دیکھا اور اب تو بقول ڈاکٹر علامہ محمد اقبال یہ دُعا مانگنے کو دل چاہتا ہے۔

عطا اسلاف کا جذبہ دروں کر ۔

شریکِ زمرہء لا یحزنون کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں

میرے مولا مجھے صاحبِ جنون کر

(اقبال)

الطاف حسین شاہ اسلام اباد

رشد و ھدایت کے تین مراکز

ہر کسی از ظنِ خود شُد یارِ من

ما درونِ من نہ جُست اسرارِ من

(ترجمہ ۔ ہر کوئی میرا شناسا بن گیا پر نہ سمجھا میں میرے اسرار کیا)

1960ء سے 1970 ء کی دہائی میں پشاور یونیورسٹی کے کیمپس طلباء او اساتذہ کی روحانی فیض و تربیت کے لیے مندرجہ ذیل تین مراکز قائم تھے۔

۱۔ لالا عبدالرحیم نیازی کا مکتب فکر و نظر

۲۔ عبداللہ دُرانی صاحب کا مطب اور درگاہ

۳۔ مولانا محمد اشرف سلیمانی کا تبلیغی مشن

سابقہ وائس چانسلر چودھری محمد علی صاحب کو ایک مجلس مذاکرہ میں ایک بار اس حقیقت کا فخریہ اعتراف کرنا پڑا کہ پشاور یونیورسٹی میں مذہبی اور روحانی ماحول چھا رہا ہے۔ جبکہ اس سے قبل یہ کہاوت مشہور تھی کہ اسلامیہ کالج شرابی کبابی کالج ہے جبکہ ایڈورڈز کالج گڈ مڈ کالج ہے۔ اسلامیہ کالج میں طلباء کا یونیفارم کالی شیروانی تھی۔ اس لیے انھیں کالے کوے کہا جاتا تھا جبکہ ایڈورڈز کالج والے سبز بلیزر پہننے کی وجہ سے سبز طوطے کہلاتے تھے۔ اس وقت سرزمین پشاور میں یہی دو کالج مشہور تھے۔ ان کالے کوؤں او سبز طوطوں کے جُھنڈ آخر پشاور یونیورسٹی میں آ ملتے تھے۔

ان طلباء کی دینی معلومات کا یہ حال ہوتا تھا کہ بقول اسلامیہ کالج کے شعبہ اسلامیات کے صدرنشین محترم قاضی نورالحق ندوی المعروف ڈین صاحب کے، چارسدہ کے ایک طالب علم نے اپنے پرچہ اسلامیات (اختیاری) میں اس سوال کہ ‘‘اسلام کے پانچ بنیادی ارکان دین کون کونسے ہیں؟ ’’کے جواب میں لکھا تھا۔ ۱۔ سر سید احمدخان ۲۔ مولانا محمد علی جوہر ۳۔ علامہ اقبال ۴۔ قائد اعظم محمد علی جناح ۵۔ لیاقت علی خان۔ اسی طرح اسلامیہ کالج کی تاریخی مسجد جس کی بنیاد مجاہد ملت حاجی صاحب ترنگزئ (رح) نے رکھی تھی۔ وہاں ڈین صاحب ڈیکٹیٹر بن کر کسی اور واعظ یا مصلح کو اپنا

پروگرام اس منبر سے پیش نہ کرنے دیتے۔ صرف جمعہ کے روز نماز سے قبل خود ایک خطبہ ضرور ارشاد فرماتے۔ جس میں دینی، مذہبی اور روحانی مسائل پیش کرنے سے زیادہ لطیفے اور چٹکلے اور طنزیہ بول ہوتے۔ البتہ حضور ﷺ او اسلام کا معاشرتی نظام زندگی وہ بڑے مؤثر اور جذباتی انداز میں پیش کرتے تھے۔لیکن ان کے اس والہانہ انداز بیان پر بھی شعبہ تاریخ کے ڈاکٹر منور خان کو بہرحال یہ اعتراض تھا کہ ‘‘ڈین صاحب اپنے بیان میں حضور ﷺ کا اسم گرامی یوں لیتے ہیں، جیسے آپ ﷺ ان کے ہم جماعت رہے ہوں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر یوں فرماتے جیسے یہ مقدس ہستیاں بچپن میں ان کے ساتھ گلی میں کھیل چُکی ہوں۔ (نغوذ باللہ خاکم بدہن) اصل حقیقت یہ تھی کہ ڈین صاحب کی عادت تھی کہ وہ اپنے وعظ میں پہلے اپنا رواں فقرہ مکمل کرنے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجتے۔ مثلاً وہ کسی بھی روایت کا آغاز یوں کرتے۔ محمد (ﷺ) ایک بار اپنے دو یاروں ابوبکر (رض) اور عمر (رض) کے ساتھ کہیں جارہے تھے۔ بعد از فقرہ کچھ وقفے کے بعد کہتے ‘‘ ﷺ ’’ ڈاکٹر منور خان ایسے بے باکانہ بیانات پر سخت معترض تھے اور ان کو شان نبی ﷺ اور اصحاب رسول (رض) کی شان میں گستاخی اور بے ادبی پر معمول سمجھتے۔ میری اس لمبی تمہید کا مطلب صرف یہ بتلانا ہے کہ ان سالوں میں کالج اور یونیورسٹ کی علمی اومذہبی فضا پر نسبتا" دینی کم علمی اور روحانی افلاس کی ایک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وائس چانسلر چودھری محمد علی صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے جہاں علمی

شعبوں کو ایک نئی جہد ملی، وہاں ذکر و ھدایت کے تین ذکر کردہ فانوس روشن ہوگئے ۔ اور طلباء اور اساتذہ کی ایک نیک و صالح پابند شریعت نسل وجود میں آتی گئی۔ ہم اس مضمون میں ان مختلف النوع افکار بزرگ شخصیات کی تعلیمات، تصانیف اور طریقہ ہائے دعوت و تبلیغ ، تربیتِ ذکر و فکر اور حاصل نتائج پر مختصرا" روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ خاموش مبلغ

’’ لالا عبدالرحیم نیازی قدسرہ ‘‘

ہر کی چشمی شریں باشد

مردم و مرغ و مور گرد آیند

ترجمہ ۔ (جہاں بھی میٹھا چشمہ ہوگا۔ انسان، پرندے اور چیونٹیاں اس پر جمع ہونگی ۔)

اعزازی پروفیسر لالا عبدالرحیم ایسی ہی ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے جنھوں نے بغیر کسی لالچ، طمع یا دنیاوی غرض کے مخلوق خدا کی روحانی راہنمائی کے لیے پشاور یونیورسٹی کے علمی لیکن رنگین ماحول میں علم و معرفت کا ایک دبستان قائم کردیا تھا۔ اور یہی ان کے قابل فخر شاگرد چودھری محمد علی وائس چانسلر کی شدید خواہش تھی ۔ جو 1913ء میں اسلامیہ کالج کے قیام کے وقت لالا صاحب کے اولین شاگردوں میں سے تھے۔

چودھری صاحب نے انھیں پشاور یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر بننے پر راضی کرکے کیمپس پر مستقلاً آباد کرنے کا انتظام کیا۔ اور پھر وہ کئی سال تک نئی نسل کی روحانی تربیت فرماتے رہے۔

سب کا میکدہ ؛

ایک ایسا میکدہ جہاں پر رند کو بقدرظرف اذنِ جام تھا۔ زاہد، عابد، گنہگار، پارسا، عالم و جاہل، استاد، طالب علم ، امیر اور فقیر ہر کسی کو اپنی صلاحیت اور فطری استعداد کے مطابق حصّہ پہنچتا۔ ایک عجیب سی محفل گرم ہوتی ۔ ایک جانب تذبذب میں مبتلاء فلاسفر تشریف فرما ہوتے تو دوسری طرف اپنی بھاری بھرکم کمبلوں میں لپٹے مال و دولت کے نشے میں مست دنیادار صوفوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہوتے۔ غمِ دنیا سے بے نیاز نوجوان طالب علموں نے ایک الگ لا اُبالی دنیا بسائی ہوتی۔ لحظہ بعد ایک دروازے سے ایک بوسیدہ پھٹی خرقہ میں ملبوس ملنگ ''اللہ ھُو'' کے نعرے مارتا ہوا اندر شریک محفل ہوجاتا۔ متنوع عجیب و غریب موضوعات پر زور و شور سے بحث لگی رہتی۔ درمیان میں ایک صوفے پر براجماں ایک نورانی بشر ہوتا۔ جو بظاہر اس ساری مغز خوری کی فضا سے لاتعلق آنکھیں بند کیے نظر آتے۔ یہ بزرگ شخصیت بڑے مزے سے گاہے بگاہے حُقے کے کش لیتے اور تب دھوئیں کے مرغولے بلند ہوتے دکھائی دیتے۔ونسٹن چرچل کا پائپ، گاندھی جی کی بکری اور لالا صاحب کا حُقہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم تھے۔ چہرے پر ایک

سفید خشخشی ریش سجائے ہوتے جیسے مرزا اسداللہ غالب کی آخری عمر کی تصویر ہو۔

لالا عبدالرحیم ایک خاموش مبلغ اور بڑے مہمان نواز مُرشد تھے۔ ذکر قلبی و مخفی میں مصروف رہتے۔ عیشاء سے پہلے محفل برخاست ہوجاتی اور حضرت کسی فارسی یا انگریزی شاعر کی صوفیانہ رُباعی یا ‘‘سٹینزہ’’ دہراتے ہوئے اپنے خلوت خانے میں ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کے مشغلے کے بعد کچھ ساعت استراحت فرماتے۔جب کوئی مسئلہ منطقی دلائل، جذباتی باتوں اور فلسفیانہ استدلالوں اور تاریخی مثالوں سے حل نہ ہونے پاتا۔ ہر ذہن تھک جاتا اور ہرعقل حیران ہوجاتی تو درمیان میں تشریف فرما خاموش مبلغ اپنی آنکھیں وا کردیتے اور آہستہ سے تاثیر بھری مدہم سی بات کہہ جاتے۔ کوئی تو اس اشارے کو سمجھ لیتا اور کئی دیگر ایسے سر ہلا دیتے ۔ بات کیا ہوتی ایک الہامی آواز ہوتی۔ حال و قال سے نکلا ہوا ایک راز، ہر ذہن کی تسلی ہوجاتی۔ ہر بے قرار آسودگی پاجاتا۔ کسی اور کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہ پاتی۔ ہر بندہ اپنی جگہ پر مطمئن اور حقیقت آشنا ہوجاتا۔ یہ تھا لالا صاحب کا ناقصوں اور علم کی تشنگی بجھانے والوں کو فیض پہنچانے کا منفرد اور نادر طریقہ۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب حاضرین مجلس زمان و مکان کے فلسفے پر بحث میں مصروف تھے۔ پروفیسر معراج مصطفٰی برگسان، ڈیکارٹ اور آن سٹائن کے حوالے پر حوالہ دے رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ لیکچر دیتے رہے۔

لیکن حاضرین محفل کے شکوک و شبہات مزید بڑھ رہے تھے۔ مقرر سے فلسفے کے پُر پیچ گلیوں میں حقیقت کی منزل گُم ہو چکی تھی۔ ان کے پاس ‘‘حکمت یونانیان’’ اور ‘‘حکمت فرانگیاں’’ کا کافی ذخیرہ موجود تھا لیکن یہ ایسا مسئلہ نہ تھا کہ بغیر ‘‘حکمت ایمانیاں’’ کی مدد کے حل ہوجاتا۔ لا لا صاحب جو اس ساری بحث کے دوران خاموش' آنکھیں بند ' حالت استغراق میں ذکر قلبی و مخفی میں مصروف تھے۔ اچانک انھوں نے ایک مخصوص انداز میں آنکھیں وا کیں۔ جواب مختصر تھا لیکن کئی معنی اور مطالب سے بھر پور۔ فرمایا۔ ‘‘تمہارا اس فقیر کے متعلق کیا خیال ہے جو کہتا ہے کہ زمان و مکان دونوں میری جیب میں پڑے ہیں۔ ’’

ایک روز ایک نوجوان نے ان سے پوچھا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ عمر بڑھنے سے انسان کی ذہنی قوت ترقی کرتی جاتی ہے اور عقل بڑھ جاتی ہے؟۔ لالا صاحب بولے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ بڑھاپے میں انسان کی ذہنی استعداد' عقل اور دماغی قوت مضمحل ہوجاتی ہےجوانی میں انسان کی ذہنی قوت بامِ عروج پر ہوتی ہے۔ لیکن جنسی جبلت اس کو کام نہیں کرنے دیتی۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ جب دیگر جسمانی قوتوں کے ہمراہ جنسی قوت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ تب یہ فرد بغیر کسی رکاوٹ کے اس عالمِ حیرت میں صحیح او گہری سوچ کرنا شروع کردیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھیں شاید اپنی جوانی کا زمانہ یاد آگیا ۔ تو اردو کا یہ گیت اپنے ساتھ آہستہ آہستہ گنگنانے لگے ۔

‘‘ اسیر پنجہ عہدِ شباب کرکے مجھے

کہاں گیا میرا بچپنا خراب کرکے مجھے ’’

اگرچہ وہ فطرتا" خاموش طبع اور سنجیدہ شخصیت تھے۔ بہت کم بولتے اور وہ بھی چند ایک ذومعنی اور مختصر فقرے۔ اس کے باوجود موقع کی مناسبت سے ایک آدھ قصہ گذری جوانی کے دنوں کا بھی نوجوان حاضرین کی خوش طبعی اور دلچسپی کے لیے سُنا جاتے۔ شہر دہلی اور اس کے چاندنی چوک کا ذکر ہو رہا تھا۔ لالا صاحب نے فرمایا کہ اس چوک میں ایک روز ایک سبزی فروش تازہ تازہ نرم نرم اور پتلی پتلی بھنڈیاں ایک ریڑھی پر بیچ رہا تھا۔ ساتھ ہی تشبیہات اور استعاروں سے مرصع اردوئے معلیٰ کی نزاکت اور نفاست کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ادیبانہ صدا گاہکوں کو دعوت نظارہ و خریدِ سودا دے رہا تھا۔ ‘‘ لیلیٰ کی اُنگلیاں ہیں ۔ محبتوں کی بھنڈیاں ہیں "۔

علامہ اقبال نے اعلی حضرت نادرشاہ کی دعوت پر کابل جاتے وقت پشاور کے ڈاک بنگلے میں ایک رات قیام کیا تھا۔ لالا صاحب فرماتے تھے کہ وہ بھی اپنے چند پروفیسر ساتھیوں کے ہمراہ ان سے ملنے گئے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ مرحوم کی شخصیت اور فلسفے سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے ۔ البتہ ٹیگور کی شخصیت اور فن کی مدح وہ اکثر بیان کرتے تھے۔ اس طرح گاندھی جی کے بارے میں وہ ایک خواب بیان کرتے (اپنا یا پرایا؟) کہ گاندھی جی دین اسلام کے کافی مداح تھے۔ لیکن جب

مہاتما جی سے اسلام قبول کرنے کی بات ہوئی تو ان کا جواب تھا۔ ‘‘بڑا کھون (خون) ہو جائے گا۔ ’’

اویسی طریق اور خلقِ خدا سے محبت :

لا لا صاحب نے شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) سے اویسی طریقے پر فیض پایا تھا۔ وہ اکثر اس کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ البتہ کسی زندہ شخصیت سے ان کے فیض لینے کا قصہ میں نے نہیں سُنا۔ لالا صاحب عالم باعمل تھے۔ عارف بے بدل تھے۔ زاہد شب زندہ دار تھے۔ فاضل اجل تھے۔ استاد کامل تھے۔ محرمِ اسرار و رموز ربانی تھے۔ لیکن مجھ جیسے بے بصیرت انسان کے لیے ان کی مندرجہ ذیل خوبیاں باعث کشش تھیں۔

وہ اپنی ذات میں سراپہ مہر، محبت اور شفقت تھے۔ ہر شخص کی علمی استعداد کے مطابق بات کرتے۔ مجھ جیسے کئی بے صلاحیت اور ناقص العقل افراد کے منّہ سے نکلی بے تکی سی باتوں پر بجائے سرزنش کے حوصلہ افزائی فرماتے۔ ایک دن میں نے ان کی اعلیٰ مجلس میں پشتو کا یہ ٹپہ پیش کیا۔

ورځه فلکه لاس دې آزاد دے

یار مې دې جُدا کـۀ اوس دې څۀ پروا لرمه

ترجمہ ۔ جاؤ فلک بے رحم تیرے ہاتھ آزاد ہیں۔ میرا یار بچھڑ گیا ہے اب مجھے تیری کیا پروا ہے)

اردو ترجمہ کے لیے میں نے لالا صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دیئے ۔ ان کے مسکراہٹ کے انداز سے مجھے اپنے کہے ہوئے ٹپے (شعر) کی بے وزنی کا احساس ہوگیا۔ لیکن لالا صاحب نے فوراً فرمایا۔ بہت اچھا شعر ہے۔ اچھا بھلا بنوچیوں کا 'دھونس' (خالی خولی دھمکی) ہے۔ یہاں ''دھونس'' کے لفظ سے صحیح لطف صرف ایک اصل بنوں کا باسی اُٹھا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ لالا صاحب دورانِ ملازمت گورنمنٹ کالج بنوں کے پرنسپل بھی رہے تھے۔ شعر کی فرمائش دوبارہ اور سہ بارہ بھی فرمائی۔ صرف اس ہمچمدانی کی حوصلہ افزائی کی خاطر۔

۲۔ ان کی دوسری بڑی خوبی ان کی انتہائی سخاوت اور میزبانی تھی۔ پنشن، ہدیے اور نذرانے سب کچھ وہ ضرورت مندوں پر تقسیم کردیتے۔ اور اپنے پاس کچھ بھی نہچھوڑتے۔ اُن کی وفات پر منعقدہ تقریب میں قاضی نورالحق ندوی (ڈین صاحب) نے اپنی تقریر میں ایک واقعہ بیان کیا کہ '' میں اور لالا صاحب اسلامیہ کالج کیمپس پر ایک وقت پڑوسی تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ لالا صاحب اپنی ساری آمدن اللہ کے نام پر ضرورتمندوں میں تقسیم کردیتے تھے۔ اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیتے۔ ایک روز میں نے بھائی بندھن کے ناطے ان کو مشورہ دیا کہ لالا صاحب آپ آل اولاد والے ہیں اتنی سخاوت اچھی نہیں کہ کل آپکی اولاد تکلیف و تنگی میں مبتلا ہو۔ اس پر لالا صاحب بہت خفا ہوے ۔ فرمایا ''ڈین صاحب! آپ مجھے اس قسم کا مشورہ دے رہے ہیں۔ کیوں

میرا پروردگار غیرتی نہیں ہے۔ آج جب میں اس کے نام پر غیرت کررہا ہوں۔ کل وہ میری اولاد کے نام پر غیرت نہیں فرمائے گا۔ " ڈین صاحب نے کہا کہ اس جواب نے مجھے بے حد شرمندہ اور لاجواب کردیا۔ اور آج ہر فرد پر یہ بات واضح ہے کہ لالا صاحب کی اولاد کو ہر لحاظ سے دُنیاوی فراغت حاصل ہے۔ " اس کے بعد ڈین صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور بڑے سوز اور اشک بار آنکھوں سے لالا صاحب کے حق میں مالک حقیقی کے دربار میں درخواست گذار ہوئے ۔ "یا الٰہی ! عبدالرحیم نے ساری عمر تیرے نام پر غیرت کی۔ آج وہ تیری غیرت کا محتاج ہے۔ "

لا لا صاحب اسلامیہ کالج کے اولین اساتذہ میں سے تھے۔ کافی عرصہ فلسفے اور منطق کا درس دیتے رہے۔ لیکن صرف عقل کے بل بوتے پر حقیقتِ کُل تک رسائی ناممکن تھی۔ لیکچر کے دوران مالک حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوجاتے۔ اس لیے اعلیٰ حکام نے ملازمت کے آخری حصے میں انہیں فارسی ادبیات کا استاد مقرر کردیا۔ کیونکہ فلسفے کی تعلیم ان کی فقیرانہ طبعی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔انھون نے امام غزالی کی مانند وجدان کو عقل پر ترجیح دی۔ کافی عرصہ تک مجھے یہ پتہ نہ لگ سکا کہ لالا عبدالرحیم ابتک فلسفے کے مضمون سے کچھ شغف اور ربط رکھتے ہیں یا نہیں۔ تا وقت یہ کہ میں نے انجنیرنگ کالج کے سابقہ پرنسپل عبیداللہ دُرانی کی لکھیی ہوئی انگریزی کتاب "وِدھر ای سادھو" پڑھی اور اس کتاب (سادھو کہاں جارہے ہو؟) پر ان کا ایک

دیباچہ میری نظر سے گزرا ۔ معلوم ہوا کہ لالا صاحب کی اس سلسلے تک رسائی اور نظریہ اب بھی منطقی اور فلسفیانہ تھی ۔

لالا صاحب کے فیوض و برکات سے کئی ممتاز افراد نے فائدہ اُٹھایا۔ جو بعد میں حکومت کے اہم عہدوں پر فائزرہے۔ نامور ناول نگار اور ادیب سید رسول رسا مرحوم ان کے داماد تھے۔ لیکن اتنا قریبی روحانی، نسبتی اور معنوی تعلق، علمی استعداد اور اعلانات کے باوجود وہ بھی ان کے اقوال زرین اور افکار بلیغ کو کتابی شکل مین یکجا نہ کرسکے یا ابتک میری نظر سے ایسی نورانی ضرورت اور علمی مشعل نہیں گزری۔ ان کے شاگردِ رشید مرحوم چودھری محمد علی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے ان کے آخری دیدار کے موقع پر اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

نشانِ مردِ مومن بہ تو گویم

چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

آخری آرام گاہ :

آج ٍوہ پشاور یونیورسٹی میں واقع نوگزی بابا بالمقابل پشتو اکیڈیمی میں محوئے خواب ہیں۔ اور ان کی مرقد کی لوح پر درج ذیل کتبہ کندہ ہے۔

پروفیسر عبدالرحیم نیازی ولد خان بهادر غلام حسن نیازی پروفیسر فلسفہ و ادبیاتِ شرقیہ پشاور یونیورسٹی ۔

ولادت ۔ ۹ دسمبر ۱۸۹۱ ء

وصال ۔ ۲٦ جنوری ۱۹٦۸ ء

اولیاء را چوں بوصل افتد نظر۔ زانکہ ایشان را اجل باشد شکر

تلخ سود پنین ایشان مرگ تن ۔چون روند از جاہ زندان چمن

(رومی)

اِنا للہ وانا الیہ راجعون

خدمت اور محبت کا سفر

(پروفیسر عبیداللہ دُرانی رح)

طریقت بجزخدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(ترجمہ ۔ صوفیانہ زندگی مخلوقِ خدا کی خدمت کے بغیر ممکن نہیں۔ صرف تسبیح بھرنے، عبادت اور گدڑی پوشی سے کام نہیں بنتا)

مولانا احمد علی لاہوری (رح) کا قول ہے۔ کہ اصل تصوف خداوند تعالیٰ کو عبادت، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت اور مخلوق خدا کی خدمت سے راضی کرنے کا نام ہے۔

پروفیسر عبیداللہ دُرانی (رح) ایک معروف انجنئیر، سائنس دان، ہومیوپھیتک ڈاکٹر اور خدا رسیدہ چشتیہ عالیہ کے

شیخ طریقت تھے۔ وہ جنوبی بھارت کے صوبہ اندر پردیش میں 1907 ء میں پیدا ہوئے ۔ والد ماجد کی طرف سے دُرانی پشتون تھے۔ لیکن والدہ محترمہ کا سلسلہ مشہور بزرگ حضرت سید گیسو دراز (رح) سے ملتا تھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ کہ انھوں نے ایک ایسا سائنسی آلہ ایجاد کیا جو چوروں اور لٹیروں سے تجوری یا الماری کے مالک کے سوا ہرکسی کی آہٹ پر بجنے لگتی ۔ اس آواز سے زیادہ حساس آلے کی ایجاد کی شہرت جب قدردان انگریز سرکار تک پہنچی تو عبیداللہ صاحب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے شیفللڈ (انگلستان) وظیفہ دے کر بھیجا گیا۔ وہاں سے واپس آکر انھوں نے علی گڑھ میں 1935 ء میں ایک انجنیئرنگ کالج کی بنیاد رکھی اور وہاں بیس سال تک پڑھایا۔ 1955 ء میں وہ رضی الدین صدیقی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کی ترغیب پر پشاور تشریف لائے۔ انھیں انجنئیر کالج پشاور یونیورسٹی کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس پوسٹ پر انھوں نے 1970ء میں ریٹائرمنٹ تک کام کیا۔ وہ متنوع الصفات عالم تھے۔ قابل انجنیئر، مشفق استاد اور کامل شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ہومیو پیتھک طب کے ایک حاذق طبیب تھے۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے ہی میں نامور صوفی اور ولی اللہ بابا تاج الدین ناگوری (ولادت 1861ء / 1637ھ) کی توجہ کا مرکز بنے ۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے دو سال حالتِ جذب میں گذارے ۔ ان کے والد محترم انکو واپس بابا تاج لادین اولیاء کی خدمت میں لے گئے ۔ جنھوں نے انھیں اس حالت سے نکالا۔ انکو بابا قادر اولیاء (1904ء / 1320ھ) کے حوالے سے مزید روحانی تربیت

اور عروج روحانی کے لیے بھیجا ۔ بابا قادر اولیاء نے انھیں چاروں سلسلوں قادریہ، سہوردیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ میں بیعت او تربیت کی اجازت دی۔ لیکن بابا درانی (رح) چشتیہ مسلک سے خصوصی نسبت رکھتے تھے ۔

علی گڑھ ہی میں میڈیکل ڈاکٹروں نے ان کی ایک ایسی بیماری کی تشخیص کی جو خطرناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن جب ہومیوپیتھک طریقہ علاج سے معجزاتی طور پر انکو مکمل شفا عطا ہوئی تو انھوں نے اسی طریقہ علاج سے مفت مریضوں کے علاج کا بیڑا اُٹھایا۔ روکڑہ میں شیخ علاوالدین کی زیارت کی اور وہاں سے انھیں اس کے لیے خصوصی اجازت اور فیض عنایت ہوئی۔ ان کا مطب انکی وفات کے بعد آج بھی ان کے بیٹے جہانگیر درانی اور بہو بیٹی ڈاکٹر صبوحی پشاور یونیورسٹی کیمپس میں چلارہے ہیں جہاں عوام و خواص کو مفت طبی علاج مہیا کی جارہی ہے۔ 2006 ء میں بعد از وفات عبیداللہ درانی کو ہومیوپیتھی کے میدان میں نمایاں خدمات سرانجام دینے پر ہومیوپیتھک کونسل حکومت پاکستان نے انعام و اکرام سے نوازا۔

بُنیر میں مطب اور آستانے کا قیام 1983ء :

بابا دُرانی کی نظر میں اپنے مہربان اللہ تک رسائی کا آسان راستہ انسانیت کی خدمت ہے ۔ وہ جمعہ یا اتوار (سرکاری چھٹی کی مناسبت سے) کو صبح سے مریضوں کے علاج میں مصروف ہوجاتے۔ اس دن ان کی رہائش گاہ ایک مصروف و مقبول مطب کا منظر پیش کرتی۔ رضاکار

اور کارکن یہاں مریضوں کی مفت تشخیص کرتے۔ اور دوائیاں پیک کرکے دیتے۔ مریضوں اور سائیلین کا ایک ہجوم گھر پر جمع ہوتا۔ دُرانی صاحب ان کے مسائل پوری توجہ سے سُنتے تھے۔ شام کے وقت ان کے کسی معتقد کے گھر پر ایک مجلس ہوتی۔ مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتیں تھیں اور شرکائے مجلس کے قلوب کو تلاشِ حق کی ترغیب دیتے۔ دُرانی صاحب ہر سال اپنے شیوخ کے عُرس بڑے عقیدت اور احترام سے مناتے۔ گرمیوں میں وہ قادرنگر (بُنیر) تشریف لے جاتے جہاں انھوں نے اپنی گرمیوں کی رہائش گاہ تعمیر کی تھی۔ یہاں بھی ان کے مُرید زیارت اور ملاقات کے لیے حاضر ہوتے۔ بعض تو سارا گرمیوں کا سیزن گذارتے اور دیگر چند دنوں تک قیام کرتے تھے۔ یہاں کے ماحول پر خراسان کے مشہور ولی ابوسعید ابن الخیر(وفات ۱۰۳۹ء) کے اصولوں کے محتاط اطلاق کا گمان ہوتا۔ خانقاہ کی سیاحت کرنے کے لیے آنے والا ملاقاتی چونک جاتا جب وہ سندھ کے کسی بڑے وڈیرے جاگیردار کو صحن میں جھاڑو سے صفائی کرتا ہوا پاتا۔ اور ایک بڑے معالج کے نازپرورده بیٹے کو انتہائی خاکساری سے زائرین مہمانوں کی خدمت کرتے دیکھتا۔ ان کے قریبی معتقدین میں پڑھے لکھے ہر پیشے کے لوگ شامل تھے۔ جیسے بیوروکیٹس، ججز، ڈاکٹرز، انجنئیرز، پروفیسرز، کارخانہ دار، جاگیردار، کاروباری حضرات اور طالب علم سب ہی ۔ ایک سطحی کوتاہ نظر ملاقاتی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس داڑھی چٹ اکثر مغربی طرز کی پینٹ اور بش شرٹ میں ملبوس شخص میں اعلٰی ولایت کا کوئی شیبہ بھی ہوسکتا ہے۔

صرف ان کے قریبی صاحبِ نظر ساتھیوں اور معتقدین پر یہ راز عیاں تھا۔ (زندگی کے آخری سالوں میں وہ شکل سے پورے سادھو دکھائی دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے کو ایک لمبی چتکبرے رنگ کی داڑھی سے سجایا تھا۔ دور سے تو ان پر اپنے وقت کے ٹیگور یا رحمان بابا کے سٹائل کا گمان ہوتا تھا۔

دُرانی صاحب ایک عمیق صاحبِ نظر انسان اور ایک کامل نفسیات دان تھے۔ جو انسانی فطرت کے اندرونی مشاہدے کی ایک گہری بصیرت کے حامل بزرگ تھے۔ صرف ان کے قریبی احباب کو ہی یہ معلوم تھا کہ وہ کس اعلیٰ' طریقے سے بعض چشتیہ وظائف و لطائف کو کردار سازی کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کے قریبی معتقدین اور سابقہ طلباء کے کہنے کے مطابق وہ فرد کی روحانی نمو اور تربیت کے لیے رسول اکرمﷺ کی اتباع یعنی صحبت شیخ پر عمل پیرا تھے۔ البتہ یہ بات ان کے بارے میں عام طور پر کہی جاتی ہے کہ انھوں نے کسی معتقد کو کوئی خاص مشق کرنے کی تلقین نہیں کی۔ مثلاً مراقبہ مجاھدہ یا ریاضت۔ حقیقت میں معتقدین مشکل سے وہ جان پاتے کہ انکی تربیت اور تیاری کی جارہی ہے۔

بابا کا یہ نظریہ تھا کہ اس جٹ بوائی دور میں وہ افراد جو جذبہ خدمت سے معمور ہیں، کی تربیت اور نمو اس طور سے کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ جلد سے جلد میدان عمل میں کود پڑیں ۔ سالک کو بڑے احتیاط سے ایک کلمہ ذکر دیا جاتا اور تاکید کی جاتی کہ اس کلمے کا ورد دل میں رات کو سونے سے پہلے یا پھر کسی وقت یاد آنے پر

دہرائے ۔ دوسرے مواقع پر عموماً تصور میں یہ عمل باہر کرنا پڑتا۔ ذکر اور تصور کے یہ باہم توام (جڑواں) روحانی ارتقاء کا طریقہ معلوم ہوتا ہے جو کہ روحانی شعور کے لیے آجکل کے چشتیوں سے لیا گیا ہے ۔ بابا درانی نے ذکر خفی پر زور دیا۔ جو ان کے نظرئے کے مطابق حقیقت کے دائرے میں کام کرتا ہے۔ بابا درانی کی نظریاتی وابستگیاں کیا تھیں؟ ان کے خیال میں ذکر جلی اور ذکر خفی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ذکر جلی شریعت کے دائرے میں ہے۔ اول الذکر سالک کو غیر معمولی کمالات ظاہر کرنے پر قادر کرتی ہے۔

جبکہ ذکر خفی کا تعلق ایک مختلف سمت سے ہے۔ یہ ہمہ عشق کا معاملہ ہے اور اس حدیث پاک کا بھید ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا اور چاہا کہ پہچانا جاؤں، ذکر خفی تحت الشعور اور لاشعور کے پوشیدہ گوشوں کی سطحوں پر اپنا کام کرتا ہے ۔ ذہانت اور حواس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ طبعی مرگ سے قبل موت (موت قبل ان تموتو!!!) کے طفیل سالک دقیق وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ (ایک حسین چہرے کے تصور سے حسنِ پنہاں تک) اور اس اکائی تک باطنی نظر کی رسائی حاصل کر لیتا ہے جو ساری خلقت میں پوشیدہ ہے۔ شاید کوئی دُرانی صاحب کی بات سے یہ مطلب حاصل کرے کہ شریعت کے ذریعے ذکر خفی کا ادراک نہیں کیا جاسکتا اور ان کا مقصد روحانی بصیرت ہے ۔ پھر اس وقوعے کا طریقہ کار کیا ہے؟۔

ان کے مطابق صرف ایک شیخ جو عالم جبروت (قدرت کاملہ) کی سلطنت میں اپنا مقام حاصل کرچکا ہو، کی نظر توجہ سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جب فرد کی روح اپنی انفرادیت کے خول سے نکل کر روحوں کے اجتماع (اجتماعیت) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت شامل ہوتی ہے۔ یہی حالت نسبت محمدی (ﷺ) کہلاتی ہے۔ شیخ کے برزخ سے سالک کو پیغمبر (ﷺ) تک لایا جاتا ہے۔ اور یہ مقام مشاہدہ ہے۔ ایک بیدار روح ہی مشاہدے کے قابل ہوتی ہے اور یوں حقیقی معنوں میں سالک شہادت دینے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے ۔

سالک کے لیے ضروری ہے کہ اس تعلق کو قائم رکھے اور سنت کی کامل مطابعت سے اسے تکمیل تک پہنچائے۔ ظاہری سنت اور خاص کر پیغمبر (ﷺ) کی باطنی سُنت یعنی مخلوق خدا کی خدمت سے ۔ رسول خدا (ﷺ) کے ساتھ ایسا نیا تعلق قائم کرنے کے بعد سالک غیب تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں وجود کی کایا پلٹ یا وسعت وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔ اور سالک ایک متکبر خودشناس (ایگوسینٹریک) وجودیت سے ایک اجتماعی (کامونل) ذات اختیار کرجاتا ہے ۔ اور وجود کامل کا حصّہ بن جاتا ہے ۔ جہاں وہ نجات یا ذاتی وجود کی بقا سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ساری مخلوق کی بہتری کا سوچتا ہے ۔ ایک کامل شیخ یہ اختیار رکھتا ہے کہ سالک کو خفی سے ملا دے ایسا تب واقع ہوتا ہے جب شیخ سالک کو اسم ذات کے ورد کی عنایت کرتا ہے ۔ درانی بابا فرماتے تھے کہ اس بات میں اسلام کی دوسری

مذاہب پر برتری کا راز پوشیدہ ہے اور یہ پوشیدہ خزانے کی کلید (کنجی، فتح) پیش کرتا ہے۔ سالک کی ُسنت کی تکمیل اس وقت مکمل ہوجاتی ہے۔ اگر وہ اللہ پاک سے تعلق جوڑ لیتا ہے لیکن ساتھ ہی خلق میں بھی شامل ہوتا ہے (حق سے واصل اور مخلوق میں شامل) ۔ اس لیے مخلوق کی خدمت ضروری ہے۔ ذکر کے سفر میں پہلے سالک فنا کے مختلف مراحل اور درجات سے گذرتا ہے ۔جب سالک فوت ہوجاتا ہے تب وہ شیخ کی توجہ سے دوبارہ نیا جنم لیتا ہے اور اسے مشاہدہ حق (شہداء) کا مقام مل جاتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاے کرام کے نزدیک شہادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہر کی طبعی شہادت کی موت اور دوسری باطنی قسم جس میں یہ کمزور و غیر وجود ذات مرجاتی ہے ۔ روح دوبارہ جنم لیتی ہے اور اپنی جیسی روحوں اور شہداء سے مل جاتی ہے۔ یہ ایک اختلافی متنازع مسئلہ ہے جس سے علماء دیوبند اجتناب کرتے ہیں -- (یاد رہے کہ اقبال بھی ‘‘اندر وجود’’ بجاے ‘‘اندر حضور’’ کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ما تُرا جوئیم تو از دیدہ دُور

نہ غلط، ما کو رو تو اندرحضور

قرٓن پاک میں نبیین، صدیقین، شہداء او صالحین کو انعام یافتہ بہترین (محسنین) شخصیات میں شامل بتایا گیا ہے ۔ تو کیا قرٓن کریم کی اصطلاح ‘‘شہداء’’ کا مطلب وہ لوگ نہیں جو ‘‘اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ’’ ۔ صوفیاء کے مسلک کی تشریح و توجیہہ کی معاون نظر آتی ہے ۔ شہادت کا

مقام پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی مکمل پیروی خاص کر انسانیت کی خدمت کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ناقدین کا یہ اعتراض کہ تصوف قرآن کے نظریہ کو اُلجھا اور مروڑ دیتا ہے ۔ اور صوفیاء انسانیت کی فلاح و بہبود میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر رہے اس لیے کہ ان کا ذہن پہلے ہی نفس کشی میں مصروف ہوتا ہے، غیر ضروری ہے ۔

ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بابا درانی ایک جدید صوفی کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ جنھوں نے صدیوں پرانے وضع کردہ قاعدہ اور طریق کو موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق قبول کیا۔ سخت ریاضت کی مشقتوں کو صحبت، توجہ اور کشش میں بدل دیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اپنے ساتھ بے شمار فوائد لائے اور مادہ پرستی کا دور شروع ہے۔ آزادئ فکر کی عادت اور تجزیہ عمل جاری ہے ۔ اندھی تقلید جو شیخ اور مرید کے تعلقات میں ایک اہم ضرورت ہے پر اس زمانے میں مشکل سے ہی عمل کیا جا سکتا ہے ۔ بابا درانی اس ماحول سے واقف تھے۔ جس میں وہ کام کرتے تھے اس لیے مرید کو شاذ و نادر کسی کام کے کرنے یا روکنے اور منع کرنے کا حکم دیتے تھے۔ صوتی یا نطقی دعا اور دیگر روحانی مشقیں (مجاہدہ، ریاضتیں وغیرہ) ضروری نہیں سمجھی جاتیں اور شیخ سے جوڑ (ملاپ) اور محبت اس کا متباد ل ہے ۔ اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ سالک کی اپنی کوششوں سے زیادہ شیخ کی اثرپذیری اس کی روحانی ارتقاء میں کارفرما ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توجہ اور جذب

(کشش) ان سخت راہبانہ مشقتوں کی جگہ لے رہے ہیں جو سالک کے لیے ضروری نہیں۔

بابا درانی کے لیے ذکر خفی شریعت یا طریقت کی حدود میں نہیں آتے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ دراصل تصوف کی شناخت شریعت یا اسلامی فقہ (جورس پروڈینس) کے حوالے سے نہیں ہوسکتی جیسے کہ بعض صوفیاء کا نکتہ نظر ہے۔ ذکر خفی کا سبق صرف ایک کامل شیخ ہی سکھا اور پڑھا سکتا ہے۔ شیخ کامل ایک نہایت اہم رابطہ ہے۔ جس میں یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ سالک کو غیبی (خفی) خزانے تک پہنچاے۔ اس واسطے کے بغیر یہ رسائی ممکن نہیں ہے۔

بابا عبیداللہ درانی (رح) کی تعلیمات

پروفیسر عبیداللہ درانی (رح) نے اپنی ساری زندگی سماجی، معاشرتی اور رفاعی کاموں کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ خود معروفیت کی نصیحت پر کسی کو دیا کرتے تھے۔ اس کی تشریح وہ یوں کرتے کہ اپنی ذاتی دلچسپیوں یا مفادات سے دوسروں کے مفاد کو مقدم تر اور عزیز جانو۔ دوسرے معنوں میں یہ سمجھو کہ دوسروں کے مفادات کو اپنی ذات سے ماوراء رکھو۔ یہ بات تمہیں سدا بہار او سچی خوشی بخشے گی۔ خداوند پاک تک رسائی تک مختصر ترین راستہ اس کی مخلوق سے گذرتا ہے ۔ خداوند تعالیٰ کو مخلوق میں تلاش کرو۔ ان کی مدد کرکے۔ ان کا خیال رکھ کر اور ان کے غموں اور خوشیوں میں حصہ لے کر اسلام کی اصل جوہر ‘‘ جمیعت بندی’’ یعنی

بندوں کے درمیان محبت کی بندھن اور لوگوں کے درمیان بے غرض تقسیم قائم کرتا ہے ۔ بابا عبیداللہ درانی (رح) پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت کرتے اور ان سے عقیدت اور احترام کا عظیم رشتہ ہر حال میں برقرار رکھتے۔ وہ تصوف کے راستے سے حقیقت کی تلاش میں سرگردان تھے۔ اوائل عمر میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری سے روشناس ہوئے جس کی وجہ سے ان کی دلچسپیوں کا رخ تصوف کی طرف مُڑ گیا۔ابتداء میں وہ ناگپور (انڈیا) کے بابا تاج الدین اولیاء (رح) اور بعد میں وہ ویجیاناگرام (بھارت) میں قادر نگر کے بابا قاادر اولیاء (رح) کی پیار بھری راہنمائی میں تلاش ذات کی راہ پر روانہ ہوے ۔ یہ جستجو تا دم مرگ جاری رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کو ان کی یہ فکر بانٹنے کے لیے ساتھی ملتے گئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے ۔

قادر نگر کا قیام ۔

اللہ کے بندوں کو ہر دور میں اپنے عظیم خالق و مالک سے لو لگانے کے لیے آبادیوں سے دور پہاڑوں اور صحراوں میں گوشہ عافیت کی تلاش رہی ہے ۔ بابا صاحب کو بھی حسین وادیوں کا علاقہ سوات بھایا۔ سوات کی وادی بنیر میں زمانوں سے ایک عظیم ہستی اور صوفیاء کے قافلے کے سرخیل حضرت پیر بابا (رح) مدفون ہیں۔ یہیں پر عبیداللہ درانی (رح) نے بھی اپنے پیر و مرشد بابا قادر کے نام سے منسوب قادر نگر آباد کیا۔ وہ اکثر گرمیوں کی تعطیلات میں یہاں تشریف لاتے۔ خُنک موسم سے فیض

یاب ہونے اور باباجی سے ملاقات و فیضِ صحبت کے لیے ان کے بے شمار معتقدین اورشیدائی قادر نگر آتے رہتے جہاں درانی صاحب اپنے مرشدین بابا تاج الدین اور حضرت قادر اولیاء (رح) کے سالانہ عرس مناتے ۔ بابا درانی نے ۱۹۹۰ ء میں یہیں قادر نگر میں جان جان آفرین کے سپرد کردیا اور انکی وصیت کے مطابق یہیں مدفون ہوے ۔ یوں یہ جگہ مرجع خلائق ٹھری ۔

تصانیف :

“When a voice of the silence touches my words, I know him and
therefore, I know myself”.

Rabindarnath Tagore

.ترجمہ: جب ایک خاموش دم بستہ صدا میرے الفاظ سے
مَس ہوتی ہے تب مجھے اس کی معرفت
بھی حاصل ہوجاتی ہے۔)

(1) Wither ye Sadhu?
(سادھو کہاں جا رہے ہو؟)

پروفیسر عبیداللہ درانی کی انگریزی تصنیف ہے ۔ درانی بابا (رح) بنیادی طور پر ایک صوفی بزرگ تھے ۔ اس کتاب میں سالک ایک آرین نسل بادشاہ ہے جو سامی نظریات کے مطابق اپنے صوفیانہ منازل طے کرتا ہے۔ کتاب کی زبان خاصی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ لالا عبدالرحیم

نیازی مرحوم نے اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے
۔

(2)“The Evolution of Faith”

اصل کتاب دُرانی صاحب نے ‘‘ عقیدے کا ارتقاء ’’ کے نام سے اردو میں لکھی ہے۔ جسے ان کی بانجھی ‘‘ نعیمہ بی ۔ ھین ’’ نے انگریزی میں ترجمہ کرکے شائع کیا ہے ۔ یہ انسانوں اور خدائے رحمان و افضل کے درمیان تعلق اور رشتے کے بارے میں ایک صوفی کی تحریر ہے جو خدائے واحد کو ماننے والے مذہبوں کی ارتقاء کے بیان کا احاطہ کرتی ہے ۔ کتاب یہ خیال پیش کرتا ہے کہ چاروں مذہبی نظاموں ممیں تقسیم مصنوعی ہے ۔ باوجود اس کے کہ چاروں عقیدوں کا اندرونی حصہ خالق اور مخلوق کے درمیان محبت کا رشتہ ہے۔ اس کتاب کا لب لباب مختصرا" یوں ہے ۔

‘‘دنیا میں فقط ایک ہی امن کا عقیدہ اور دین ہے۔ دین ابراہیمی ۔ دین موسوی۔ دین عیسوی اور دین اسلام ۔ یہ سب دین فطرت کے چار ارتقائی منازل ہیں ۔ اس حقیقت کی تائید اور تصدیق خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارک ہے : ‘‘ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ اسے یہودی، عیسائی یا مسلمان بنادیتے ہیں۔’’ تخلیق آدم کے پہلے ہی دن سے سب ارواح نے اللہ تبارک و تعالیٰ کو اپنا ربّ اور رازق تسلیم کیا تھا۔ اب اگر کوئی اس عہد یا وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ایسا کرنا دنیاوی غلاظت کا نتجہ ہوتا ہے۔ اسلام آغاز ہی سے ایک بنیادی سچائی اور متحرک قوت

رہی ہے اور ایسا ہمیشہ رہیگی ۔ ’’ ------- مختلف اوقات میں قوموں کی تاریخ ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہے ۔ جہاں ذات کی بیرونی اور اندرونی (ظاہر و باطن) کے درمیان کشمکش بربادی اور اُداسی پر منتج ہوتی ہے۔ لیکن دین فطرت نے اپنا سفر جاری رکھا اور درمیانی صحیح راستہ (شاہراہ اوسط یا صراط مستقیم) کی طرف بلاوا دیتا رہا۔ پیغامبرانِ کرام اگلی منزل کی طرف شمع روشن کرتے رہے حتیٰ کہ وہ ‘‘الاسلام’’ کی منزل زیبا پر پہنچے۔ یہ کارواں اب بھی رواں دواں ہے ۔ اس کے بعض افراد سڑک کے کنارے پڑے ہیں ۔ بعض آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر ہم آج ماضی سے رواں دواں کاروانوں کے نقش پا کا جائزہ لیں تو دل سے یہ آواز آتی ہے:

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا

ہم محو نالہ جرسِ کارواں رہے

(مولانا حالی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

اسلام کی جڑیں جہاں ابدی کی لافانی روح (آتما) میں پیوستہ ہیں۔ اس مقام کو پانے کے لیے سالک کو کائناتی مادی وجود سے پرے جانا ہوگا۔ اسی لیے تو ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ؛

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

3. Char Islam?

Spiritual journey of Islam from Abraham, Moses, Jesus to Muhammad, Ubaidullah Durrani with guidance from Baba Qadir Awlia.

۴۔ حیات قادر ۔

۵ ۔ دُر عینی ترجمہ ولی الدین

٦۔ حکمت فروغ کُن ۔ جلد اول و دوم

۷۔ www.Blissmmedia.pk

معاصرین کے ساتھ تعلقات

لالا عبدالرحیم نیازی (مرحوم) بنیادی طور پر فلسفہ اور فارسی کے استاد تھے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج بنوں کے پرنسپل بھی رہے ۔ پشاور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر چودھری محمد علی مرحوم ان کے اولین شاگردوں میں سے تھے ۔ اور ان کی خدمات اور طلباء ک کردار سازی میں کردارکے پیش نظر انکو اعزازی پروفیسر کا عہدہ دے کر یونیورسٹی کیمپس پر رہائش مہیا کی۔ لالا صاحب اگرچہ خود رُشد و ہدایت کے قندیل تھے ۔ لیکن دُرانی بابا کے روحانی فیوض اور دست شفا کے قائل تھے ۔ دونوں کے آپس میں گہرے روحانی روابط تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف نے لالا صاحب سے اپنی چند جسمانی اور روحانی عوارض کے بارے میں مشورہ مانگا۔ انھوں

نے یہ فرما کر مجھے دُرانی بابا کے پاس بھیجا کہ دُرانی صاحب کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دست شفا او خاص روحانی فیض بخشا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی مریض سے اس کا نسخہ اور دوا کی گولیاں اور پُڑیاں گُم بھی ہوجائیں ۔ تب بھی دوائی اپنا اثر دکھاتی ہے اور مریض کو اللہ پاک مکمل شفا عنایت کر لیتا ہے۔ خیر میں دُرانی صاحب کے ہاں لالا کی سفارش لے کر حاضر ہوگیا۔ انھوں نے توجہ اور شفقت سے میری تکالیف کو سُنا اور پُڑیوں مین تھوڑا تھوڑا سا سفوف ڈال کر صبح خالی پیٹ مکھن کے ساتھ کھانے کی ہدایت کی۔ یہ میرے خیال میں سچی محبت، قلبی تعلق، یقین صدق اور اندھی عقیدت کا معاملہ ہے ۔ جس پر یہ سارا روحانی نظام قائم ہے ۔

۱ ۔ حضرت امیر حمزہ شنواریؒ پشتوادب میں ایک نابغہ عصر شخصیت گذری ہے ۔ ان کے بھی دُرانی بابا کے ساتھ عرصہ دراز تک خوشگوار، نیازمندانہ، باہمی عقیدت و احترام کا تعلق رہا۔ راقم الحروف کے نام ایک خط محررہ ۲۹ جون ۱۹۸۱ ء میں لکھتے ہیں 'رواں مہینے کی ۱۰تاریخ کو بوقت عصر عزم پیر باباؒ ہوا۔ وہاں میں اکثر محمد عبیداللہ خان دُرانی کے ہاں جاتا ہوں ۔ میرے ان کے ساتھ سالوں سے تعلقات ہیں ۔

اس ہیچ مدانی کا ایک مضمون پشتو اکیڈمی کے رسالے ''پشتو'' کی اشاعت جون ۱۹۸۲ء میں بعنوان ''کائنات حق تعالیٰ کی علمی تخلیق ہے '' شائع ہوا ۔ حمزہ بابا مرحوم اپنے ایک خط تحریر کردہ ۳۰ جون ۱۹۸۲ ء میں ایک بار پھر قادر نگر اور دُرانی صاحب کا ذکر کرتے ہوے رقم

طراز ہیں ‘‘میں ۳۱ مئی کو قادر نگر گیا تھا۔ اور ۱۶ جون تک دُرانی صاحب کا مہمان رہا۔ جیسا کہ ہر سال ان کے پاس جاتا ہوں اور چند دن وہاں گذارتا ہون ۔ تمہارا مضمون ‘‘پشتو’’ رسالے میں نظر سے گذرا ، پڑھا۔ بہت اچھا تھا۔ میرے خط کا بھی جواب دیا تھا۔ بڑی عنایت ہے (ڈیرہ مننہ) ۔ اسی طرح ایک بار راقم الحروف نے علم تاریخ کی روحانی اور وجدانی تعبیر ’’ کے بارے میں حمزہ باباؒ سے یہ استفسار کیا کہ کیا دُرانی بابا اس سلسلے میں کمترین کی مدد کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مورخہ ۹۔ ۲۔۱۹۸۳ ء کے ایک جوابی خط میں لکھا ‘‘دُرانی صاحب یقیناً" تمھاری راہنمائی فرما سکتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کے اجلاس کے لیے اسلام اباد تشریف لے گئے ہونگے۔ البتہ وہ شجر کاری کے سلسلے میں قادر نگر پیربابا جاتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ شوریٰ کے اجلاس کے لیے نہ گئے ہوں ۔ وہ یونیورسٹی میں اپنے بھانجے پروفیسر پاشا کے ساتھ رہتے ہیں۔ جمعہ کے دن کئی لوگ دوائیوں کے لیے ان کے ہاں آتے ہیں ۔ دوائی مفت دیتے ہیں ۔ سپین جمات کے پاس ٹانگے کھڑے ہوتے ہیں ۔ وہ سب دُرانی صاحب کی رہائش گاہ سے واقف ہیں۔

زندگی کے آخری سالوں میں حمزہ صاحب ایک اضطراب ، کرب، درد اور تکلیف کے دور سے گذر رہے تھے۔ حمزہ صاحب کا خیال تھا کہ دُرانی بابا انہیں اپنے روحانی سائے او اثر میں لانا چاہتے تھے ۔ روحانی گرفت اور کشمکش کے ایسے ہی لمحے انہیں اس وقت بھی پیش آے تھے جب حویلیاں ضلع ہزارہ کے مشہور محدث اور عالم

محمود شاہ المعروف محدث ہزاروی نے انہیں اپنے مرید بھیج کر بلوایا - پہلے انہیں عبا قبا پہنائی اور پھر چاروں ِسلسلوں میں خلافت دے کر حیران کر دیا تھا۔ اب حمزہ بابا پہلے ہی سے مشہور بزرگ پشاور کے سیّد عبدالستار بادشاہ (رح) کے مُرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ اور یہ نسبت بہت زیادہ قوی اور ناقابلِ شکست تھی۔ حمزہ صاحب نے مرحوم عبدالرحمان لوگے کاکاخیل جو ان کے قریبی عزیز، معتقد اور رازدان تھے، کو دُرانی بابا کے پاس بھیجا۔ انھوں نے پُرزور لہجے میں بابا سے کہا کہ وہ انہیں آزاد کردیں - بابا نے بڑی شفقت سے انھیں سمجھایا کہ سلوک کی راہوں میں صرف محبت و الفت کی قندیل روشن ہوتی ہے۔ یہاں زور، نفرت اور زبردستی سے کام نہیں ہوتا۔ لوگے صاحب نے ان سے لکھواکر حمزہ صاحب کو یہ پیغام پہنچایا۔ اب عرصہ ہوا کہ عبدالرحمان لوگی نے یہ عجیب واقعہ مجھ راقم الحروف کو سُنایا تھا۔ پیغام در پیغام کے الفاظ مختلف ہوسکتے ہیں - لیکن مطلب و معنی یہی تھے -

بابا دُرانی صاحب اور ظفر بیگ بھیٹنی :

ظفر بیگ انجنئیرنگ کالج پشاور کا ایک ذہین، چالاک، تیز و طرار اور پشتون کی ابرو پر مر مٹنے والا نوجوان تھا۔ ان کے ایک سینئر پنجابی استاد کی عادت تھی کہ جماعت میں جب کبھی کسی انسان یا حیوان کی حماقت ، ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے تو مثال یہ کہہ کر دیتے کہ ‘‘بالکل ایک پٹھان کی مثل’’(جسٹ لائک آ پٹھان) - یہ الفاظ استاد محترم کا ایک قسم کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ کلاس

کے طلباء کی اکثریت پٹھانوں کی تھی۔ ان کو غیرت قومی کی وجہ سے یہ بات بُری محسوس ہوتی تھی۔ لیکن استاد کے احترام اور کلاس کے انتظامی قواعد کے پیش نظر خاموش ہوتے۔ لیکن جب یہ استاد کا روز کا معمول بن گیا تو آخر طلباء نے ظفر بیگ سے یہ کہہ کر رجوع کیا کہ کلاس میں تمھارے ہوتے ہوئے پشتون قوم کی غیرت کو کیسے للکارا جا رہا ہے؟ دوسرے ہی دن ظفر بیگ اگلی قطار میں بیٹھ گیا اور جونہی استاد نے حسبِ عادت ‘‘جسٹ لائک آ پٹھان’’ (just like a Pattan) کے الفاظ بولے، ظفر بیگ نے فوارًا اٹھ کر استاد کا گریبان پکڑ لیا۔ پروفیسر نے چیخ کر وجہ پوچھی ‘‘ یہ کیا بدتمیزی ہے ؟ ’’ ظفر بیگ نے برجستہ جواب دیا ‘‘ جسٹ لائک آ پٹھان’’ اور اسے تختہ سیاہ پر پٹخ دیا۔ خیر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لوگوں نے باھر سے آ کر بیچ بچاؤ کیا۔ استاد نے سیدھا پرنسپل کے دفتر کا رُخ کیاپرنسپل دُرانی صاحب سے شکایت کی۔ جلد ہی ایک چپڑاسی نے آکر پرنسپل کی طرف سے اظہار وجوح کا ایک نوٹس ظفر بیگ کو تھما دیا۔ جس میں اسے ذاتی سماعت کے لیے دفتر میں بھی طلب کیا گیا تھا۔ اور بظاہر یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ ظفر بیگ کو کالج سے خارج کردیا جائیگا۔ ان ہی دنوں پیر بابا کے مزار کے قریب ہی قادر نگر میں دُرانی صاحب ایک خانقاہ تعمیر کر رہے تھے۔ ظفر بیگ الصبح کالج پہنچا ۔ جونہی پرنسپل دُرانی صاحب نے دفتر میں اپنی کرسی سنبھالی ۔ ظفر بیگ اندر داخل ہوا اور دُرانی صاحب کے قدموں میں گر پڑا اور ان کے دونوں ہاتھ چومنے لگا۔ دُرانی صاحب نے حیران ہوکر پوچھا ‘‘ بیٹھا کیا بات ہے؟

’’ ظفر بیگ کی پرنسپل کے ہاتھوں پر گرفت شدید تر ہوگئی۔ عرض کیا ‘‘جناب! آج مجھے اپنی روحانی پیاس بجھانے دیں۔ کئی روز سے بیقرارتھا۔ روحانی قُرب میں مبتلا تھا۔ رات پیر بابا (رح) کو خواب میں دیکھا میں نے رو رو کر اپنا حال بیان کیا اور مداوا چاہا۔ انھوں نے فرمایا بیٹا! اب تو میرا وصال ہو چکا ہے ۔ عالم ظاہر میں تمھاری مدد نہیں کرسکتا آج کل میرے یہ سب فیوضات پرنسپل دُرانی صاحب کے پاس ہیں۔ ان کے پاس جاو، اللہ تعالیٰ بھلا کرے گا۔ اور یہ ہے آج میں حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا نام، پیر بابا (رح) کا واسطہ میرے حال پر رحم فرمائیں۔’’

دُرانی صاحب تو تھے ہی ایک صاحب دِل اور شفیق انسان انھوں نے اس روحانی پیاسے سے فرمایا‘‘ تمھیں معلوم نہیں تھا کہ ہر جمعہ کو میرے بنگلے پر آؤ ۔ مریضوں کی خدمت اور خلق خدا سے محبت کو اپنا شعار بناو اور فیوض و برکات کے خزانے لوٹو۔ ’’ آخر میں اُٹھتے ہوئے ظفر بیگ نے آہستہ سے پوچھا جناب! آپ نے مجھے طلب فرمایا تھا۔ دُرانی صاحب نے اسے فقط اتنی نصیحت کی ‘‘ بیٹا! اُستادوں کی تھوڑی سی عزت کیا کرو’’ ۔ یوں پشتون ننگ و ناموس بحال کرنے کے کامیاب معرکے کے بعد ساتھی اسے تُرتُری بیگ پکارنے لگے۔ ادھر متعصب پروفیسر نے بڑا زور لگایا کہ اسکی سخت بے عزتی ہوئی ہے ۔ لیکن دُرانی صاحب نے اسے یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ ظفر بیگ سے یہ حرکت حالت اضطراب میں سرزد ہوئی ہے اور سلوک کی راہ میں ایسے سخت مراحل پیش آتے رہتے ہیں ۔ اس حالت میں سالک کا

مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر نے کافی شور اور پُرزور احتجاج کیا ۔ لیکن دُرانی بابا نے ظفر بیگ کے سر سے اپنی شفقت کا سایہ نہیں اُٹھایا۔ نتیجتاً پروفیسر نے شدید حالت قہر میں نوکری ہی چھوڑ دی ۔

اقوال دُرانی (رح) :

۱۔ حق کی تمہیں کیا تلاش ہوگی۔ حق کو تم جانتے ہی کیا ہو اور تمھیں کیا خبر کہ خود حق کو تمھاری کتنی تلاش ہے ؟ حق کی آواز ہے کہ تم مجھ میں سما جاؤ اور میرا بول بالا کرو۔
۲۔ کلمہ طیبہ پڑھنا کمال نہیں بلکہ خود کلمہ ہو جانا کمال ہے۔ فقیر گر ظاہر میں کلمہ نہ پڑھتا ہو مگر باطن میں وہ خود کلمہ ہوجاتا ہے، جو اسی مٹی کے پتلے کو طَیّب بنا دیتا ہے۔
۳۔ نماز کی روح انسان کو انسان بناتی ہے، اگر نماز انسان کو انسان نہ بنا سکے تو وہ نماز ہی نہیں ۔
۴۔ عبد ہونے کی پہچان ''وفا'' میں ہے ۔ جب تک اپنی روح میں قیام نہ ہو، وفا کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔
۵۔ زندگی کا بنیادی نظریہ یہی ہے کہ مثبت پہلو پر نظر رکھی جائے ۔
٦۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے موجودہ زمانہ بهترین زمانہ ہے، بد سے بدتر کو بھی ذرا راستہ ملے تو اس کی بُرائیاں غائب اور روشنیاں غالب آجاتی ہیں۔

خلافت : عبیداللہ دُرانی مرحوم کے اگرچہ کافی پڑھے لکھے ، عالم فاضل اور خدمت خلق سے سرشار مرید اورمعتقدین تھے۔ لیکن انھوں نے کسی کو بھی خلافت سے نہیں نوازا۔ وہ سب ایک دوسرے کو محض ''بھائی'' کہہ

کر یاد کرتے ۔ البتہ ان کے بعض احباب او خاندان کے افراد انہیں ایک انتہائی عزیز دانشمند بزرگ سمجھ کر پیار سے باباجان کہتے تھے۔ بہرحال دُرانی بابا خود فرمایا کرتے تھے کہ میرے مُرشد نے بھی مجھے خود خلافت عطا نہیں کی اور نہ ہی میں کسی کو ایسا منصب سونپ سکتا ہوں۔ البتہ جو بھی خدمت خلق میں آگے بڑھے گا خدا عزوجل اس کو خود ہی اعلیٰ مقام اور درجہ عنایت کرے گا۔

دُرانی بابا کی گدی پر آج کل بظاہر ان کے بھتیجے اور داماد پروفیسر پاشا متمکن ہیں۔ جو بنیادی طور پر ان کی طرح انجنئیر ہیں۔ اور ریٹائرڈ ہیں۔ حیات آباد فیز ۵ کے ایک بنگلے میں دُرانی بابا کی طرح ہفتہ وار ہومیوپیتھک علاج کرتے ہیں اور دوائیاں بانٹتے ہیں ۔ ہفتے میں ایک روز معتقد سامعین دُرانی بابا کے ریکارڈ شدہ صوفیانہ مسائل پر بحث توجہ سے سنتے ہیں اور فیض اٹھاتے ہیں ۔ شام کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد محفل برخاست ہوجاتی ہے ۔

پیر مغان یا سنگ پارس

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی نور اللہ مرقدہ

بہت روئیں گے کرکے یاد اہلِ میکدہ تجھ کو
شرابِ دردِ دل پی کر تمھارے جام و مینا سے

(شاعر سے معذرت کے ساتھ)

ایک ایسی متنوع الصفات ہستی جنھوں نے یونیورسٹی، پشاور شہر، صوبہ پختون خواہ اور یہاں تک کہ ملحقہ صوبہ پنجاب کی سرزمین کو اپنے فیض سے بقعۂ نُور اور خاک کو کیمیا بنادیا۔ وۃ مکتب سلیمانی سے فیض یاب حضرت مولانا محمد اشرف قدس سرہ تعالیٰ کی مقناطیسی روحانی شخصیت تھی ۔ یونیورسٹی کی ہر کونے پر ذکر الٰہی کے لیے مساجد تعمیر ہوئیں۔ اس روحانی، دینی اور اصلاحی انقلاب کی برکت تھی کہ نوجوان استادوں اور شاگردوں کے چہرے سُنت رسول ﷺ کے اطباع میں شرعی داڑھیوں سے مزیّن و منور ہو گئے ۔ اکثر ہاتھوں میں تسبیح کے دانوں اور زبانوں پر کلمات پاک کے ورد کیساتھ گھومنے لگے۔ جسم کے لباس میں ٹائی اور کَسی ہوئی تنگ پینٹ کی جگہ لمبی آستینوں کی قمیصوں اور پانچے چڑھائۓ چوڑی دار شلواروں نے لے لی۔ جیبوں میں مسواک نظر آنے لگی۔ تبلیغی اجتماعات، سہ روزوں، چلوں اور شب جمعہ کی رونقیں بڑھنے لگیں ۔ اندرون و بیرون ملک تبلیغی جماعتیں وعظ اور اخلاق سازی کے لیے گشت پر نکلنے لگیں۔ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں ہر سو راتوں کو جگہ جگہ قال اللہ و قال الرسول کی روحانی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ علاقہ پشاور میں ان روحانی بہاروں اور روحانی مناظر کا سارا کریڈٹ صرف اور صرف مولانا محمد اشرف سلیمانی (رح) اور

ان کے بیشمار پُرجوش اور فنا فی التحریک تبلیغ ساتھیوں کو جاتا ہے ۔

تعارف ۔ حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کا تعلق پٹھانوں کے مہمند قبیلے سے تھا۔ والدؓ مرحوم کا اسم گرامی محمد اکبر تھا۔ پشاور کے قریب شیخ محمدی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مرحوم اسلامی شعائر کے پابند ایک فقیر منش صاحب تقویٰ اور مہمان نواز شخصیت تھی۔ اپنا قالینوں کا کاروبار دہلی، کلکتہ، دارجیلنگ اور شملہ تک محیط تھا۔ والدہ صاحبہ کا وطن بھی تپہ خلیل مہمند شیخ محمدی پشاور تھا۔ ینک فطرت اور پاکباز خاتون تھی۔ مولانا صاحب 6 مئی1925 ء کو پیدا ہوئے ۔ جائے پیدائش محلہ مقرب پشاور شہر تھا۔ ان کے تین اور بھائی تھے ۔ بڑے بھائی محمد اکرم خان ائرفورس میں اسکوارڈن رہے اور بعد میں فران سروس میں ٹریڈ کمشنر رہے ۔ دوسرے بھائی محمد اسلم خان فوج کے شعبۂ صحت سے بطور ائیر وائس مارشل ریٹائرڈ ہوئے ۔ راقم الحروف ڈائریکٹر اور سیکریٹری ہیلتھ بھی رہے ۔

تعلیم و ملازمت ۔ مولانا موصوف کا گھریلو ماحول ابتداء ہی سے علمی اور دینی تھا۔ والد محترم سے فارسی اور اردو کی دینی کتب پڑھیں ۔ فارسی ادب کا ذوق پایا۔ والدہ صاحبہ سے ناظرہ قرّن پاک پڑھا۔ لیکن خود فرماتے تھے کہ باوجود عربی کے استاد ہونے کے ابتک ان کی قرأت اور تجوید قرآن صحیح نہیں ہے اور ایسا ہونا والدہ کی شاگردگی اور اولین طرز ادائیگی الفاظ قرآنی کا اثر ہے۔ گھر ہی میں ایک خالہ زاد بھائی سے الگ متعدد اردو اور

فارسی کی متبادل تفاسیر، احادیث، سیرت اور فقہ کی کتب پڑھیں ۔ ابتدائی سکول کی تعلیم اسلامیہ سکول شملہ سے حاصل کی۔ 1940ء میں میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول نمبر3 پشاور سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اگلے سال 1941ء میں ادیب فاضل کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اسی دانش گاہ سے ایف اے اور بی اے کیا۔ حضرت سلیمان ندوی (رح) کے مشورے پر پشاور یونیورسٹی سے 1954ء میں ایم اے عربی کی ڈگری اعلیٰ اعزاز کے ساتھ پائی ۔ دو سال بعد پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایم اے فارسی کی ڈگری بھی حاصل کرلی ۔ دینی تعلیم اپنے ہی محلے کی مسجد کے پیش امام حضرت سیدنورالاسلام باجوڑی سے حاصل کی ۔

شادی ۔ 1975ء میں مازرہ شبقدر کے مولانا سیّد فقیر اللہ شاہ کی دُختر نیک اختر کے ساتھ شادی کی۔ موصوف مہمانو اور متعلقین کی اچھی خدمت کرتیں اور ماہ رمضان میں معتکفین کا خوب خیال رکھتیٰں تھیں۔ البتہ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں ۔

معمولات۔ اپنے مکان پر عصر سے مغرب عام مجلس ہوا کرتی تھی۔ مولانا صاحب درس کلام پاک کے ساتھ وعظ و نصیحت فرماتے ۔ حاضرین کے سولات کے جواب دیتے۔ البتہ بروز جمعہ قرآن پاک کا ختم مبارک ہوتا اور پھر اجتماعی دعا پر محفل اختتام پذیر ہوتی ۔

لباس و خوراک۔ مولانا صاحب عام لباس شلوار قمیص قراقلی ٹوپی اور شیروانی زیب تن فرماتے اور موسم کے مطابق لباس و پوشاک استعمال فرماتے۔

مولانا صاحب کھانا کم تناول فرماتے۔ کبھی کبھی پائے اور حلیم کھانا بھی پسند فرماتے۔ کھانے کے بعد سبز چائے ضرور نوش فرماتے۔ تہجد اور اشراق کے نوافل کی ادائیگی روز کا معمول تھا۔ فجر کی نماز کے بعد خطوط کے جوابات ضرور خود یا کسی معتقد سے لکھواتے ۔ اشراق کے بعد قیلولہ بھی روز کے معمولات میں شامل تھا ۔

بیماریاں ۔ مولانا صاحب کو کئی بیماریاں اور عوارض لاحق تھیں ۔ 1952ء میں عمر کے ساتھ بڑھتی ہوئی پٹھوں کی شکست و ریخت کی لاعلاج بیماری سے واسطہ پڑا۔ جس کی وجہ سے سماعت، بصارت اور گویائی متاثر ہوگئی۔ چلنے پھرنے سے آہستہ آہستہ محروم ہوتے گئے ۔ معدے کی تیزابیت یعنی السر (زخم) عمر بھر کا درد سر رہا۔ خود فرماتے تھے ''ساری عمر قسما قسم بیماریوں کا شکار رہا۔ بدنی کمزوری، السر، دمہ اور الرجی وغیرہ۔ سماعت، دید او گویائی سب متاثر ۔ لیکن طاقت زبان کی حد تک اب بھی سلاست ہے ۔ کردگار تیرا شکر ، عنایت اور کرم ہے۔ جب تک زندہ ہوں۔ اسی سے تیرےدین کی خدمت جان و دل سے انشاء اللہ کرتا رہونگا ۔

ملازمت۔ مولانا مرحوم نے 1954ء میں اسلامیہ کالج میں بطور جونئیر لکچرر چارج سنبھالا۔ 1978ء میں عربی ڈپارٹمنٹ کے چیرمین مقرر ہوے ۔ 1985ء میں ملازمت سے ریٹائرڈ ہوے۔ بعد میں دو سال تک ملازمت میں توسیع کی گئی ۔

رہائش ۔ سروس کے اوائل میں اسلامیہ کالج کے مکان نمبر 10 میں رہائش پذیر رہے۔ بعد میں مکان نمبر14 میں منتقل ہوئے اور آخر میں ایک بڑے بنگلے 17- A میں تشریف لے گئے ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے مکان اشرف منزل شاہین کالونی بالمقابل اسلامیہ کالج میں ٓباد ہو ے ۔

سیاسی زندگی۔ مولانا صاحب نے قیام پاکستان اور اس کے قیام کے چند سال بعد تک مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قوم کی خدمت کی ۔مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل رہے ۔ مسلم لیگ کے خُفیہ ونگ کو بھی چلایا۔ گھر پر پارٹی کے پیغام کی تشہیر کے لیے ایک ریڈیو سٹیشن بھی قائم کیا ۔ لیکن پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ 1953ء میں سیاست سے دل مکمل طور پر بیزار ہوگیا اور اپنی تمام تر توجہ تبلیغ اور اشاعت دین پر دینی شروع کی ۔

سلاسل طریقت۔ وۃ چاروں سلاسل طریقت سے منسلک تھے۔ ان کے اولین پیر و مرشد سیّد سلیمان ندوی (رح) تھے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ عبدالعزیز

دعاجو (رح) کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی
اور ان کی رحلت کے بعد مہمند ایجنسی کے
حضرت مولانا فقیر محمد (رح) سے تعلق جوڑا اور
ان سے مزید فیض پایا۔

خلفاء۔ حضرت مولانا اشرف سلیمانی (رح) کے 25 خلفاء تھے۔ ان میں مولانا احمد جان غزنی خیل جیسے بیباک اور خوش بیان عالم و مقرر شامل تھے ۔

اسفار و حج ۔ 1955ء میں سفر ھند کیا ۔ 1957ء میں کئی
بیرون ملک تبلیغی سفر کیے ۔ اور اپنے تاثرات
اور کوائف کو تحریری شکل دی ۔ اور زندگی بھر
میں نو (9) حج کیے ۔

اخلاق و معمولات ۔ مولانا صاحب کی طبیعت میں تواضع، جود و سخا، دیانت، صبر، برداشت، مرّوت، عزم و استقامت، شجاعت اور طنز و مزاح کی خوبیاں ،

اوصاف اور اخلاقیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں ۔ مستجاب الدعا بزرگ تھے ۔ اس لحاظ سے جنتی پیر بھی کہلاے جا سکتے ہیں ۔

مسلکی تنگ نظری اور علمی تعصب ۔ ایک مبلغ اور کامل صوفی ہونے کی وجہ سے روایتا" تو مولانا صاحب کو مسلکی مسائل میں وسیع الخیال اور بالغ النظر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن افسوس ان پر دیوبندی اشرفی مسلک فکر کے سخت تقلیدی نظریات عمر بڑنے کے ساتھ ساتھ فزود تر ہوتے گئے مثلًا مشہور عالم اور مفسر قرآن سیّد ابو اعلیٰ

مودودی کی تحریروں کو ایمان شکن کہا ۔ ایک دوسرے اہم مبلغ اسلام اور مفسر ڈاکٹر اسرار مرحوم کو بار بار اان کے تقاضے کے باوجود وقت نہ دینا۔ نامور شیعہ عالم عارف الحسینی مرحوم کے لیے دعاے مغفرت سے یہ کہہ کرانکار کرنا کہ وہ صحیح مسلک پر نہیں تھے۔ اسی طرح بوہرہ فرقے کے پیشوا اور امام سیّد برہان الدین کو مروجہ ملکی اور بین الاقوامی لقب ''سید نا'' کی بجاے ''سیدھم'' کہہ کر پکارنا۔ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (رح) کے مزار پر پھولوں کی چادر پھیلانے اور خواجہ کے وسیلے سے ربّ کائنات سے دعائیں مانگنے کی صدیوں پرانی روایت سے صاف انکار کرنا چند مثالیں ہیں۔ اور ایسے اقدامات اتحاد او مؤدت بین المسلمین کی دعوت کے بھی خلاف تھے۔ بہرحال بزرگوں کی اپنی ایک شان طریق اور عادت ہوتی ہے اور یہ راز مرد، بزرگ ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے
مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

دینی معرکے۔ حضرت مولانا قدوس سرۃ تعالیٰ نے اپنی زندگی میں کئی دینی معرکے سر کیے۔ وہ وفاقی شرعی عدالت کے جج اور شوریٰ کے ممبر رہے۔ پشاور یونیورسٹی میں قادیانی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ منکرین حدیث کو جھٹلایا اور بے نقاب کیا۔ پشاور صدر

میں فری میسن لاج کی وسیع و عریض زمین پر مسجد درویش او مدرسہ امداد العلوم حکومتی رکاوٹوں کے باوجود تعمیر کیے۔ وفاقی شرعی عدالت اور مجلس شوراٰی میں شاتم رسول ﷺ اور رجم کی شرعی حد پر مدلل بحثیں فرمائیں۔

تصانیف۔ (۱) سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر اشاعت ۱۹٦۹ ء مکتبہ سرمدی

(۲) سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت تین جلد ۔ شائع ۱۹۸۱ء

(۳) فضائل اعمال کا فارسی ترجمہ

(۴) اکابرین علماء اور اولیاء پر شاہکار مضامین۔

(۵) اصلاحی خطبات (دو جلدیں)

(٦) شاتم رسول (ﷺ) کی شرعی سزا۔

(۷) قرآن و سنت کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے تقاضے

(۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داعیانہ اخلاق

اس کے علاوہ کئی کتابچے اور مقالات ان کے قلم گوہر بار سے معرض تحریر میں آتے اور چھپتے رہے۔غیر مطبوعہ مواد ڈ ھیر سارا موجود ہے۔

اولاد ۔ مولانا لاولد تھے البتہ ان کی والدہ صاحبہ دو بہنیں اور ایک بھانجی ان کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔

آخری آرام گاہ۔ یونیورسٹی کے عمومی قبرستان میں اپنی والدہ ماجدہ او ہمشیرہ مرحومہ کے ساتھ آپکی آخری آرام گاہ ہے۔یہ جگہ کافی عرصہ قبل انجنیرنگ کالج پشاور کے سابق پرنسپل عبیداللہ درانی صاحب نے اپنے لیے مخصوص کرواکر یہاں ایک قُبہ بنوالیا۔ جس کو یونیورسٹی طلباء نے مسمار کردیا تھا اور کافی کھلی جگہ درمیان میں خالی پڑی تھی۔ قبر کے سرہانے کتبے پر لکھی ہوئی تحریر یوں درج ہے ۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم فقل سلام علیکم، کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمہ و رحمتی وسعت کل شئ

حضرت مولانا محمد اشرف السلیمانی رحمہ اللہ الودود

پیدائش ٦ مئی ١٩٢۵ء بروز جمعرات ۔ وفات ١٩ ستمبر ١٩٩۵ء بروز منگل

آنکہ بخشد ہمیشہ مردہ دل را زندگی

کوچ کرد از دارِ محنت خوش بنعمت خانہ شد

ترجمہ ۔ وہ ہستی جو ہمیشہ مردہ دلوں میں جان ڈالا کرتی تھی۔ اس غم اور مصیبت گھر کو چھوڑ کر (دائمی) نعمت کدہ کی طرف چلی گئی۔

<u>مولانا محمد اشرف (رح) کے بارے میں میرے ذاتی تاثرات و مشاہداتَ</u>

مولانا محمد اشرف صاحب کو میں نے پہلی بار اغلباً ۱۹۶۱، ٦٢ ء کے دوران ان کی رہائش گاہ پر دیکھا۔ میرے بڑے بھائی الطاف حسین شاہ کے ان کے ساتھ معتقدانہ اور نیازمندانہ تعلقات تھے ۔ عصر کے وقت ہم دونوں وہاں پہنچے۔ ایک خوش شکل، شگفتہ خو اور ہنس مکھ درمیانی قد عمر کے ایک بزرگ سامنے گھٹنوں کے بل تشریف فرما تھے۔گرد ایک دائرے کی شکل میں چند دیگر نوجوان بھی مودبانہ سر جھکائے بیٹھے ہوے تھے۔ برادرم صاحب نے احتراماً دو زانو ہوکر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں نے ان کے اس فعل کی تقلید کی ۔ خیال رہے کہ مولانا بزرگوار جسمانی طور پر خاصے معذور تھے۔ کانوں کے سا تھ سُننے کے لیے آلہ سماعت بھی لگا رکھا تھا۔ اس پہلی نورانی محفل کی تفصیل تو مجھے یاد نہیں ___ صرف یاد ہے کہ مولانا پہلے آہستہ آہستہ دہیمے انداز میں اپنی گفتگو شروع کرتے۔ بعد میں ان کی آواز بلند ہوجاتی اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہانا شروع کردیتے ۔ درمیان میں کبھی کبھی اردو و فارسی کے اشعار بھی اپنے بیان میں پرودیتے۔ کلام اقبال کے تو گویا حافظ تھے۔ ایک بات یہ بھی میرے مشاہدے میں آئی کہ اس دوران اگر جلال اور شان کبریائی کا ذکر آتا یا حضور ﷺ کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا کوئی قصّہ آجاتا یا صحابہ کرام (رض) ، اولیاء عظام کی قربانیوں اور دینی حمیت کا تذکرہ آجاتا تو سنجیدہ ماحول کے گھمبیر سناٹے میں اچانک ان کی زبان سے بے ساختہ ''اللہ'' کا نعرہ مستانہ نکل جاتا۔ ان کی اس ادا کی ہیبت اور گونج ایسی لاشعوری ہوتی کہ مجھ جیسا کمزور اعصاب بندہ ڈر کے

مارے کانپ جاتا اور ایسے سامع مجلس کی غیر ارادی جنبش و حرکت مولانا مرحوم کے ہونٹوں پر ایک دلبرانہ مسکراہٹ طاری کردیتی ۔

ہمارے محترم بڑے بھائی جان بچپن ہی سے نماز، روزہ اور دیگر فرائض دینی کے بڑے پابند ہیں۔ اخلاق عالیہ، شرافت اور خاموش طبیعت کے مالک ہیں۔ مصلیٰ ان کے لیے تخت شاہی سے بڑھ کر ہے ۔ ان کی ابتدائی دینی اور روحانی تربیت میں ہمارے نانا جان مرحوم سیّد زمان شاہ (رح) ، بنوں کے حافظ شیرجان اور حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی (رح) کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ اپنی سوانح حیات ''حدیث نامہ بر'' میں مولانا اشرف نوراللہ مرقدہ کی شخصیت، محبت او فیض کا ذکر یوں کرتے ہیں: ''محمد اشرف صاحب اسلامیہ کالج میں عربی کے استاد تھے۔ ہماری فارسی اختیاری کے استاد جب کبھی چھٹی پر ہوتے تو اشرف صاحب ہماری کلاس کو بھی پڑھا لیتے۔ ان کی فصاحت و بلاغت کے تو ہم اس دن سے معتقد ہوے جب کالج کے ڈین صاحب ریٹائرڈ ہوگئے اور ایک دن مولانا محمد اشرف صاحب کی مُبلغانہ تقریر ہم نے سُنی۔ وہ بلا شُبہ ایک عظیم انسان اور جیّد عالم تھے۔ ہمارے دوست ظفر بیگ بیٹھنی کی تجویز پرہم چند دوستوں نے مولانا صاحب سے قرآن پاک کا درس لینے کا فیصلہ کیا۔ جس کے لیے انھوں نے حامی بھر لی۔ ظفر بیگ جو ایک ذہین و فتین مگر متلاطم شخصیت کا مالک تھا، نے خود تو چند دِن تک ہمارا ساتھ دیا لیکن میں اور فتح محمد کافی عرصہ تک مولانا صاحب کے حلقہ درس او صحبت صالحہ سے

فیض یاب ہوتے رہے۔ اُن ہی کی دولت گاہ پر ہمیں کئی اکابرین سے ملنے اور ان کی عالمانہ گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ ان ہی میں مشہور صاحب تصنیف و تالیف مولانا امین الدین احسن اصلاحی اور تبلیغی جماعت کے حاجی عبدالحمید (ڈائریکٹر جنرل ٹیلیفون و ٹیلی گراف) اور حاجی ارشد صاحب شامل تھے۔ یہ عقدہ تو کافی دیر بعد ہم پر کھلا کہ مولانا اشرف صاحب تو تحریک پاکستان سے بطور سالار پاکستان مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور مولانا الیاس صاحب (رح) کی تبلیغی جماعت سے بحیثیت ایک عظیم مبلغ کے وابستہ رہے تھے ۔ ان ہی دنوں ہندوستان سے مولانا الیاس (رح) کے بیٹے اور جانشین مولانا محمد یوسف صاحب پاکستان آے ۔ ان سے ملنے اور ان کی مواعظ حسنہ پشاور کے تاریخی مسجد مہابت خان میں سننے کا موقع ملا اور بعد ازاں مولانا اشرف کی قیادت میں رائیونڈ میں بین الاقوامی اجتماع میں شریک ہوئے ۔ مولانا صاحب عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی و پیر بھی تھے۔ اور صوفیاء کے چاروں سلسلوں میں بیعت بھی تھے۔ ان کے ان متنوع حیثیتوں کے بارے میں بھی دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز میں ہماری معلومات میں اضافہ فرماتے۔ ان کا دولت کدہ مرجع خلائق تھا۔ لیکن ہمارے درس کے اوقات بالکل جدا تھے۔ بعد میں حج پر جانے اور طویل علالت کی وجہ سے ہم مزید ان کی صحبت سے مستفید نہ ہو سکے۔

ہمارے ریاضی کے استاد افتخارالدین خٹک مولانا صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ لیکن دونوں کے مشاغل اور

دلچسپیوں میں بُعد المشرقین تھا۔ افتخار صاحب اچھے ریاضی دان ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری اور فنون لطیفہ سے بھی شغف رکھتے تھے ۔ لیکن دونوں پڑوسیوں کا ایک دوسرے کے لیے باہم احترام کا رشتہ ضرب المثال تھا۔ ’’

ان کے اس بیان کی تصدیق ‘‘تذکرہ و سوانح حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی (رح)’’ کے مصنفین اور مؤلفین نے بھی حرف بہ حرف کی ہے۔ اب میں حضرت مولانا صاحب کے چند واقعات اور ارشادات اپنی پشتو تصنیف ‘‘د استاذانو لعل او کُتی لعل’’ (اساتذہ کے فرمودات سچے اور جعلی موتی) سے اردو ترجمہ کرکے بیان کرتا ہوں۔ جس میں علم و حکمت، وعظ و نصیحت، علم و معرفت او طنزو مزاح کے کئی نکتے پوشیدہ ہیں۔

(۱) حضرت مولانا محمد اشرف صاحب اسلامیہ کالج میں عربی کے استاد اور تبلیغی جماعت کے امیر تھے۔ ہر شام ان کے ڈھیرے پر ایک تبلیغی محفل منعقد ہوتی تھی۔ مختلف الخیال بزرگ پروفیسر اور نوجوان طالب علم شریک محفل ہوتے، کبھی کبھی مولانا صاحب سے سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا۔ مولانا صاحب ایک متقی اور دیندار شخصیت ہونے کے ساتھ ایک ہنس مکھ، شائستہ مزاج اور حس مزاح کے مالک انسان بھی تھے ۔ ایک روز انگریزی ادب کے استاد عبد الصمد صاحب انسان کے ارتقائی نظرئیے کی وکالت کر رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کے سر ورق پر بندروں او چمپینزیز کی تصویریں تھیں۔ صمد صاحب نے

کتاب کا سرورق مولانا صاحب کو دکھا کر کہا ‘‘مولانا یہ ہمارے ابا و اجداد ہیں ’’ مولانا صاحب نے مسکرا کر فرمایا ‘‘کسی کے ہونگے ہمارے تو نہیں ’’ نوجوان لڑکے اس جیسے چبتے فقرے کے طنز کو بوجھ گئے اور زور سے ہنسے ۔ صمد صاحب اس بات کا بُرا مان گئے اور ذرا غُصے سے مولانا صاحب کو مخاطب ہوے ‘‘آپ نے بھی تو اپنے گرد بندر اکٹھے کر رکھے ہیں (بندروں کا تماشا لگا رکھا ہے) ’’

(۲) جیسے پہلے عرض کرچکا ہوں میرے برادرِ بزرگ الطاف حسین شاہ بھی مولانا صاحب کے معتقدین اور نیازمندوں میں سے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اکثر ان تعلقات میں بے تکلفانہ رنگ بھی شامل ہوجاتا۔ ایک دفعہ مولانا صاحب کے پڑوس میں اُن کا سابقہ گھر ایک مشہور شاعر اور استاد کو الاٹ ہوا۔ جو شراب و شباب کا شغل فرمانے کے لیے مشہور تھے ۔ ایک شام مولانا صاحب کالج انتظامیہ کی اس ستم ظریفی کا گلہ کرنے لگے تو فرمایا: ‘‘جس مکان میں صبح شام قال اللہ اور قال الرسول کی بابرکت محفلیں جمتی تھیں وہاں اب قلقل مینا او جام و ساغر کے کھڑکنے کی آوازیں آتی ہیں۔’’ بھائی جان، جو ان کے ساتھ پہلو میں بیٹھے ہوے تھے،نے فی الفور اس اردو مصرعے کی گرہ لگا دی ۔

صــ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے ۔

مولانا بصد کوشش اپنی مسکراہٹ نہ روک سکے۔

(۳) ہمارے یہ بھائی جان چند مہینوں تک کیڈٹ کالج میں استاد رہے ۔ ایک روز مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے ۔ مولانا صاحب کی وعظ و نصیحت کا اپنا ایک انداز تھا۔ اپنے مربیانہ شفقت کے اس مبلغانہ انداز میں استفسار فرمایا ‘‘الطاف آج کل کیا کام کرتے ہو۔ ’’ بھائی صاحب نے جواب دیا: ‘‘ حضرت کیڈٹ کالج میں استاد ہوں ’’ مولانا صاحب نے فرمایا: ‘‘بھائی یہ استادیاں مستادیاں کرتے رہو’’ اب اس سے پہلے کہ مولانا صاحب اپنے مخصوص انداز میں پندونصیحت کی باتوں کے لیے تمہید باندھتے۔ بھائی جان نے پیش بندی کا یہ وار کیا اور قدرے فدویانہ، خفگی، شکایت اور شوخی کے انداز میں کہا: ‘‘حضرت خدا را اب گالیاں تو نہ دیں’’ مولانا صاحب اپنی زبان سے نکلے اردو محاورے کی نزاکت کو جان گئے۔ قدرے زور سے ہنسے اور فرمایا: ‘‘الطاف ! تُم تو کبھی کبھی ہم اہلِ زبان کو بھی مات دے جاتے ہو۔’’ یاد رہے کہ مولانا صاحب اصل میں تو مہمند پشتون تھے لیکن کافی عرصہ، دھلی، شملہ اور آگرہ میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے ان کی مادری زبان اردو تھی۔ اور استادیاں مستادیاں کرنا ایک اردو محاورہ ہے جو زیادہ چالبازیوں او مکروفریب کرنے کے قبیح معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۴) ۱۹٦۰ سے ۱۹۷۰ کی دہائی میں سوشلزم کا نظریہ نئی نسل میں خاصا مقبول تھا۔ ترقی پسند طالب علموں نی اپنی جیبوں پر ایسے تمغے (بیجز) ٹانکے ہوتے تھے۔ جن پر ماوزے تنگ کی شبیہہ کندہ ہوتی تھی اور ساتھ چئیرمین ماؤ کے اقوال پر مشتمل ‘‘ریڈبک’’ پھیراتے نظر آتے۔

جواب میں جمعیت طلباء والوں نے ‘اللہ اکبر’’ کے تکمے نکالے۔ مولانا صاحب نوجوان نسل میں سوشلزم اور لادینیت کے اس سیلاب سے دلگیر اور افسردہ تھے۔ کبھی کبھی فرماتے کہ ‘‘ہماری نوجوان نسل کو کیا ہوگیا ہے ہر وقت موذی کی ٹانگیں لٹکائے پھرتے ہیں۔

(۵) مہربان سکول کے دنوں سے میرا دوست او ہم جماعت تھا۔ ان دنوں انجنئیرنگ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ مولانا صاحب کے تذکرہ و سوانح لگار مؤلفین نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ مولانا صاحب کے بڑے قریب تھے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا تعلق اسلامی جمیعت طلباء کے صدر ڈاکٹر کمال آف مرغز سے جُڑ گیا اور اس وجہ سے مولانا صاحب سے اس کے تعلقات میں دوریاں پیدا ہوگئیں ۔ جب کافی دن غائب رہا تو کسی نے جا کر مولانا صاحب کو خبر دی کہ مہربان دامن چُھڑا کر کسی اور کا ہوگیا ہے۔ تب مولانا صاحب نے اس دلخراش خبر پر یوں تبصرہ فرمایا: ‘‘ہاں! یہ جماعت اسلامی والے ہم سے تیار نوالے چھین لیتے ہیں۔’’

(٦) یہ کائنات حادث ہے یا قدیم ؟ اس میں پیش آنے والے واقعات کاتب تقدیر کے ہا تھوں سے ازل سے لکھی ہوئی تحریریں ہیں۔ یا پھر یہ اچانک وقوع پذیر ہونے والی مادی حوادث ہیں؟ یہ فلسفہ کے پرانے سولات ہیں۔ مولانا صاحب فرماتے تھے ‘‘جسے تم حادثہ کہتے ہو وہ میرے مولا کی سوچی سمجھی سکیم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مولانا صاحب روحانی وارفتگی کی عالم میں مولانا اشرف علی تھانوی (رح) کے ایک خلیفہ عزیز الحسن مجذوب کا

ظاہری او باطنی حسن سے سنگار کردہ اور مزّین یہ عارفانہ شعربار بار پڑھتے اور اس طرح مجازی او حقیقی عاشقوں کے دلوں کے زخموں پر مرہم رکھتے جاتے تھے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی

اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

(۷) ایک روز میں نے ان سے درخواست کی: ‘حضرت! سلوک میں جب تک اجازت عطا نہ ہو۔ بندہ ناقص ہی ہوتا ہے۔ آپ مجھے بیعت فرمائیں۔ فرمایا: ‘‘ بیعت تو نہیں دے سکتا ۔ فی الحال وظیفہ بتا دیتا ہوں۔ ’’ اور اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک کلمہ کا ورد کرنے کی تاکید فرمائی ۔ اسی موقع پر انہوں نے ساتھ ہی فرمایا ‘‘ الطاف (میرے برادربزرگ) کی طرح تم بھی ہمیں بھول جاو گے ۔ ’’اور شومی قسمت وہی ہوا ۔ جو حضرت نے فرمایا تھا۔ ان کی مجالس میں جانے کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔ اور آج جب حضرت کی شخصیت اور فیض پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو یہ واقعہ بھی حسرتاً بمع اس شعر کے یاد آگیا:

ھے کس قدر عجیب محبت کا سلسلہ

بنتا رہا، بگڑتا رہا، ٹوٹتا رہا

(۸) ایک بار میری ناف کے نیچے ایک بڑا پھوڑا نکل آیا ۔ دوائیوں سے علاج کرتا رہا لیکن ‘‘درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ’ درد کی شدت اتنی بڑھ گئی کہ میں

یونیورسٹی کی سڑکوں پر نیم بے خود گھومتا رہا۔ بے خیالی میں میرا رُخ مولانا صاحب کے آستانے کی طرف ہوگیا۔ مولانا صاحب تشریف فرما تھے۔ شدتِ درد سے بے تکلفاً اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ اور تقریباً روتے او چیختے ہوے اپنی تکلیف بیان کی ۔ مولانا صاحب نے ایک ہاتھ سے مجھے سنبھالا اور دوسرا ہاتھ دکھتے ہوے پھوڑے پر رکھا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ میں اس نیم بے ہوش غنودگی کی حالت سے اس وقت نکلا جب مولانا صاحب کی یہ مدھر بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''بیٹا کچھ افاقہ ہوا'' میں نے ''جی'' کہہ کر سر ہلایا۔ صبح پھوڑا پَک کر پھٹ چکا تھا۔ اور بستر میں زہر بکھرا پڑا تھا۔ آج اتنے بڑے پھوڑے کا نشان تک باقی نہیں ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ میرے چیخ و پکار اور ذہنی پریشانی کو دیکھ کر ایک بار مولانا صاحب نے فرمایا، '' بیٹا! اب آپ کے علاج کے لیے ہمیں ذہنی اور نفسیاتی امراض کا ہسپتال کھولنا پڑے گا۔''

(۹) انسانی زندگی میں آلام و آزمائش کے دور آتے رہتے ہیں۔ لیکن سالک کے لیے ایسے امتحانات روحانی عروج کا باعث بنتے ہیں۔ مولانا صاحب تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبت صوفی بزرگ بھی تھے۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ تبلیغ ایک تحریک ہے اور تصوف میں تبلیغ اور سلسلہ طریقت جویاے حق میں شخصیت پرستی کا رجحان پیدا کردیتا ہے ۔ اور اس شخصیت اور مرشد پرستی کی رو میں بہہ کر مخلص بندہ تحریک کے اصل مقاصد سے دور

جا پڑتا ہے۔ وہ اکثر تحریک کو توجہ دینے کے بجائے شیخ سے عقیدت اور مرشد کے آستانے سے اِستفادے کو زیادہ ترجیح دیتا ہے ۔ ۱۹۷۷ عیسوی کے لگ بھگ انھی اختلافات او غلط فہمیوں نے پہلے ایک سازش اور بعد میں بُہتان کی شکل اختیار کی۔ نتیجتاً اس فتنے نے مولانا صاحب کے حساس قلب پر دائمی ضرب لگانے کے ساتھ مقامی تبلیغی کام کو کافی نقصان پہنچایا۔ان کے پاک دامن پر بھی چھینٹے پڑے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان الزامات کے پیچھے ان ہی کے ایک پُرانے رفیق کار کا ہاتھ تھا۔ جنہوں نے آخر میں مولانا صاحب سے معافی مانگ لی۔ لیکن اس وقت الزام تراشی، فتنے اور بہتان کا ذکر و اثر تا دیر قائم رہا۔ ان کا ایک معتقد ہونے کی وجہ سے راقم الحروف کو بھی کافی صدمہ پہنچا۔ اور اس کے اثرات کے تحت کچھ عرصہ بعد میں نے ‘‘تصوف اور جنس ’’ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جو پشاور یونیورسٹی کے ماہنامہ ‘‘پشتو’ کے جنوری۱۹۸۳عیسوی کے شمارے میں چھپا اور میری تصنیف ‘‘انوارِ چراغ’’ مطبوعہ ۱۹۹۱ع میں بھی موجود ہے ۔

(۱۰) ایک دفعہ حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ سے اپنے مطالعہ کے لیے ایک زود فہم اچھی اردو تفسیر قرآن کے بارے میں دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مولانا مودودی صاحب کی تفسیر ‘‘ تفہیم القرآن ’’ کا نام لیں گے ۔ جو نسلِ نو کے اذہان کو زیادہ اپیل کرنے کی شہرت رکھتی ہے ۔ لیکن انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی مشہور تفسیر ‘‘بیان القرآن’ کا ذکر کیا ۔ اور فرمایا ہ یہ

اردو کی احسن تفسیر ہے۔ یہ تفسیر چونکہ میری نظر سے گذرچکی تھی اور سچی بات یہ ہے کہ اس انمول تفسیر کی ترتیب، زبان، تفسیری باریکیاں، علمے نکات اور ذہنی اشکالات کی سمجھ میری ذہنی استعداد سے باہر تھی۔ اس سے میرے خیال میں مستند علماء کرام اور فضلاء بہتر مستفیذ ہوسکتے ہیں۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا، ‘‘حضرت وہ تو میرے لیے یونانیت ہے۔ ’’ البتہ ان کے مواعظ و ملفوظات کی کتابوں اور تصنیف ‘‘بہشتی زیور’’ کو میں نے شوق سے پڑھا ہے۔’’ میری ان بے تُکی اور شاید جاھلانہ باتوں کو سُن کر بہ ظاہر تو ان لبوں پر مسکراہٹ آئی مگر ان کی اندرونی حیرت اور کرب کو میں نے اس وقت بھی محسوس کیا ۔

(۱۱) ۔ جیسے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا صاحب نے نوجوان عمر سے ہی ملک کی جنگ آزادی اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا۔ وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار تھے۔ اور احتجاجی جلسے اور جلوسوں میں شد و مد سے آگے آگے رہے۔ ڈاکٹر فدا صاحب جو ان کے نامور خلیفہ اور جانشین ہیں، سے ایک ادبی مجلس میں یہ واقعہ مولانا صاحب کی زبانی سُنا کہ ایک بار پشاور میں دفعہ 144 نافذ تھی، پولیس نے ایک باڑ لگا کراس مقام سے آگے بڑھنے سے روکا۔ سب سے پہلے جس شخصیت نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ممنوعہ حد کو پار کیا، وہ امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف (ح) تھے۔ اور دوسرے سرے پر شدید فائرنگ کی بارش میں حضرت مولانااشرف صاحب میدان میں کود پڑے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

(۱۲) ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یا بھائی جان سے سنا ہے کہ علامہ پرویز اپنی اوائل زندگی میں دہلی میں حضرت مولانا کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان دنوں پرویز صاحب نے چند دینی مسائل پر ایک بے ضرر سا کتابچہ لکھا اور سب ساتھیوں کے ساتھ مولاناصاحب بھی خوشی سے پھولے نہ سماےء تھے کہ ان کے ایک دوست نے ایسی قلمی ہمت کی ہے ۔ افسوس غلام احمد پرویز صاحب بعد میں اجتہاد ، تحقیق اور تنقید کے زُعم میں اتنے بے راہ ہوے کہ منکرِ حدیث ٹھرے ۔ ان کی کتاب ‘‘ لغات القرآن ’’ کے بارے میں حضرت مولانا صاحب نے بعد میں صاف لکھ دیا کہ یہ تحریف و تاویل فاسدہ کا پلندہ، لغت نویسی سے مذاق اور تلمیح و دجل کا مرکب اور پرویزی حیلہ گری کا نمونہ ہے۔

(۱۳) ۔ قادیانی اور مرزائی فتنوں کے شدید مخالف تھے۔ اینٹی احمدی تحریک کے دوران اس جماعت کی مکمل بیخ کنی کے لیے نوجوانوں کو انتھک جدوجھد کرنے کی تاکید کرتے تھے ۔ بطور مثال وہ تحریک آزادی کے دوران اپنی خُفیہ کاروائیوں اور چھاپہ مار سرگرمیوں کا اکثر ذکر فرماتے ۔

(۱۴)۔ مولانا صاحب اگرچہ خود عربی زبان و ادب کے استاد کامل تھے۔ مشہور عالم دین تھے۔ لیکن قرآن پاک ناظرہ بچوں کو کسی قاری سے پڑھوانے کی تاکید کرتے ۔ خود فرماتے تھے کہ بچپن میں قرآن پاک اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا ہے ۔ اس لیے اب تک قرآنی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کرسکتا ۔ واللہ اعلم۔

(۱۵) ۱۹٦۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ایک رات میں نے اپنے دوست مہربان کے ساتھ مولانا صاحب کے آستانے پر گذاری۔ کسی معتقد نے امرودوں کی ایک پیٹی تحفتہً مولانا صاحب کی نذر کی تھی ۔ میں اور مہربان عصر سے یہی امرود کھاتے رہے ۔ میں نے مہربان سے مزاحاً چوٹ کرتے ہوے کہا ۔ "مہربان یار! تم نے تو یہی میٹھے امرود نوشِ جان کرنے کے لیے مولانا صاحب کے ہاں ڈھیرہ لگایا ہے۔ " سحری کے وقت تہجد کے ساتھ قنوط ناززلہ پڑھی۔ امام صاحب نے جوش میں آکر "جیوش الکفر" کی جگہ 'جیوش الہند" پڑھ کر اجتہاد سے کام لیا۔ نماز پڑھ کر کسی نے کہا کہ امام نے قرآن پاک اور احادیث سے باہر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہماری نماز نہیں ہوئی۔ مولانا صاحب کامل عالم ہونے کے باوجود فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے۔ دو لڑکے پڑوس میں مولانا عبدالقدوس صاحب قدس سرہ ، جو جماعت اسلامی کے سابقہ امیر قاضی حسین احمد کے بڑے بھائی اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور شعبہ دینیات کے چیئیرمین تھے، کے ہاں مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجے گئے۔ انھوں نے فتویٰ دیا کہ نماز دوبارہ پڑھی جاے ۔

(۱٦) مولانا صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ایک دن میں ان کی زیارت پر گیا ۔ دیکھا کہ مزار کے احاطے میں ایک ملنگ بیٹھا تھا۔ میں نے نادانی میں یہ سمجھا کہ شاید شکرانے اور نذرانے بٹورنے کے لیے کسی مجاور نے یہاں قبضہ جما لیا ہے، جو ہمارے بزرگوں کے

مزارات پر عام رواج ہے ۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا، ‘‘آخر آپ لوگوں نے بھی کاروبار شروع کردیا’’ جن بدعات کے خلاف مولانا صاحب ساری عمر تبلیغ اور جد وجہد فرماتے رہے۔ ’’ ساتھ ہی جیب سے پچاس روپے کا ایک نوٹ اس کو دینے کے لیے آگے کردیا۔ ملنگ جو زبان سے توتلا اور مجذوب تھا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے زور سے سر ہلایا اور جھٹک کر نوٹ لینے سے سراسر انکار کردیا۔ ساتھ ہی کہا اس علاقے میں تین غوث گذرے ہیں، ایک یہ ہیں اور قبر کی طرف اشارہ کیا، دوسرے کا نام میں بھول گیا ہوں اور تیسرے کوئی اور ہیں۔ ’’ میں نے ان کی بلندئ درجات کی دعا مانگی اور دل میں یہ شعر پڑھتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔

کیمیا است عجب بندگئ پیرِ مغاں

خاک در گشتم و چندیں در حاتم دادند

کتب حوالہ جات :

۱ ۔ تذکرہ و سوانح حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی۔

تصنیف و تالیف۔۔ ڈاکٹر میر حاتم، ڈاکٹر شیر حسن، ڈاکٹر سراج سواتی

۲۔ دودِ چراغ ۔ مصنف ڈاکٹر چراغ حسین شاہ ۔

۳۔ نالیدلے بلا ۔ ایضاً

۴۔ کُلیاتِ اقبال

۵۔ مسدس حالی

٦۔ حیات قادر ---- عبیداللہ دُرانی

۷۔ وِدر ائ سادھو ۔۔ ایضاً

۸۔ دے ایوالوشن اف فیتھ ۔ ایضاً

۹۔ چار اسلام۔ ایضاً

۱۰۔ حدیث نامہ بر ---- مصنف سید الطاف حسین شاہ

۱۱۔ سلوک سلیمانی --- مصنف مولانا محمد اشرف سلیمانی

۱۲۔ وکی پیڈیا ڈاٹ کام

نوائے سروش

جو بات میرے دل میں ہوتی ہے وہ اس کے نوک زبان پر ہوتی ہے۔ خیالات میرے لیکن تحریر کسی ناآشنا انسان کی ہوتی ہے۔ یہ انسان عورت ہے یا مرد ، بوڑھا ہے یا جوان، حقیقت ہے یا سراب یا پھر محض ایک ہیولہ؟ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ بہرحال جو کوئی بھی ہے میرے ساتھ سائے کی طرح چلتا ہے۔ میرے اعصاب پر سوار ہے۔ میری رگ رگ اور نس

نس میں دوڑ رہا ہے۔ میرے ساتھ ایک برابر علم، تجزیے اور مشاہدے کا مالک ہے۔ ایک فرق صرف یہ ہے کہ میرے خیالات گڈ مڈ بکھرے اور ابر آلود ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ خیالات اس کی تحریر کی قید میں اتے ہیں تو واضح صاف اور روشن ہوجاتے ہیں۔

میں توتلا ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ فصیح اور بلیغ بیان ہے۔ میری تحریر میں وقفے اور سکتے ہوتے ہیں۔ اس کی لکھائی روان اور بے عیب ہے۔ میری تحریر خُشک کُھردری اور سادہ ہے۔ اس کی تحریر رنگین، میٹھی اور مسجع ہے۔

ایک بات اور ہے ۔یہ ہر کوئی جو ہے۔ لیکن بے ادب، بے لحاظ اور بے قدرہ نہیں ہے۔ اپنی ہر تحریر میں میری اپنے پیر، استاد اور افسر کی طرح قدر کرتا ہے۔ میرے ساتھ ایک پرائیویٹ سیکرٹری، ترجمان، شارع اور مفسر کی مانند کام کرتا ہے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ نہ ہی وہ مجھے دکھائی دیتا ہے ۔ نہ میں اس سے بات کرسکتا ہوں اور نہ ہی اسے میں محسوس کرسکتا ہوں۔ یعنی میرے حواسِ خمسہ میں نہیں سما سکتا۔ اس زور آور مُنّہ پٹ شوخ انسان نے مجھے اپنے اور بیگانے دونوں کے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ کیونکہ میں ہر وقت اسی کے بارے میں سوچھتا

رہتا ہوں اور اس کی تلاش میں سرگردان پھرتا ہوں۔

مسجد کے مولوی صاحب سے بغرض مشورہ ملا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تمہارے نفس امارہ کا قصور ہے۔ کسی نے تمہارے اوپر تعویذ کیے ہیں۔ یہ تشت لے لو۔ اس کی دہونی لو۔ اللہ تبارک و تعالی اپنے نظر و کرم اور پیر و مرشد کے صدقے یہ شیطانی وسوسہ تیرے دل سے نکال باہر کر دے گا۔ استاد محترم یہ شیطانی وسوسہ نہیں ہے۔ کوئی جعل ساز میرے نام اور خیالات کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ ایک ادیب، شاعر اور مصنف مجھے خط لکھتا ہے۔ مجھ سے چند سوالات اور استفسارات کرتا ہے۔ ابھی ان سوالات کے جوابات میرے ذہن میں ہوتے ہیں کہ یہ خوش مزاج جو اپنا نام دُرِ مکنون پلوش لکھتا ہے ۔ یہ سب کچھ میرے ذہن کے پردے سے کھرچ لیتا ہے۔ اور میرے حوالے سے اپنی دستی تحریر میں اس ادیب کو ارسال کردیتا ہے۔ چند دنوں بعد جب وہ ادیب یا دانشور مجھے سرِ راہ بازار یا محفل میں ملتا ہے ۔تو میں بڑی معذرت سے اس سے کہتا ہوں "بھائی صاحب! معذرت خواہ ہوں۔ میں بہت سُست اور کاہل ہوں۔ میں وقت نہ نکال سکا۔ آپ کا خط موصول ہو چکا تھا لیکن میں نے اس

کا جواب دینے میں کافی دیر کر دی۔ اب انشاء اللہ اس پر بات کرلیں گے۔"

وہ دوست مجھے تعجب اور حیرت سے دیکھتا ہے۔ جناب! آپ کے پاس اتنا وقت اور فرصت کہاں ۔ ہر روز بے شمار خطوط آپ کے نام آتے ہیں۔ کس کس کو یاد رکھیں گے۔؟ کل صبح ڈاکیا آپ کا خط میرے حوالے کر گیا۔ بس خط پر آپ کے ذاتی معاون (پی اے) دُرِ مکنون پلوش صاحب نے دستخط کیے تھے۔ میرے سوالات کے جوابات دینے میں آپ نے بڑی محنت ، مغزخوری اور سردردی سے کام لیا ہے۔ اتنا مطالعہ، مشاہدہ، مغزماری اور پھر ہم جیسے درجہ سوم کے ادیبوں کو یاد رکھنا آپ کی اعلی ظرفی کا ثبوت ہے۔

وہ ادیب میری خوبیاں بیان کرنے میں مبالغے کے حدود پار کر لیتا ہے اور ادھر میں اپنی ناکردہ بھلائی کی داد پانے کے نتیجے میں ندامت سے پانی پانی ہوجاتا ہوں۔ دل ہی دل میں ایک دیگ کی مانند اُبلتا ہوں۔ دہوکہ باز، مردود۔ ملعون۔ جعل ساز۔

استادوں اور عالموں کے بعد میں عاملوں کے ہاں گیا۔ وہ کہتے ہیں یہ سارا کیا دھرا تمھارے ہمزاد کا ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ایک ہمزاد لگا ہوتا

ہے۔ یہ ہمزاد کبھی کبھی گمراہ، باغی اور سرکش ہوجاتا ہے۔ انسان کا تابع نہیں رہتا اور پھر ایسے انہونے کارنامے سرانجام دیتا ہے ۔تم ایسا کرو کہ ہر صبح بستر سے اُٹھنے کے بعد فورا" آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو ۔مُنہ بناؤ ۔ ماتھے پر شکن اور بل ڈالو۔ پلکوں کو جُنبش دو اور ایسے عکس سے کہو "تم میرے حکم کے غلام ہو۔ تم میرے تابع ہو۔ تم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تم صرف وہی کام کروگے جس کا حکم میں تمہیں دوں۔"مہینے بعد یہ ہمزاد ایک بار پھر تمہارا تابع ہو جائے گا۔ لیکن اس قسم کا عمل بھی اس ان دیکھی بلا کو میرا تابع نہ کرسکا۔ فرق صرف اتنا آیا کہ ذرا اور دلیر ہو گیا۔ اب میری طرف سے سوال کُننده کو جواب قسطوں میں دیتا ہے۔ مطلب وہی پرانا کہ ذہن اور خیالات میرے لیکن قلم اور تحریر پرائی ۔

ماہر نفسیات صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟۔کیا آپ میرے ساتھ ہونے والے واقعے اور مسئلے کی عقده کشائی پر قادر ہیں کہ نہیں؟ ماہر نفسیات صاحب نے اپنے کانوں کو سکھیڑا، عینک کے شیشوں کو اوپر نیچے کیا۔ مجھے غور سے گھور گھور کر دیکھا۔ مجھے وه اور اُسے میں مفقود العقل نظر آیا۔ نوجوان یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ اس کا علاج دوا سے کم اور تحلیلِ نفسی سے

بہتر ہوتا ہے۔ اس کے لیے مشورے اور نفسیاتی مشقوں سے کام لیں گے۔ اس کے لیے وقت چاہیے۔ آپ ہر اتوار صبح نو بجے آئیں اور مجھے تقریبا ایک گھنٹے کا وقت دیں۔

میں ہر اتوار کی صبح اس کے پاس جاتا۔ دونوں سبز چائے نوش کرتے۔ وہ مجھ سے تقریبا ایک گھنٹے تک پوچھ گچھ کرتا۔ بچپن سے لے کر اس وقت تک کے تمام ظاہر و باطن کے احوال پر گفتگو ہوئی ۔چار ہفتوں کے بحث اور تفتیش کے بعد اس نے یہ رائے دی کہ وہ مجھے ہپناٹایز کریگا۔ میرے شعور کو سُلائے گا تاکہ میرے لاشعور کا مطالعه اور تجزیه کرسکے۔ ساتھ هي اس نے شعور، لاشعور اور تحتُ شعور کے موضوع پر ایک لمبی چوڑی بحث کی۔ اگلے هفتے اس نے مجھے میز پر لٹایا۔ "اچھا اب تم آنکھیں بند کرلو۔ وجود کو ڈھیلا چھوڑ دو۔ سانس زور زور سے لو۔ اب سانس کو معمول پر لاؤ۔ تمھیں نیند آرهي هے۔ تم چھ ساله کے بچے هو۔ سکول کو جا رهے هو۔ تمھارے بغل میں ایک بسته هے۔

میں کب سو رها تها۔ بس اس کي دلجوئی کی خاطر آنکھیں بند کرکے دم سادھ خاموش لیٹا رہا۔ چند ہفتے تک ورغلانے کے بعد اس نے فتوی' دیا کہ "بچپن کے کسی حادثے کے اثر کی وجہ سے تمھاری شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ تُم

ہر عمل لاشعوری طور پر کر رہے ہو۔ یوں سمجھو کہ بعض لوگ نیند میں اُٹھ جاتے ہیں اور چل کر کوئی کام کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر گہری نیند سو جاتے ہیں۔ صبح انھیں خود پتہ نہیں ہوتا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔"

" لیکن جناب عالی! یہ تحریر میری نہیں ہوتی۔ میری تحریر بڑی پُختہ اور سیدھی سادی ہے۔ لیکن اس لکھائی میں کافی نزاکت او تصنع ہے۔ کسی خاتون کی لکھائی نظر آتی ہے۔ جو بائیں طرف جھکائی کی حامل ہوتی ہے۔" میں بولا۔ فرمانے لگے ۔" کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ہر مرد انچاس فیصد عورت ہے۔ خواب میں آپ کی مخالف اور متضاد جنس متحرک ہو جاتی ہے۔ علاج تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ روز جب تم بستر پر لیٹ جاتے ہو ۔تو اپنے ساتھ زور زور سے یہ جُملہ دھراتے رہو۔ "یہ میں ہوں۔ میں ایک ہوں۔ میری شخصیت دُھری نہیں ہے۔" مہینے آدھ میں تمھارے وجود اور شخصیت کی دوئی ختم ہو جاے گی۔" لیکن مرض یا جن۔ میں "میں" نہ رہا۔ ہر شے "وہ" ہوگیا۔ حالات اس حد تک بگڑ گئے کہ خط چھوڑو میرے سارے مضامین، مقالے، افسانے اور اشعار اسی ان دیکھی بلا کے تحریر کردہ ہوتے ہیں۔ ایک مضمون یا شعر کا خیال اور مضمون خام حالت میں میرے ذہن میں سما

جاتا ہے اور چند دنوں تک اوارہ بادل کی طرح اس میں قلابازیاں کھاتا رہتا ہے۔ اچانک ہفتہ دو کے بعد اس شوخ فطرت آشنا کے قلم سے رسالوں میں شائع ہوجاتا ہے۔

ایک ادیب دوست نے جو میرے کافی قریب ہے، نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے یہ "دُرِ مکنون پلوش" تمہارا قلمی نام ہو۔ تم ادیب ہو۔ تمہارے لیے ایک قلمی نام ضروری تھا۔ یہ قلمی نام تمہارے لاشعور نے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ شُکر کرو بڑا خوبصورت، پیارا، بامعنی اور ادبی نام ہے۔

استغفراللہ قلمی نام ادیب خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ یہ اُلٹا سیدھا، بے سود اور بے زبان نام مجھ پر تھوپ دیا گیا ہے۔ کون میرے ساتھ یہ مذاق اور زیادتی کر رہا ہے؟ مجھے خبر نہیں۔ لیکن جو کوئی بھی ہے۔ میرے وجود کا ایک حصہ ہے۔ پردے میں بیٹھا ہے۔ صاف سامنے نہیں آتا۔ بڑا ہوشیار اور چالاک ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب اس نام سے مجھے نفرت اور وحشت سی ہوگئی ہے۔ اب تک تو خاصا مسلمان ہے اور راہِ مستقیم کا راہی ہے۔ لیکن کسی کے ایمان کا کیا پتہ چلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت شرارت پر اُتر آئے۔ لیکن یار! اچھا ہے یا بُرا لیکن کسی

کو یہ حق حاصل نہیں پہنچتا کہ میرے ذہن، خیالات اور کیفیات اپنائے۔ اور مجھ سے پوچھے بغیر انہیں اپنے میٹھے اور خوبصورت الفاظ کے جامے میں اوروں کو پیش کرے۔ اس قماش کے چور اور ڈاکو کو آپ نے دیکھا ہے یا اس کا ذکر سُنا ہے۔

لیکن آخر اس میں آپ کو تکلیف یا زیان کیا ہے؟ یہ تو بڑا اچھا انسان ہے۔ تمہیں لکھنے کی فکر، اس کی تصحیح اور یکجا کرنے کی کلفت سے بچاتا ہے۔ مفت کا تمہیں ایک قابل معتقد اور معتمد مل گیا ہے۔کیا ہوا کہ وہ تمہیں نظر نہیں آتا۔ ان اندیکھی اشیاء کی برکت سے ہمارے عقائد، رسوم، رواجوں، محبتوں اور نفرتوں نے جنم لیا ہے۔ ان اندیکھی چیزوں سے محبت کرنے میں جو لذت ہے وہ دیکھی بھلی شے میں کہاں؟ زیادہ سے زیادہ تم اس عمل کو ایک نظر نہ آنے والی معاون کی ایک معصوم اور بے ضرر شرارت کہہ سکتے ہو۔ چھوڑو رہنے دو۔ قدرت کے عجائب پر سوچ و فکر مت کرو۔ تالاش اور تحقیق کو رہنے دو۔ خیر اور بھلائی کی دُعا مانگو۔ پنہاں بلاؤں کو اللہ پاک مخفی ہی رکھے۔

ایک رومان پسند شاعر جس کے اعصاب پر ہمیشہ خوبصورت گُل رُخ سوار ہوتے ہیں۔ اُس

نے اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ کسی حسین صورت ماہ جبین انسان کی ایک رنگین شرارت ہے۔ اور اس اندیکھے فتنے کا شجرہ یوں بیان کیا۔

میں اگر تجھے خُدا کہتا ہوں تو میری توبہ ہے

بعض قصّے تیرے انسانوں کے مانند نہیں

اور یہ کہ " سارے حسین جنات کی نسل سے ہیں۔ مرض تمہیں عطا کریں گے لیکن میرے دلبر! ان کا دیدار ناممکنات میں سے ہے۔" یا خُدایا ! اس شخص نے تو اسے خاصہ مشاعرہ بنا لیا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ موصوف خوبصورت ہے کہ بدشکل۔ انسان کی نسب سے ہے یا کہ جنّات کی ذات سے ہے۔ کسی کی فراق میں کُڑھنے کا قصہ نہیں ہے۔ ایک غیبی آفت ہے۔

ایک نحوی دوست نے لُغت کے حوالے سے کہا۔ دُر کے معنی ہوے گوھر یا موتی، مکنون یعنی چُپا ہوا یا مخفی۔ اور پلوشے سے "ے" کا حرف حذف کیا جائے تو اس کے معنی ہوئے "روشنی" یا "نُور کی کرن" ۔ دُرِ مکنون ہمارے گاؤں کا واحد دُکاندار ہے جس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ سارے گاؤں والوں کی ڈاک اس کے پتے پر آتی ہے۔ کیونکہ وہ اس قدر تعلیم یافتہ ہے کہ اپنا نام دو نقطہ "ق" کے ساتھ "دُرِ مقنون" لکھ سکتا ہے۔

اور پشتو میں چھپنے والے رسالے "پلوشے" کے پڑھنے کے قابل ہے۔ اور زیادہ پیار سے اس کا آخری حرف حذف کر جاتا ہے۔ یار اسے مذاق نہ سمجھو ۔ میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔اور ایک تم ہو کہ اس کا ایک افسانچہ تراش لیا ہے۔

ایک دلسوز مگر سخن فہم نے تسلی دی کہ تمہارے قلم نے کسی کو آزار نہیں پہنچائی ۔ سدا مظلوم کا ساتھ دیا ہے۔ ظلم، نفرت اور جبر کے خلاف صدائے احتجاج بُلند کیا ہے۔جو بھی لکھا ہے سچ لکھا ہے۔ عدل ، انصاف اور انسانیت کی تلقین کی ہے۔ حق تعالی' اپنے ان بندوں سے بے حد پیار کرتا ہے۔ وہ کبھی بھی تمھیں رسوا نہیں کرے گا۔ یہ دُر مکنون پلوش تمہارا بیدار شدہ ضمیر ہے۔ تمھاری مضطرب روح کی آواز ہے۔ تمہاری مخفی صلاحیتوں اور قابل جوہر کے اظہار اور نمود کا دوسرا نام ہے۔ اور انسانی نفسیات شناس اور تخیل کے بادشاہ مرزا غالب کے دیوان سے فال نکال کر یہ شعر پڑھا؛

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ادیب، شاعر اور دانشور دوستوں سے میری گذارش ہے کہ اگر کسی دوست کے ساتھ اس قسم

کی واردات پیش آچکی ہو یا ادب کی تاریخ کے صفحات پر کوئی ایسا واقعہ ان کی نظر سے گذر چکا ہو۔ تو پرائے کرم مجھے بھی مطلع کریں۔ مجھے دلاسہ دیں، میرا حوصلہ بڑھایں۔ یہ راز ذرا سمجھائیں۔ تاکہ ہمارا درد، فکر اور مسئلہ ایک ہو جائے۔ ہو سکتا ہے اس طرح میری اس حیرت، تالاش، وسوسے اور جنون کی موجوں کے تلاطم میں کچھ سکون پیدا ہوسکے۔

انٹرویو

(انٹرویو برائے پروگرام اہل دانش ۔ ریڈیو پاکستان ڈی آیئ خان)

الطاف احمد شاہ : تو ڈاکٹر چراغ حسین شاہ صاحب! سب سے پہلے آپ کی کتابیں، اب تک کتنی منظرعام پر آچکی ہیں؟ اُن کے نام کیا ہیں اور موضوعات اُن میں کیا چُنے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب : الطاف صاحب! شاید میری پہلی کتاب ''دودِ چراغ'' 1980 ء میں چھپی۔ اور وہ مختلف تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ۔ چند سالوں کے بعد ایک دوسری کتاب چھپی، وہ بھی پشتو میں ہے۔ اس کا نام ''انوارِ چراغ'' ہے۔ اس میں بھی تحقیقی، تنقیدی اور

تاریخی مضامین ہیں۔ تیسری کتاب جو ہے وہ خالصتاً تحقیقی ہے وہ میں نے اردو میں لکھی ہے اور لکھی بھی اپنے جد امجد پیر سباک (رح) کے متعلق ہے۔ کیونکہ لوگ اور رشتہ دار یہ کہتے تھے کہ آپ پشتو میں لکھتے ہیں۔ آپ اپنے خاندان کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھیں، لیکن میں صرف مناقب کی حد تک کتاب نہیں لکھ سکتا، کیونکہ تاریخ کے ساتھ میرا ایسا تعلق ہے کہ میں تاریخ کو تاریخ کے طور پر لکھنا چاہتاتھا۔ تو اس میں میں نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے کہ میں ایک تحقیقی کتاب لکھوں۔ اس موضوع پر اس سے پہلے بنوں کے ایک بڑے صاحبِ علم بزرگ تھے، سرفرازخان عقاب خٹک صاحب، انھوں نے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اُس وقت میں کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ پہلی دفعہ ہمارے گھر معلومات کی غرض سے آئے تھے۔ اُس وقت وہ تو میرے والد صاحب سے ملنے آئے تھے۔ پھر میری بھی اُن سے ملاقات ہوئی۔ تو چونکہ بچپن سے میرا تاریخ ، ادب اور فلسفہ سے شغف رہا تھا۔ تو میں نے اُن کو اس وقت بھی کہا تھا کہ انشاء اللہ اس موضوع پر میں بھی کتاب لکھوں گا۔ اور پھر یوں ہوا کہ اُنہی کی زندگی میں میں نے وہ کتاب لکھی۔ ______

اچھا ______ یہ تو تیسری کتاب ہوئی ۔ چوتھی کتاب پشتو میں میرے افسانوں کا مجموعہ ''نالیدلي بلا '' ہے۔ اور ان افسانوں کا مجموعہ میں نے کیوں لکھا، یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے۔ ایسا ہوا کہ ہمارے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں قیوم مروت صاحب، انہوں نے مجھے افسانوں کی اپنی پہلی کتاب "پٹ مخونہ"

کا مسودہ دے دیا کہ اس کتاب پر آپ دیباچہ لکھیں۔ میں نے وہ افسانے پڑھے تو میں نے کہا یہ افسانہ لکھنا تو ایسی آسان سی چیز ہے ۔ خیر میں نے توکل کیا ۔ اُنہی دنوں میرے گھٹنے کا اپریشن ہوا تھا۔ میں پمز (PIMs) ہسپتال میں تھا۔ تو وہاں وقت بھی کافی تھا، تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں نے ایک دن میں تین چار افسانے لکھ لیے لیکن ان کا رنگ بالکل الگ ہی تھا۔ آج بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑے واضح متاثرکُن ہیں۔ اور یہ پہلی بار ہے کہ پشتو زبان میں علمی موضوعات کو زیر بحث لایا گیاہے۔ افسانے تاریخی معلومات بھی رکھتیں ہیں۔ اور یہ انداز تو اردو افسانے میں کافی ہے۔ لیکن میری نظر سے جو گذرا ہے بلوچستان کے ایک افسانہ نگار آغاگل صاحب ______ اُن کے افسانے جو ہیں، ان کی اگر وہ حاشیے میں خود وضاحت نہ کریں تو قاری کو اس کا سمجھنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ میرے افسانے تو اتنے سٹینڈرڈ (standard) کے نہیں ہیں۔ لیکن بہرحال ان میں یہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اور ان کا کمال یہ ہے کہ دوسرے مضامین کے مقابلے میں افسانے زیادہ مشہور ہوئے ۔

شیرزمان طائزی صاحب، جو فرنٹیئر پوسٹ' انگریزی کا ایک اخبارجوپشاور سے نکلتا تھا، سے وابستہ رہے۔ انھوں نے پشتو ادب کے لیے بہت کام کیا، ‘‘پشتو ادب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے حوالے سے’’ ، وہ مجھ سے ملنے کے لیے لکی مروت آئے۔ پہلے تو انھوں نے میرے متعلق ایک مضمون لکھا۔ اور پھر ان افسانوں پر انگریزی زبان میں ایک مضمون لکھا اور ان کا تجزیہ

(analysis) کیا۔ یہ وہ واقعاتی قصے تھے جن میں میں نے خود ادبی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔

اچھا یہ تو افسانوں کی کتاب ہوئی۔ پانچویں کتاب جو ہے، وہ حمزہ صاحب کے خطوط تھے میرے نام ۔ ان کے ساتھ میرا رابطہ ان کے آخری سالوں میں شروع ہوا۔ ان کی وفات تک ان کے ساتھ میرا رابطہ رہا۔ میرے ساتھ جو ان کے پندرہ سولہ خطوط پڑے تھے انھیں میں نے ''ژوندی خطونہ'' کے نام سے چھاپ دیا ۔

یہ کتابیں تو چھپ چکی ہیں اور باقی میرے پاس unprinted بھی کافی میٹیرئیل پڑا ہوا ہے۔ ان میں تحقیقی ، تنقیدی اور تاریخی مضامین بھی ہیں۔ اور اس میں تبصرے بھی ہیں۔ اور اچھا---- درمیان میں یہ بات آئی کہ پشتو کی طرف میں کیوں آیا؟۔ پہلے پہل میں اردو میں لکھا کرتا تھا۔ لیکن اردو سے یہ تعلق تھا کہ اپنے حساب سے لکھتا تھا یا کسی کالج کے میگزین میں کچھ لکھا۔ جب میری لکی مروت میں پہلی پوسٹنگ ہوئی تو مجذوب صاحب کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ اور وہاں پر پشاور میں میرے تعلقات پشتو اکیڈمی کے چئیرمین نواز طائرصاحب سے تھے' جو بڑے مشفق انسان ہیں۔ تو ان دونوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں اردو سے پشتو کی طرف آیا۔ حالانکہ میں نے پشتو پڑھی نہیں تھی یعنی پرائمری جماعتوں میں۔ اور میں پشتو اُس وقت بھی اردو رسم الخط میں لکھتا تھا۔ رحمت اللہ درد صاحب جو میرے کالج میں اُردو کے استاد رہ چکے ہیں ۔ وہ اُردو اور پشتو دونوں کے شاعر ہیں۔ لیکن پشتو میں ان کا مجموعہ

کلام شائع ہوچکا ہے۔ تو میرے پشتو مضامین کی اِملا کی اصلاح وہ کیا کرتے تھے۔

الطاف شاہ صاحب : اچھا چراغ حسین شاہ صاحب ! شروع آپ نے تحقیق سے کی۔ تحقیق کے بعد آپ افسانے کی طرف آئے ۔تو تحقیق اور افسانہ ۔ ۔ ۔ ۔ فرق بہت ہے ۔ کیسا لگا؟ تحقیق مشکل لگی یا تحقیق کی جو چاشنی ہے۔ تو اس حوالے سے کیا کہیں گے آپ ؟

ڈاکٹر صاحب : نام اسے آپ جو بھی دے دیں۔ چاہیں تو آپ اسے ناول کہیں، آپ اسے ڈرامہ کہیں۔ آپ اسے داستان کہیں۔ چاہے اس کوتحقیق کہیں۔ تنقید کہیں۔ ایک شوق ہے۔ اب وہ ایک دل لگی ہے۔ وہ اپنا اظہار کرنا چاہتی ہے۔ آپ کے من میں ایک دنیا آباد ہے وہ باھر آنا چاہتی ہے۔ تو اس کے لیے فارم (Form) کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور میرے خیال میں میرے افسانوں پر سب سے زیادہ تنقید بھی یہی ہے کہ یہ بھی اس فنی چوکھٹ میں پورا نہیں بیٹھتے۔ لیکن میرا خود یہ خیال ہے کہ افسانہ تین قسم کا ہے _____ ایک عوامی ہوتا ہے۔ ایک عامی ہوتا ہے اور ایک خواص کے لیے ہوتا ہے۔ پھر اس طرح ایک دوسری درجہ بندی میں یہ کروں گا کہ وہ ایک روایتی افسانے ہوتے ہیں۔ ایک جدید افسانے ہوتے ہہیں۔ ایک طبقاتی افسانے ہوتے ہیں۔ اور یہ مختلف زمانوں میں مختلف رُجحان رہے ہیں۔ روایتی افسانے جو ہیں اس کا پیٹرن آپ کو معلوم ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اور اس کی ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ جو اس کی تکنیک ہے اس میں خاص کر_____ اس کی ابتداء ہے ۔ یہ سسپنس ہے یہ ٹرن ہے اس میں ۔

اس میں کردار ہے پھر ایک ہی سیٹنگ (نشست) میں اسے پڑھا جاے ، کتنا وقت ہونا چاہیے ۔ سات منٹوں سے تین گھنٹوں تک تو شارٹ (short) افسانہ ہے ۔ پھر شارٹ شارٹ سٹوری ہے۔ پھر لانگ شارٹ سٹوری ہے، پھر لانگ لانگ سٹوری ہے۔ آج کل تو خُدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین سو صحفے تک پورا چھوٹا ناولٹ بن جاتا ہے ۔ لیکن دوستوں کو وہ ادا پسند آئی انھوں اسے افسانے کا نام دیا اور افسانے کے طور پر قبول بھی کیا۔ وہ قیصے تھے واقعاتی قیصے تھے۔ واقعے اور افسانے میں فرق ہوتا بھی یہی ہے ۔ ایسا مبالغہ آپ کریں جو صحیح معلوم ہوتا ہو اسے آپ افسانہ کہتے ہیں۔ اور جو سیدھی سادی بات ہوتی ہے پلین سٹوری ہوتی ہے۔اور آپ روزمرہ میں ایک دو دفعہ دیکھتے ہیں اسے آپ واقعے کا نام دیتے ہیں۔ تو ان میں یہ وہ ہے۔ تو میں نے اپنی طرف سے یہ کوشش کی ہے۔ اس میں یعنی بعض بالکل بڑی سادہ سٹوریز ہیں۔ یہی جیسے طبقاتی افسانہ ہے۔ دوسری جدید ادب کی اسے آپ کو ذرا سوچ کر پڑھنا پڑے گا ۔ اب اس میں ایک افسانہ ہے ‘‘ آبا ’’ کے نام سے ۔ تو لوگ تو اسے ایک کردار بیان کررہے ہیں۔ لیکن اس کا جو آخری فقرہ ہے اور آبا فوت ہوتے ہوئے جو کہتے ہیں کہ "ادی۔ ما زان سرہ کور تہ بوزہ !" تو اس میں یہ ‘‘ادے’’(ماں) یہ زمین کی طرف اشارہ ہے۔ مادر گیتی جو ہم کہتے ہیں۔ یہ زمین ماں ہے اور اس طرح یہ رحمِ مادر جو ہے اس کی شکل بھی قبر سے ملتی جلتی ہے۔ یعنی وہ ایک اشارہ ہے شاید غزالی صاحب کا قول ہے کہ ‘‘ بھئی دوسری دنیا کو ہم اس طرح شمار کرلیں گے کہ اگر ماں کی رحم میں ایک بچہ ہو اور

آپ کسی طریقے سے اس سے پوچھیں بھئی تمہیں ایک بہت بڑی دنیا میں آنا ہے۔ تو وہ کوئیں کی مینڈک کی طرح اس کے کنارے ایک چکر لگائے گا کہ بھئی اتنی ہوگی۔ اور آخر وہ جب اس کے حد کو پہنچے گا کہ اس سے زیادہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن جب وہ باہر آکر نکلتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ واقعی ایک ایک اور دنیا بھی ہے۔ ------ تو رحم مادر جو ہے یہ ایک سٹیج ہے اور اس کے بعد یہ دنیا ہے۔ اس میں اس قسم کے مشابہات (Similarities) ہیں۔ اور ادے۔ ما کور تہ بوزہ" میں "کور" آخری آرام گاہ جو ہے 'اس سے مطلب ہے اور سٹائل جو ہے وہ قدرت اللہ شہاب کے افسانے ‘‘ماں جی’’ کا اس پر اثر ہے۔ تو اُسے اگرلوگ افسانہ تسلیم کرتے ہیں تو میں یہ نہیں سمجھتا کہ لوگ پھر میرے افسانے کو افسانہ کیوں نہیں کہتے؟

الطاف صاحب : آپ کا جو براہ راست تعلق شعبہ طب سے ہے اور یہ ادب کی دنیا میں آنا، تحقیق کے مراحل سے گزرنا، پھر افسانہ لکھنا، اس کے علاوہ تاریخ کے حوالے سے، جیسا کہ آپ نے بات کی کہ ابھی بہت سا مواد آپ کے پاس موجود ہے جو کہ ابھی تک چھپا نہیں ہے۔ تو یہ شعبہ طب اور یہ شعبہ ادب۔ اس کا گھر سے کوئی ماحول آپ کو ملا یا یہ کیسے آپ کی طبیعت میں یہ بات آگئی ؟

ڈاکٹر صاحب: میرا جو بیک گراونڈ ہے ، بنیادی طور پر میرا تعلق ایک علمی، مذہبی اور دینی گھرانے سے ہے۔ تو یہ لکھنے پڑھنے کا شوق اور کتابیں لکھنے کا شوق گھر سے شاید مجھے ملا ہے۔ یعنی اب بھی جو قدیم نسخہ جو

میرے دسویں پشت پر میرے جد امجد نے فارسی میں لکھا ہے۔ اس کا اب اردو ترجمہ ہوچکا ہے۔ تو ایسے یہ تواریخ حافظ رحمت خانی جو لکھی گئی ہے، پیر معظم شاہ نے۔ یہ بھی زاہد اٹکی کی ہے۔ اور اس طرح نوادرات علمی محسنِ اٹک والوں نے چھاپا ہے۔ یہ بھی ہمارے خاندان کے ایک بزرگ کے مناقب میں لکھی گئی ہے۔ تو ایسی کافی کتابیں ہیں ۔ اور میرے جو پردادا تھے یعنی میرے والد صاحب کے جو دادا ، وہ تقریباً ۱۲۵۰ تا ۱۲٦۰ ہجری کے درمیان تھے جیسے ان کی کتابوں پر جو تاریخ لکھی ہے، ان کی بہت بڑی لائبریری تھی۔ اور انہوں نے فوت ہوتے ہوئے دو وصیتیں کیں تھیں۔ کہ ایک تو میری لائبریری کو ضائع نہ کرنا اور دوسری جو ہے ان کی ایک بیٹی تھی، جو انہی کی طرح عالمہ تھی۔ شاید بیٹوں میں ان کو وہ جوہر نظر نہ آیا۔ تو انہوں نے یہ وصیت کی اپنے بیٹوں کو کہ اپنی اِس بہن کا بیاہ نہ کرنا۔ یہ میری لائبریری کی حفاظت کرے گی۔ لیکن زمانے کی ناقدری اور کچھ اولاد کی ناخلفی کی وجہ سے یا علم کے ساتھ ان کا شوق نہیں رہا، وہ لائبریری ضائع ہوگئی۔ اور ان میں اکثر کتابیں تو دیمک چاٹ گئی۔ بعض جو لوگ آتے تھے وہ ساتھ لے جاتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ جومہمان ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے سُنا ہے کہ وہ تین دن تک اسے دریائے سندھ میں پھینکتے رہے، جو وہ دیمک زدہ نسخے تھے۔ تو اتنی بڑی لائبریری تھی ان کی۔ اچھا تو اس کے بعد میرے والد صاحب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھی کتابوں کے بڑے شوقین تھے انہوں نے بھی کافی کتابیں جمع کیں تھیں۔ لیکن جب میرا وقت آیا اس وقت ایسی حالت (situation)

ہوگئی کہ میرے نانا مہمانوں کو وہی کتابیں تحفے میں دے دیتے تھے۔ ساری ختم ہوگئیں ۔ لیکن کچھ کتابیں ان کی یادگار ہیں ۔ ۔ ۔۔ ۔ ایک داستان مجاہد ۔ ۔ ۔ ۔ یہ نسیم حجازی کا ناول تھا۔ داستان مجاہد میرے خیال میں نسیم حجازی کا سب سے پہلا تاریخی ناول ہے ۔ اور دوسری بیورلےنکلسن (**Beverly Nicholson**) کی ایک کتاب تھی Verdict on India جس میں جناح صاحب کوGiant Man of Asia کہا گیا تھا اور partition سے پہلے یہاں آئے تھے۔ تیسری جو ہے Castes of Punjab مشہور کتاب ہے ' وغیرہ یہ سب کتابیں مجھے ملیں اپنے والد کے کتب خانے سے ۔ تو ان کا بھی شوق تھا لیکن وہ اس عمر میں ضعیف ہوگئے تھے۔ اب وہ صرف قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے یا اخبار پڑھتے تھے یا ریڈیو سُنتے تھے لیکن وہ خوش ہوتے تھے کہ میرے بیٹے کتاب پڑھتے ہیں۔ ہمیں کہا بھی کرتے تھے کہ آپ ایسا کریں کہ جس کے ساتھ بھی دوستی رکھیں، دولت کی وجہ سے نہ رکھیں ۔ لائق لڑکوں کے ساتھ آپ بیٹھیں ۔ ان سے company رکھیں، تو بزرگوں کی دعائیں ہیں اور یہ خاندانی شوق ہے۔

الطاف صاحب : اچھا اس کے بعد تعلیم کا مرحلہ آتا ہے۔ درس گاہوں کی اہمیت آتی ہے۔ درس گاہوں کا ماحول ہوتا ہے۔ تو گھرسے نکل کر گھریلو ماحول کو ساتھ لیتے ہوئے ادبی ماحول کو، کتابوں کے ماحول کو، جب آپ تعلیم کے شعبے میں آئے ۔ تعلیم حاصل کرنے کے حوالے سے درس گاہوں میں آئے تو وہاں بھی جو ماحول ہوتا ہے وہ

اگر آپ کو سازگار ماحول ملے تو وہ آپ کی ایک صحیح سمت متعین کرتی ہے۔ تو وہاں جو آپ کے درس گاہوں کا ماحول رہا وہ کس لحاظ سے کس حد تک ادبی تھا، کہ آپ کے اندر کا جو شوق تھا اس کو مہمیز ملی اور اس کی شکل آخر میں کتابوں کی صورت میں نمودار ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب : الطاف صاحب آپ نے میری زندگی کی ساری داستان پوچھنے کی کوشش کی ہے۔ بات ایسی ہے کہ سکول کے زمانے سے مجھے ادب سے ' فلسفے سے' تواریخ سے اور دینیات وغیرہ مختلف آرٹس کے مضامین سے کافی دلچسپی تھی۔ لیکن میرے والد صاحب کا خیال تھا کہ ایک بیٹے کو انجنئیر بناؤں گا اور دوسرے بیٹے کو میں وکیل بناؤں گا جو میرے متعلق ان کا ارادہ تھا ۔ میرے والد بڑے سخت مزاج قسم کے آدمی تھے لیکن اس کے باوجود میرے ساتھ ان کا رویہ کافی حد تک مشفقانہ تھا۔ اور میں ان سے باتیں پوچھتا رہتا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ تھے، والد صاحب کے چچا تھے تو وہ بھی کافی صاحب ذوق تھے۔ فارسی اور اردو اشعار انھیں بہت یاد ہوتے تھے ۔ تو مجھے کبھی کبھی کارڈ لکھتے تھے۔ تو اس میں یہ سارے مولانا روم کے اشعار، غالب کے اشعار اور سعدی اور حافظ کے اشعارہوتے تھے۔ تو ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ لاہور میں رہے ہیں۔ کیا آپ نے علامہ اقبال کو دیکھا ہے؟ ۔ تو انھوں نے کہا کہ ہاں میں نے علامہ اقبال کو دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ کیسے؟ کہنے لگے کہ اُس وقت میری جوانی کا زمانہ تھا۔ تو لاچی کا ایک رسالدار تھا سجید گل صاحب ۔ یہ ان کے پاس بہت

جایا کرتا تھا۔ تو وہ سجید گل میرا دوست تھا۔ ایک دن اس نے مجھے کہا کہ بھائی یہاں ایک آدمی سے ملتے ہیں۔ تو میں ساتھ گیا ۔اُدھر ایک آدمی نے دھوتی باندھی ہوئی تھی جسے ہم پشتو میں " لنگ" کہتے ہیں، اور بُنیان پہنی ہوئی تھی ۔ وہ حُقہ پی رہا تھا یہ آپس میں بیٹھے اور آپس میں گپ شپ لگا تےرہے اور میں بالکنی سے نیچے انار کلی بازار کو دیکھ رہا تھا۔ تو میں نے کہا کہ آخر کچھ تو آپ نے سُنا ہوگا ان سے کہ وہ کیا کہہ رہے تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہےِ اقبالؒ مولانا روم کے اشعار پڑھ رہا تھا اور سجید گل جو ہے وہ اس کے جواب میں خوشحال خان خٹک کے اشعار پڑھ رہا تھا۔ اچھا پھر وہ کہتے کہ اب مجھے افسوس ہے۔ کاش میں اِن کی باتیں ذرا غور سے سنتا، لیکن بس وہ جوانی تھی، بعد میں ان کو شوق خود بھی پڑگیا تھا ادب کی طرف، یہ اشعار اور یہ چیزیں جو تھیں وہ خود بہت کثرت سے استعمال کرتے تھے اپنے خط میں۔ تو ایک دن ایسا ہوا ایک عجیب واقعہ ہوا کہ یہ عبدالصمد خان کی کتاب "خوشحال اور اقبال" میں نے دیکھی۔ تو اس کا دیباچہ جو ہے وہ ماسٹر خان گل صاحب نے لکھا ہے۔ ماسٹر خان گل صاحب نے بھی اسی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ کہ ایک لاچی کا رسالدار تھا۔ رسالدار سجیدگل جو تھے ان کے علامہ اقبال کے ساتھ تعلقات تھے۔ لیکن اب اس عمر کا کوئی آدمی مجھے ملتا نہیں ہے۔ ان کے بیٹوں کو اتنا زیادہ علم ہے نہیں۔ اس وقت پشاور یونیورسٹی کا ماحول بھی ایسا تھا کہ آرٹس سٹوڈنٹس اور میڈیکل سٹوڈنٹس ایک ہی کیمپس پر رہتے تھے، اور وہ ایک دوسرے کے روم میٹ ہوا کرتے تھے۔

اور اس پر ہمارے سابقہ وائس چانسلر چودھری محمد علی صاحب بڑا فخر کیا کرتے تھے۔ اور پھر انھوں (چودھری محمد علی صاحب) نے ایسا ماحول بنایا تھا کہ جو ریٹائرڈ پروفیسرز ' ان کے اساتذہ رہےتھے۔ انھوں نے ان کواعزازی پروفیسر شپ کا درجہ دے کر ان کو وہیں پہ accomodate کیا تھا کہ سٹوڈنٹس ان سے کچھ سیکھیں ۔ تو ان میں عمرحیات ملک صاحب (سابق مرکزی وزیر اور سابق سفیر) اور لالا عبدالرحیم صاحب تھے۔ تو یہ لالا عبدالرحیم صاحب، سید رسول رسا صاحب کے سُسر تھے۔ ان کے پاس بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ اور اُدھر میرے بھائی کے دوستوں میں معراج صاحب تھے، تو فلسفے سے مجھے بھی تھوڑا بہت شغف تھا اورمعراج صاحب کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ۔ جو بنیادی طور پر فلسفے کا پروفیسر تھا۔ تو اس نے میرے شوق کو نئی جِلا بخشی۔ پھر تاریخ سےبھی شغف تھا لیکن اس وقت تک تو اردو ادب سے میری دلچسپی تھی۔ اس وقت تک اردو ادب میں تھوڑا بہت ۔ ۔ ۔ ۔ ناول بھی پڑھاتھا ۔ فکشن بھی پڑھی ہے اور جو بھی ادبی مضامین ہوتے تھے۔ فنون کا رسالہ ہوگیا، نیرنگ خیال وغیرہ، یہ مختلف قسم کی چیزیں پڑھتا رہتا تھا۔ تو خیر ---- جب میری پہلی بارلکیمروت میں میری پوسٹنگ ہوئی تو وہاں ہمارے دوست تھے عبدالرحیم مجذوب صاحب جو ہمارے بزرگ بھی ہیں، تو وہ مجھے پشتو کی طرف کھینچ لائے۔ ایک دوسرے ہمارے مہربان تھے وہ مجھ پر کافی مہربان اورمشفق تھے۔ وہ پشتو اکیڈمی کے اس وقت کے ڈائریکٹر تھے نواز طائر صاحب تو ان دونوں کی حوصلہ افزائی سے میں پشتو ادب کی

طرف آیا۔ اور پشتو ادب میں پہلا مضمون جو ہے وہ تحقیقی رنگ کا تھا۔ اس کے درمیان عقاب خٹک صاحب کے ساتھ میرا تعلق قائم ہوگیا تو انھوں نے چونکہ پہلے ہی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی تھی۔ ہمارے جد امجد پیر سباق صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر۔ تو اس میں معظم شاہ کا نام تو آتا ہے۔ لیکن اس وقت تک یہ کتاب discover نہیں ہوئی تھی تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو وہ معظم شاہ ہےِ جنہوں نے تواریخ حافظ رحمت خانی لکھی ہے۔ تو پھر وہ پہلا آرٹیکل جو میرا تھا وہ تواریخ حافظ رحمت خانی پہ تھا اور وہ میں نے " اولس'' نامی رسالے کو کو نُٹّہ بھیجا اور" اولس" میں وہاں، میرے اب بھی اچھے دوست ہیں، سرور سودائی صاحب ۔ ایک محمد گل صاحب تو ہمارے علاقے کے تھے۔ ان کو میں نہیں جانتا تھا 'وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ لیکن شاید علاقائیت کی وجہ سے یا مضمون میں کچھ تھا ' انہوں نے اسے چھاپ دیا۔ اور بڑی اچھی جگہ میں یعنی فرنٹ پر پہلے صفحات میں۔ تو ایسے مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر میں نے مروت قوم پر ایک تحقیقی مضمون لکھا ۔ "دودِ چراغ " میں تو اکثر ایسے مضامین ہیں۔

الطاف صاحب:۔ اچھا یہ جو ایسے مختلف قسم کے موضوعات آپ کیسے چُنتے تھےِ ذہن میں آگیا 'کہانی سے آئیڈیا لیا' کسی کے ساتھ بحث ہوئیِ ' ڈسکشن ہوئی۔ اس کے بعد آتا تھاِ یا یہ کیسے طے کرتے تھے؟ کہ اب اس چیز پر لکھنا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: ۔ وہ تو میں نے پہلے آپ سے بات کی کہ میں ہر کتاب پڑھتا ہوں ہر قسم کی۔ چاہے وہ نفسیات کی

ہو، فلسفے کے بارے میں ہو۔ یہ خشک موضوعات ہیں۔ ادب تو خیر بڑا attractive ہے۔ پہلے یہ چیزیں لوگ اس میں شامل نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب ادب میں یہ ساری چیزیں آ گئی ہیں۔ ناول ہوگیا، ڈرامے ہوگئے، short stories ہوگئیں ۔ لیکن یہ آپ نے بڑی اچھی بات کی۔ یہ بات مجھے عقاب خٹک صاحب نے بھی کی تھی۔ کہ بھئی یہ تم ایک خاص speciality پیدا کرو۔ تم ہر مضمون پر لکھتے رہتے ہو، اور وہ یہ کہتے تھے کہ پشتو میں ایسا صرف خوشحال خان نے یہ کام کیا ہے کہ وہ ہر سبجیکٹ پر لکھتا تھا اور یا میں (عقاب خٹک) ہوں جو تحقیق بھی کرتا ہے، تنقید بھی کرتا ہے۔ مرغی خانے کے بارے میں بھی انھوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے بازنامہ لکھا، انھوں نے مرغی خانہ۔ ۔ ۔ (ہنستے ہوئے) وہ بڑے دلچسپ انسان تھے۔ لیکن میں وہ speciality پیدا نہ کرسکا۔ اور جو بھی مضمون میں نے پڑھا مجھے پسند آیا، کوئی ٹاپک میری نظر سے گزرا تو میں نے یہ جستجو کی کہ پشتو میں یہ آخر کیوں نہیں ہے؟ پھر ان دنوں میں نے Epic پر ایک مضمون لکھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ غازی سیال صاحب نے بنوں سے فون کیاکہ "میں گلنار بیگم پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں ۔ اور آپ یہ آرٹیکل مجھے لکھ کر دیں"۔ تو انھوں نے دو دفعہ مجھے فون کیا ۔ میں نے آخر کہا یارکیا مجبوری ہے؟ میں نے دفتر کے چپڑاسی کو کہا کہ بھائی جاؤ ۔ بازار سے دو کیسٹ گلنار بیگم کے لے آؤ ۔ پہلے تو اس نے مجھے گھور گھور کے دیکھا کہ ڈاکٹر کا دماغ خراب ہوگیا کیا؟۔ وہ آیا پھر میں گھر آیا تو میں نے گھر والوں سے کہا کہ مجھے ٹیپ ریکارڈ ر دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں بچوں کے سامنے یہ سب نہیں سُنتا تھا۔ کیسٹ شروع ہوگیا تو وہ گانا "سومره خائیست دِ ستا په سترگو کے دے" تو یکدم میرے ذہن میں ایک تصویر اُبھری کہ اس طرح اسلامیہ کالج میں جب میں پڑھتا تھا، اور وہاں پر ہمارا ایک دوست تھا، تو اس کے کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے اور اچانک ریڈیو پر یہ گیت آگیا۔ وہ اونچی آواز سے ریڈیو بجاتا تھا۔ تو اس کی سائیڈ کی کھڑکی سے ۔ ۔ ۔ ۔ باہر لوگ جارہے تھے۔ سٹوڈنٹس ۔ ۔ ۔ انھوں نے "ٹک ٹک "کی ۔ معلوم ہوا کہ یہ تو کھڑکی تھوڑ قسم کا گیت تھا۔ اس زمانے میں تو میں نے اسے دوبارہ سہ بارہ سُنا اور اس کے دو بول تھے ’’ژورے کُرمے تہ نصیب راوڑے یمہ‘‘ ۔ ۔ ۔ تو اس کی آواز میں جو سوز میں نے دیکھا، اس کے تلفظ کی جو ادائیگی تھی ! کیا کہنا؟۔ یوسفزئ اور ہمارے جنوبی اضلاع کا لہجہ دونوں پر اس کو عبور حاصل تھا۔ موسیقی کی شور میں اس کی آواز گُم نہیں ہو جایا کرتی تھی۔ ہمارے پشتو موسیقی کاروں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ راگ تیز چلا تے ہیں اور اس میں گائیگ کی آواز دب جاتی ہے لیکن یہ اس پر حاوی تھی۔ تو اس میں ایسی qualities تھیں کہ میں نے وہ مقالہ یا وہ مضمون لکھ دیا پھر انھوں نے چھاپ بھی دیا۔

نوٹ : یہ ادھورا انٹرویو الطاف احمد شاہ صاحب نے ریڈیو پاکستان ڈیرہ اسماعیل خان کے پروگرام ‘‘اہلِ دانش’’ کے لیۓ ریکارڈ کیا تھا۔ سالوں بعد جواں سال ادیب اور دانشور راجہ کاشف نے اس پُرانی ریکارڈ ڈ کیسٹ کی رمز کشائ کی کوشش کی۔ لیکن وقت کے ساتھ ٹیکنیک بدل جانے کی

وجہ سے وہ اس کوشش کو مکمل نہ کرسکا۔ بھرحال میں اس کا تہہ دل سے مشکور ہوں (چراغ) ۔

گلہائے عقیدت

بخاطرِ جناب ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ صاحب

(ایم بی بی ایس)

انچارج سول ہسپتال ٹانک، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

- O -

ہوگا سدا بہار ادب کا یہ باغ بھی
روشن رہے گا اس میں ہمیشہ چراغ بھی

پشتو کے ادب میں تیرا رتبہ ہے ہُما کا
جس تک نہ جا سکا ہے بوالہوس کا زاغ بھی

مُحقق خیال ہو کہ مقالہ نگار ہو
رکھتے ہو ہر صنف میں سمجھ کا بلاغ بھی

مخمور علمیت پہ ہو اتنا کہ کیا کہوں
پیا ہے عقل و ہوش کا ایسا ایاغ بھی

شیوہ رہا ہے تیرا جو خدمت جہان میں
اللہ نے دیا ایسا ہی دل بھی دماغ بھی

خامی نہ ملی مجھ کو تم آلِ رسول ہو
نقاد کی طرح ہے لگایا سراغ بھی

سایہ ہمارے سر پہ ہمیشہ رہے تیرا
ہم کو خدا نہ دے تیرے اجل کا داغ بھی

تجھے ہی پریکٹس میں تو فرصت نہیں ملتی
یہ ہے کمالِ ذوق ذرا سا فراغ بھی

قبول کر ‘‘نیاز’’ کے گلہائے عقیدت
نازاں رہیں گے تجھ پہ یہ سرحد کے راغ بھی

(نیاز لوہانی ٹانک)